نظریۂ پاکستان

اور نصابی کتب

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

نظریۂ پاکستان

اور نصابی کتب

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ — لاہور

جملہ حقوق بحق پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ محفوظ ہیں

اشاعت اوّل —— دسمبر ۱۹۷۱ء
تعدادِ اشاعت —— پانچ ہزار
کتابت —— محمد صدیق خوشنویس
ناشر —— پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ
۲۱-ای ۲، گلبرگ ۲ - لاہور
مطبع —— استقلال پریس، لاہور

قیمت
چار روپے پچیس پیسے

مندرجات

پیش لفظ	میر نسیم محمود	۱
خطبۂ استقبالیہ	میر نسیم محمود چیئرمین، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ	۵
خطبۂ افتتاحیہ	لیفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمٰن مارشل لا ایڈمنسٹریٹر و گورنر پنجاب	۱۱
نظریۂ پاکستان کے تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور اقداری مضمرات	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سابق وائس چانسلر، کراچی یونیورسٹی	۱۹
نظریۂ اسلام	ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ سابق پروفیسر عربی، پنجاب یونیورسٹی	۴۴
نظریۂ پاکستان کی اساس	جناب بختیار حسین صدیقی ڈپٹی ڈائرکٹر لائبریریز، پنجاب	۶۱
برصغیر میں اسلامی دورِ حکومت اور اس کی خصوصیات	پروفیسر شیخ عبدالرشید سابق صدر شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی	۷۶
نظریۂ پاکستان کا تاریخی پس منظر	پروفیسر محمد اسلم شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی	۹۰
پاکستان کا قیام	ڈاکٹر محمد اسلم قریشی پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی	۱۰۵

برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے اسباب	پروفیسر سید علی عباس شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی	۱۱۶
اسلام کا تصورِ حیات معاشی معاملات کے لیے	ڈاکٹر انور اقبال قریشی سابق مشیرِ اقتصادیات، حکومتِ پاکستان	۱۳۳
نظریۂ پاکستان اقتصادی پہلو سے	مولانا جعفر شاہ پھلواروی ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور	۱۴۷
اسلام کا معاشی نظام	راجا رشید احمد (افسرِ تعلقاتِ عامہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ)	۱۶۷
خطبۂ صدارت (پہلی نشست)	جسٹس ایس اے رحمٰن سابق چیف جسٹس آف پاکستان	۱۸۰
گروہی بحث کی رپورٹیں (دوسری نشست)	شرکائے بحث	۱۸۸
خطبۂ صدارت (تیسری نشست)	پروفیسر حمید احمد خاں سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی	۲۰۵
نظریۂ پاکستان کو تقویت دینے والے عوامل	سید محمد قاسم رضوی ڈائرکٹر سول سروس اکیڈمی	۲۱۶
آئیڈیالوجی میں جدیدیت کی رُوح پھونکنے کی ضرورت	جناب بختیار حسین صدیقی	۲۵۲
دشمن سے چوکس رہنے کی ضرورت ہے	پروفیسر وارث میر شعبۂ صحافت، پنجاب یونیورسٹی	۲۶۲

نظریاتی سرحدیں اور ساتواں در	جناب انتظار حسین رکنِ ادارۂ تحریر روزنامہ "مشرق"	۲۷۲
خطبۂ صدارت (چوتھی نشست)	جسٹس حمود الرحمٰن چیف جسٹس آف پاکستان	۲۷۷
گروہی بحث کی رپورٹیں	شرکائے بحث	۲۸۶
خطبۂ صدارت (پانچویں نشست)	پروفیسر علاء الدین صدیقی وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی	۳۰۱
موجودہ نصابی کتب نظریۂ پاکستان کی کہاں تک مظہر ہیں؟	ڈاکٹر عبدالحمید ڈائرکٹر پروڈکشن، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ	۳۱۹
نصابی کتب میں نظریۂ پاکستان کو پیش کرنے کے بارے میں تجاویز	ڈاکٹر اصغر علی شیخ ڈائرکٹر مرکزِ توسیعِ تعلیم، پنجاب	۳۳۹
نظریے کی تعلیم کے چند نفسیاتی اصول	پروفیسر عبدالحئی علوی شعبۂ اطلاقی نفسیات پنجاب یونیورسٹی	۳۶۳
نصابات میں نظریۂ پاکستان کو کس طرح سمویا جائے	ڈاکٹر سید عبداللہ صدر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی	۳۷۴
خطبۂ صدارت (چھٹی نشست)	پروفیسر میاں نامدار خاں سیکرٹری تعلیم، حکومتِ پنجاب	۳۸۷
گروہی بحث کی رپورٹیں	شرکائے بحث	۳۹۲
سیمینار پر اظہارِ رائے	شرکائے سیمینار	۴۰۸

خطبۂ اختتامیہ (ساتویں نشست) میر نسیم محمود ۴۲۲
ضمیمہ الف ــــــ دعوتی خط اور سیمینار کے موضوعات کا تجزیہ ۴۳۵
ضمیمہ ب ــــــ سیمینار کا پروگرام ۴۴۱
ضمیمہ ج ــــــ گروہی بحث کے بارے میں چند اشارات ۴۴۵
ضمیمہ د ــــــ سیمینار کے بارے میں سوالنامہ ۴۴۸
ضمیمہ ہ ــــــ سوالنامے کے جواب میں شرکا کی تجاویز و آرا ۴۵۰
ضمیمہ و ــــــ شرکائے سیمینار کے اسمائے گرامی ۴۵۵

پیش لفظ

پاکستان کی بقا، سالمیت اور ترقی کے لیے نظریۂ پاکستان کی اہمیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ تعلیم میں نصابی کتب ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں، اس لیے یہ تقاضا معقول ہے کہ ہماری نصابی کتب کو نہ صرف نظریۂ پاکستان سے ہم آہنگ ہونا چاہیے بلکہ اس کی پوری طرح عکاسی بھی کرنا چاہیے۔

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور کی یہ کوشش رہی ہے کہ نصابی کتب میں نظریۂ پاکستان کی مناسب وضاحت ہو اور اسلامی اقدار کو دلچسپ اور بچوں کے لیے قابلِ قبول شکل میں پیش کیا جائے تاکہ طالبِ علم ایک سچا اور اچھا پاکستانی بن سکے لیکن اس سلسلے میں ایک وقت یہ پیش آتی تھی کہ نظریۂ پاکستان کے خدوخال واضح طور پر ہمارے مؤرخین اور مفکرین نے پیش نہیں کئے تھے اور بچوں کی تعلیم میں غیر واضح باتوں سے بات نہیں بنتی۔ پھر ہمارے دانشوروں اور تعلیمی ماہروں نے یہ رہنمائی بھی نہیں فرمائی تھی کہ نظریۂ پاکستان کو نصابی کتابوں میں کس طرح سمویا جائے۔ عمومی طور پر انہوں نے اس کام کا شاید جائزہ بھی نہ لیا تھا، جو نصابی کتب کو ملی تقاضوں کے مطابق بنانے میں کیا جا چکا ہے۔ ظاہر ہے، جو تنقید موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لیے بغیر کی جائے' وہ پوری طرح مؤثر ہو سکتی ہے' نہ درست رہنمائی ہی کر سکتی ہے۔

انہی امور کے پیشِ نظر پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے ۲۷، ۲۸، ۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ء کو ایک سہ روزہ سیمینار "نظریۂ پاکستان اور نصابی کتب" کے موضوع پر منعقد کیا، جس

کا افتتاح جناب لیفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمان، مارشل لا ایڈمنسٹریٹر و گورنر پنجاب نے کیا۔

سیمینار میں ملک کے ممتاز دانشوروں، اساتذہ کرام اور ماہرینِ تعلیم نے حصہ لیا۔ تقریروں کی محدود گنجائش کے پیشِ نظر نامور اہلِ قلم، مورخین اور مفکرین سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے افکار کو مضامین کی صورت میں قلم بند کر کے ہمیں مستفید فرمائیں، چنانچہ موضوع کا تجزیہ کرنے کے بعد مختلف ذیلی عنوانات پر تقاریر کے علاوہ مقالے لکھوائے گئے، جو سیمینار میں شرکت کرنے والوں میں تقسیم کیے گئے۔ واضح سوالات وضع کیے گئے، جن پر گروہی بحثیں ہوئیں۔ گروہی بحثوں کی رپورٹیں اجلاسِ عام میں پیش ہوئیں، جن کی صدارت ملک کی ممتاز شخصیتوں نے کی۔ ان اصحاب نے حاضرین کو اپنے گرانقدر خیالات سے بھی نوازا۔ سیمینار کی تمام کارروائی ٹیپ کی گئی اور پھر ٹیپ سے تحریری صورت میں لائی گئی۔ سیمینار کے متعلق بے حد حوصلہ افزا آرا موصول ہوئیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ تمام کارروائی کتابی صورت میں شائع کر دی جائے، چنانچہ بورڈ نے انگریزی تقریروں اور مقالات کا اردو میں ترجمہ کروایا اور کارروائی کی ترتیب و تدوین کی۔ یہ کتاب اسی کا حاصل ہے۔

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ "نظریۂ پاکستان اور نصابی کتب" پیش کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب نہ صرف اساتذہ کرام، تعلیمی، تدریسی اداروں اور طالب علموں کے لیے سود مند ہوگی بلکہ عمومی طور پر مفید ثابت ہوگی اور ہمیں اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے ٹھوس مشوروں کو حاصل کرنے کا سبب بنے گی۔

جہاں ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس سیمینار کی وجہ سے نظریۂ پاکستان کی ترویج و تعلیم کے سلسلے میں بورڈ کی گزشتہ کارگزاری کو اب ذرا بہتر طور پر سمجھا جا سکا ہے، وہاں

ہمیں اس کارگزاری کو بہتر بنانے کے بارے میں واضح اشارے بھی ملے ہیں، چنانچہ نصابی کتابوں کی بعض خامیاں فوری طور پر دُور کی جا رہی ہیں اور آئندہ برسوں میں انشاء اللہ یہ اور اسقام سے پاک ہوتی جائیں گی۔ ہمیں یقین ہے کہ اس سیمینار کے ذریعے یہ حقیقت بھی آشکار ہو جائے گی کہ نصابی کتب گو نظریۂ پاکستان کی تبلیغ میں بے حد اہم کردار ادا کرتی ہیں مگر صرف نصابی کتب کے مندرجات ہی سے عامۃ الناس کے رویے میں انقلاب نہیں آسکتا۔ اس کے لیے والدین، اساتذہ، دانشوروں اور تعلیمی ماہروں کی مشترکہ کوششیں شرط ہیں۔

اس کتاب کی تدوین و طباعت میں بہت سے احباب اور تنظیموں نے ہماری مدد فرمائی ہے، فرداً فرداً ان کا شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں۔ ترجمے، پروف ریڈنگ اور تدوین میں راجا رشید احمد نے، جو بورڈ کے افسرِ تعلقاتِ عامہ ہیں، بڑی محنت سے کام کیا ہے۔ دعا ہے کہ ان کی اور ہم سب کی سعی مشکور ہو۔

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی امید ہے، چند ماہ تک چھپ جائے گا اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو دوسرا اردو ایڈیشن بھی شائع کیا جائے گا۔ ہماری توقع اور درخواست ہے کہ ہمیں کتاب کی خامیوں اور خوبیوں سے آگاہ کیا جائے۔

میر نسیم محمود

(میر نسیم محمود)

چیئرمین پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

یکم دسمبر ۱۹۷۱ء

بورڈ کے چیئرمین میر فہیم محمود گورنر پنجاب کو خطبۂ استقبالیہ پیش کر رہے ہیں

"نظریۂ پاکستان اور نصابی کتب"

کے سیمینار ر ۲۷، ۲۸، ۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ء)

کی افتتاحی تقریب پر

خطبۂ استقبالیہ

بخدمت جناب لیفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمٰن صاحب

مارشل لا ایڈمنسٹریٹر و گورنر پنجاب

از:- میر فہیم محمود چیئرمین پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

جناب لیفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمٰن - خواتین و حضرات!

نظریۂ پاکستان اور نصابی کتب کے موضوع پر سیمینار میں شرکت کرنے والوں اور پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہنا یقیناً میرے لیے فخر کا باعث ہے۔

اس سیمینار کو منعقد کرنے کا خیال اپریل ۱۹۷۱ء میں نصابی کتب کی نمائش کی تقریب پر آپ کے فکر انگیز خطبۂ افتتاحیہ سے پیدا ہوا، جس میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اپنے مقاصد کا واضح تصور ان کے حصول کی جانب پہلا قدم ہے۔ آپ نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ پاکستانی مسلمان کی حیثیت سے ہمیں اپنے نظریے کی بنیادوں پر غور کرنا چاہیے تاکہ نصابی کتب کے ذریعے اس کی اشاعت ہو سکے۔

ہم نے محسوس کیا کہ اگرچہ اس بات پر عام اتفاق پایا جاتا ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی

مملکت ہے۔ تاہم اس نظریے کی قطعی اور جامع تعبیر ابھی تک نہیں ہو سکی۔

پاکستانی مسلمان کی حیثیت سے ہمارا نظریہ کیا ہے؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟ یہ کن اقدار کو اپناتا اور فروغ دیتا ہے؟ تاریخ میں اس کا اظہار کن اشکال میں ہوا؟ گزشتہ چودہ سو سال سے دُنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں پر اور ایک ہزار برس سے اس برصغیر کے لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوا؟ پاکستان کے حصول میں اس نظریے نے کیا کردار ادا کیا؟ ہم نے اس مقصد کے لئے کیا کیا قربانیاں دیں؟ آزادی کے ابتدائی ایام میں یہ نظریہ کس طرح سرچشمۂ قوت ثابت ہُوا اور اسے نظر انداز کر کے ہم نے کیا کیا نقصانات اُٹھائے؟ عہدِ حاضر کی دُنیا سے بالعموم اور عالمِ اسلام سے بالخصوص اس کا رشتہ کیا ہے؟ پاکستان کے صُوبوں کی یک جہتی اور ملک کے دونوں بازوؤں میں اتحاد کے سلسلے میں اس کا کیا کردار ہے؟ اور بقول اقبال "یہ ایک بے بہا خداوندی عطیے کے طور پر مسلمانوں میں متحدہ ملی احساس کو کس طرح اجاگر کرتا ہے؟

یہ چند سوالات ہیں، جن پر ہم آپ سے اور سیمینار کے شرکا سے رہنمائی حاصل کریں گے۔

اس نظریے کا واضح تصور بلاشبہ قوم کو اپنے مستقبل کی تشکیل میں مدد دے گا۔ اس طرح ٹیکسٹ بک بورڈ کو نصابی اور اضافی کتب کو اس نظریے سے ہم آہنگ کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ اس کے باوصف ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگرچہ نصابی کتاب تعلیم کا ایک لازمی وسیلہ ہے۔ لیکن یہی ایک ذریعہ کافی نہیں۔ ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ ایک نظریاتی مملکت کے باوقار باشندوں کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے لئے نوجوانوں کے ذہنوں کی نشوونما میں اساتذہ، والدین، گھریلو ماحول اور معاشرہ کیا کردار

ادا کر سکتا ہے۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سبھی اس مقصد کے حاصل کرنے میں نمایاں حصّہ لے سکتے ہیں۔

حال ہی میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نظریے سے چشم پوشی کس قدر سنگین حالات پیدا کر سکتی ہے۔ ثقافت اور افکار کے میدان میں ہمیں ان غیر ملکی زہریلے اثرات سے خبردار رہنا چاہیئے، جو اس نظریے سے ہماری وابستگی کو کمزور کرنے کے درپے ہیں۔ ہمیں علاقائی تعصبات اور دوسرے علیحدگی پسندانہ رجحانات کے خلاف سینہ سپر رہنا چاہیے۔ ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہے کہ جدیدیت کے نام سے مادہ پرستی ملک کے نوجوانوں کے ذہنوں پر مسلط نہ ہونے پائے۔ اس کے پہلو بہ پہلو ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ تنگ نظری اور فرقہ پرستی فکر و عمل کے سرچشموں کو ملوث اور مکدر نہ کر سکے اور آئندہ نسلیں ترقی پسند، دیندار اور محبِ وطن پاکستانیوں کی سی زندگی بسر کر سکیں۔ ہمیں اپنے ان بدخواہ ہمسایوں سے بھی باخبر رہنا چاہیئے، جو ہر حربے سے ہمارے ملک کو (جس کا وجود انہوں نے کبھی دل سے قبول نہیں کیا اور جو انہیں ہمیشہ کھٹکتا رہا ہے) زک پہنچانے کے ہر موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے تیار رہیں۔ اس لئے ہمیں آبادی کے سوال اور دفاع کے مسائل کا دینی احکام کی روشنی میں حقیقت پسندانہ حل تلاش کرنا ہے۔ ہمارے لئے علم و فن کی عالمگیر ترقی سے استفادہ کرنا بھی لازمی ہے۔

سیمینار کی ابتدائی نشستوں میں مذکورہ بالا سوالات کے جوابات تلاش کئے جائیں گے۔ پھر ان مباحثوں کی روشنی میں نصابی کتب کے مندرجات کا مقدار و معیار کے لحاظ سے جائزہ لیا جائے گا تاکہ ان میں نظریۂ پاکستان کے انعکاس کی موجودہ صورتِ حال کا اندازہ لگایا جائے۔ ایک نصابی کتاب کی اوّلین خوبی یہ ہونی چاہئیے کہ

بچے کے لیے دلچسپ ہو اور نظریات کو اس طریقے سے پیش کرے کہ انہیں سمجھنے اور اپنانے میں آسانی ہو۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے کہ موجودہ نصابی کتب میں نظریہ پاکستان اور اس کے اجزا بنیادی عقائد و اقدار اور معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی مقاصد کس حد تک پیش کیے گئے ہیں۔ ہمیں یہ اندازہ لگانا ہے کہ طالب علم کو ایک اچھا پاکستانی اور دُنیا کا ایک اچھا شہری بنانے میں علاقائی تعصب سے محفوظ رکھنے اور اسے قومی یک جہتی کی راہ پر گامزن کرنے میں نصابی کتب کہاں تک مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ہمیں اس نظریے کو فروغ دینے کے لیے اضافی کتابوں کے پروگرام کی افادیت پر بھی غور کرنا ہوگا۔ اس سیمینار کے شرکا سے ہم ایسی ٹھوس تجاویز حاصل کرنے کی کوشش کریں گے، جن سے ہماری نصابی کتب نظریاتی مقاصد کے حصول کا ایک مؤثر ذریعہ بن سکیں۔

اسی مقصد کے پیشِ نظر ہم نے سرکردہ مفکرین اور نامور اہلِ علم کو اس سیمینار میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ سیمینار کا ایک اہم پہلو اس کے گروہی مباحثے ہیں، جن میں تمام شرکا کو ان بنیادی سوالات کا حل تلاش کرنے کے لیے شمولیت کی دعوت دی جائے گی۔ گروہی مباحثوں کے نتائج عام اجلاس میں پیش کیے جائیں گے۔ جہاں ان پر پھر بحث ہوگی اور حسبِ ضرورت ترامیم کے بعد انہیں منظور کیا جائے گا۔

جنابِ والا! میں یہ بیان کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہوں کہ ہم نے ٹیکسٹ بک بورڈ میں پہلے ہی نظریہ پاکستان کو نصابی کتب اور اضافی کتابوں میں اس کی صحیح شکل میں پیش کرنے کی کافی کوشش کی ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ یہ سیمینار ہمیں اپنے فرائض کو زیادہ مؤثر انداز میں ادا کرنے میں سُودمند ثابت ہوگا۔ مجھے یہ بھی توقع ہے کہ اس سیمینار کے

مذاکرات ماہرینِ تعلیم، دانشوروں اور عوام الناس کے لیے دلچسپی اور افادیت کے حامل ہوں گے۔ ہماری دُعا ہے کہ یہ سیمینار ہمیں ایک ترقی یافتہ متحدہ اور مضبوط مسلم قوم بننے میں مدد دے۔

جنابِ والا! میں ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس سیمینار کا افتتاح کرنا قبول فرمایا۔ میں تمام مہمانوں اور سیمینار میں شرکت کرنے والے حضرات کا بھی ممنون ہوں اور انہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔ ان کے قیام کو مفید اور خوشگوار بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ اگر انہیں کوئی تکلیف محسوس ہو تو اس کے لیے میں پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

جنابِ والا! اِن مختصر الفاظ کے ساتھ اب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ سیمینار کا افتتاح فرمائیں۔

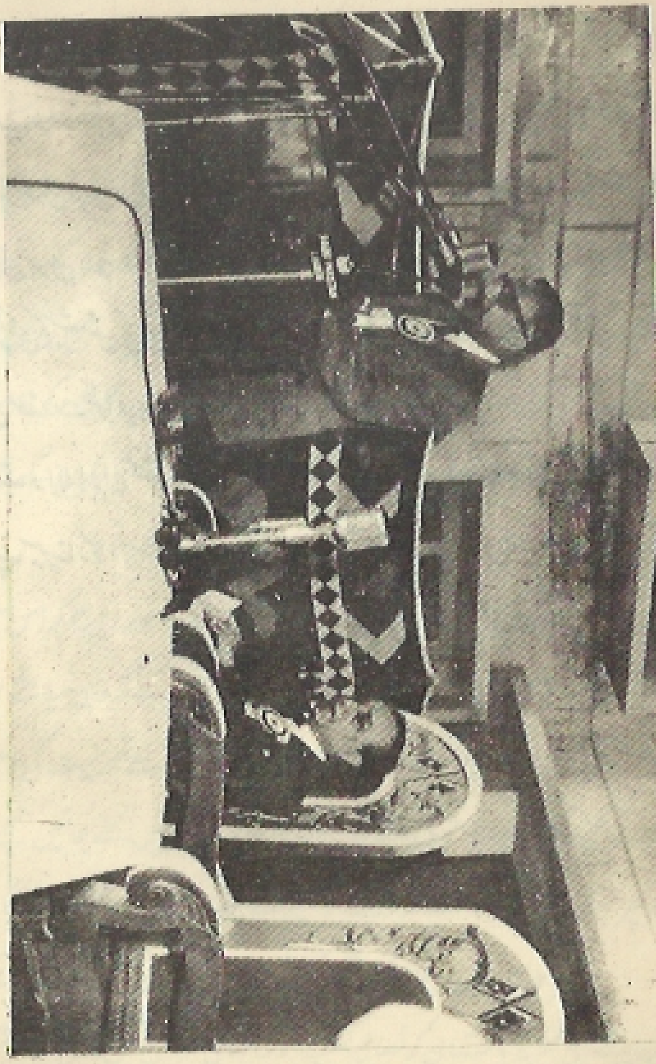

گورنر پنجاب سیمینار کا افتتاح کر رہے ہیں

"نظریۂ پاکستان اور نصابی کتب"

کے سہ روزہ سیمینار پر

لیفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمن صاحب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر و گورنر پنجاب

کا

خطبۂ افتتاحیہ

بتاریخ ۱۰، ۲۷، ستمبر ۱۹۷۱ء

جناب چیئرمین، خواتین و حضرات!

"نظریۂ پاکستان اور نصابی کتب" کے اہم موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار کی افتتاحی تقریب میں شمولیت میرے لیے باعثِ مسرت ہے۔ اس سیمینار کا موضوع نہ صرف آپ کے ادارے کے لیے بلکہ پاکستان کے ان تمام شہریوں کے لیے اہمیت رکھتا ہے، جو پاکستان کے قیام اور ترقی میں آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت اور بہتر مستقبل میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

مجھے اپنی قدیم اور رحالیہ تاریخ کے حوالے سے یہ بات شروع کرنی چاہیے۔ پاکستان کا ظہور عمیق تفکر اور طویل تجربے کا نتیجہ ہے۔ تاریخ کے ایک ہزار سال اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ برصغیر میں ہندو اور مسلمان دو الگ قوموں کی طرح رہے اور ان میں مشترک اقدار بے حد کم تھیں۔ بقول قائداعظمؒ

"ہندو اور مسلمان الگ الگ مذہبوں، فلسفوں، معاشرتی رسوم اور ادبیات سے

تعلق رکھتے ہیں۔ وہ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے اور مل کر کھانا نہیں کھاتے اور فی الحقیقت دو مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن کی بنیاد عموماً ایک دوسرے کے مخالف نظریات اور تصورات پر ہے۔ زندگی پر اور زندگی کے متعلق ان کے خیالات مختلف ہیں۔ ان کی تاریخی نظمیں، داستانیں، ان کے مشاہیر الگ الگ ہیں اکثر اوقات ایک قوم کا ہیرو دوسری قوم کا دشمن، ایک قوم کی فتح، دوسری کی شکست اور ایک کی شکست دوسری کی فتح ہوتی ہے۔"

ایک قوم کی حیثیت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کا کسی صورت سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ حتیٰ کہ دونوں قوموں میں قدرتی اور تاریخی اجنبیت کے باعث ان میں عمل سیاسی سمجھوتے کا امکان بھی رد کر دیا گیا۔ تاریخ پر ایک سطحی نظر سے متفرق شہادتیں ضرور اکٹھی کی جا سکتی ہیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی تہذیبوں کا ایک دوسری پر کافی اثر ہوا مگر یہ نظریہ چھان پھٹک کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ہندو اور مسلمان دو مختلف بلکہ بہت سے پہلوؤں سے مخالف تہذیبوں کے نمائندے ہیں۔

قائداعظمؒ کو ایک نئی مملکت کے استحکام کے سلسلے میں پیش آنے والی عظیم دشواریوں کا علم تھا۔ ملک کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے مختصر عہد میں انہوں نے لوگوں کو محنت اور جانفشانی سے کام کر کے مملکت کو ان لوگوں کے شایانِ شان بنانے کی تلقین کی جنہوں نے اس کے قیام کے لئے کڑی مصیبتیں جھیلیں اور بھاری قربانیاں دیں۔ قائداعظم کی وفات اس نوزائیدہ مملکت کا بہت بڑا المیہ تھا۔

اس کے بعد صورتِ حال ایسی سنگین رہی اور دباؤ اتنے زیادہ کہ ہمیں اپنے نصب العین کا احساس کھو بیٹھنے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ ہم نظریۂ پاکستان کے متعلق باتیں

کرتے رہے، اعلیٰ اسلامی اقدار پر اپنے یقین کا اظہار کرتے رہے اور اپنے آپ کو باور کراتے رہے کہ ہمارا کام ان اعلیٰ اقدار کا زبانی تکرار ہے۔ یہ سب کچھ کافی نہ تھا۔ ہم نے کافی نقصان اُٹھانے کے بعد سیکھا ہے کہ نعرے مدبرانہ افکار اور عمل کا بدل نہیں ہو سکتے۔ اقدار کی تشکیل اور ان کا ذکر کرتے رہنا آسان ترین بات ہے۔ مگر ان اقدار کو قابلِ تقلید اداروں اور روزمرہ زندگی میں رہنمائی کے عملی اصولوں کی شکل دینے کے لئے فکر و عمل کی ضرورت ہے۔ تاریخِ انسانیت ایسے بلند بانگ دعووں کے المیوں سے بھری پڑی ہے، جن کی تائید اقدار کے عملی مظاہرے سے نہ کی گئی۔

کسی قوم کا سب سے اہم فرض اپنے آپ کا عرفان حاصل کرنا اور اس کو زندہ رکھنے اور پروان چڑھانے کے لیے ادارے قائم کرنا ہے۔ یہ دریافت ایک دلکش مگر نہایت محنت طلب کام ہے، جو زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے مفکرین سائنسدانوں، فلسفیوں اور انتظامی اور صنعتی کارکنوں کے بے لوث اشتراک ہی سے ممکن ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں آزمائش اور خطا کی کافی گنجائش ہے۔ تاریخ میں ہر قوم نے غلطی کرنے کا حق استعمال کیا ہے اور ہم بھی اس سے مبرا نہیں رہے۔ البتہ ایک واضح اور نمایاں طور پر روشن نظریے کی حامل قوم کی حیثیت سے ہماری نگاہ صاف ہونی چاہئے تھی اور ہمیں طے شدہ سمت کی طرف سنبھلے تلے قدم بڑھانے کا معتدبہ ثبوت بہم پہنچانا چاہئے تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک نئی قوم کو لازمی طور پر پیش آنے والی آزمائشوں اور مصیبتوں سے ہمیں بھی پورا پورا حصّہ ملا اور ہم سنگین بحرانوں میں مبتلا رہے ہیں۔ بحران کسی قوم کی روحانی ساخت کے اعتبار سے دو مخالف اثرات مرتب کر سکتا ہے۔

یہ بحران اس قوم کی طرف سے بہترین یا بدترین ردِ عمل کو سامنے لاتا ہے۔ اپنی تمام انفرادی اور اجتماعی خامیوں کے باوجود ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ قیامِ پاکستان کے شروع ہی سے پیش آنے والے خطرات ہمارے قومی کردار کے بہترین عناصر کو سامنے لاتے رہے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں کو ہمارا ملک ایک آنکھ نہیں بھاتا، وُہ بھی ہمارے تحمل، بہادری، حوصلے اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

اس بات کو تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ اپنی بہترین صلاحیتیں دکھانے کے لیے بڑے وقت کے ظہور کا انتظار کرنا نادانی ہے۔ جو کچھ ہم میں جبلی طور پر ہے، ہمیں اس کا شعور اور آگاہی ہونی چاہیے۔ قومی صُورتِ حال میں یہ تغیر پیدا کرنا تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ معلمین کا بنیادی فرض ہے کہ وُہ موروثی اقدار کو ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرائیں۔ تعلیم بحیثیتِ مجموعی قومی کردار کا تعین کرتی ہے۔

مجھے پُورے زور سے کہنے دیجیے کہ ایک نظریے کی بنا پر ظہور میں آنے والی مملکت نظریاتی بنیادوں پر ہی قائم اور استوار ہو سکتی ہے۔ اس کی زندگی کا انحصار نوجوان نسل کو نظریے کی اہمیت کا احساس دلانے پر ہے۔ ہم جبھی مستحکم ہو سکتے ہیں کہ اپنے نظریے سے قوت حاصل کریں۔ اگر نظریہ ضائع ہو گیا تو ہم نیست و نابُود ہو جائیں گے۔ مگر بہُت سے عوامل نظریۂ پاکستان کی راہ میں مزاحم ہیں۔ انگریز حکمرانوں کے عہد میں مملکت اور اس کے شہریوں کو مغربی تصورات کی تعلیم دی گئی۔ انگریزوں کی زبان نے ہمیں حالات کو انگریزوں کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا سکھایا۔ ہمیں ایسے

حالات میں مغرب کی نقل کرنے پر مجبُور کیا گیا، جو اب بدل چکے ہیں۔ یہ نقالی اور خوشہ چینی واضح فکر کی راہ میں حائل ہے۔

ماضیٔ قریب میں دیگر بیرونی نظریات کی درآمد نے ہمیں اور بھی زیادہ ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا ہے۔ ذہنی غلامی، غلامی کی بدترین صورت ہوتی ہے۔ ایک آزاد قوم کو ہمیشہ آزادانہ طور پر سوچنا چاہیے۔ اس وجہ سے میں یقین رکھتا ہوں کہ پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی اس نقطۂ نظر سے دوبارہ تعلیم حاصل کرنے کا عمل ضروری ہے۔

مجھے یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام محض رسوم و رواج کے مجموعے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ یہ ایک آفاقی دین ہے جو مل جُل کر زندگی گزارنے کے طریق سکھاتا ہے، جس میں نظم وضبط کی خُوبیاں معاشرتی اطوار کے معیار، ایثار کے جذبے اور انفرادی منفعت پر عام بہبود کی فوقیت کا احساس شامل ہیں۔ قانون کے سامنے سب کی برابری، مواقع کے حصول میں مساوات، انسانوں کے درمیان عدل، آزادیٔ ضمیر، قانون کے تقاضوں کی حدود کے مطابق شخصی آزادی، آدمی کی اپنے تمام اعمال کے معاملے میں ذاتی ذمّے داری چند ایسے بُنیادی تصورات ہیں، جو مسلمانوں کے ذہنوں میں صدیوں سے جاگزیں رہے ہیں۔ یہ تمام تصورات نصابی کتب میں منعکس ہونے چاہئیں۔ ہمیں دُوسری قوموں کے نمونوں کی ضرورت نہیں۔ ہمارا شاندار ماضی وہ سب مثالیں فراہم کر سکتا ہے جو انسانیت کی بہترین قدروں کو اُجاگر کرتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں عہدِ حاضر کی حقیقتوں سے بھی استفادہ کرنا ہے۔ اسلام اور جدید سائنس کی ہم آہنگی کے لیے عظیم ذہنی کوششوں کی ضرورت ہوگی۔ ہم بڑھتی

ہوئی آبادی کے سبب سمٹتے ہوئے معیارِ زندگی اور دوسرے بہت سے مسائل کے ساتھ ایک اور صنعتی اور معاشرتی انقلاب کے دہانے پر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس سیاق و سباق میں معاشیاتِ اسلام پر پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ محض اتفاق نہ تھا کہ دُنیا کو پہلی فلاحی مملکت اسلام نے دی۔ پاکستان کو اس نصب العین کی طرف لے جانا ہی بانیٔ پاکستان کا واضح مقصد تھا، جو ان کی سٹیٹ بنک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب میں کی گئی تقریر سے ظاہر ہے۔ سوشیالوجی، پولیٹیکل سائنس اور شہریت وغیرہ ایسے مضمون ہیں، جن کی نظریۂ پاکستان کی روشنی میں تعمیرِ نو کی جا سکتی ہے۔ قائدِ اعظمؒ کی شایانِ شان سوانحِ عمری کی تصنیف بھی قومی اہمیت کے کاموں میں سے ہے۔

مجھے اس سے اتفاق ہے کہ مختلف اداروں، تنظیموں، افراد، والدین، اساتذہ، ماحول، اخبارات، ریڈیو، فلم اور ٹیلیویژن سبھی کو پاکستان کی زندگی میں تبدیلی لانے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

لیکن جیسا کہ آپ نے بجا طور پر نشان دہی کی ہے، ہمارے لیے کتاب بُنیادی وسیلۂ تعلیم کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ہماری آیندہ نسلوں کے ذہنوں کو صحیح بنیادوں پر ڈھالنے کے لیے بہت اثر انداز ہو گی۔ جس نظریے اور جن نمونوں کے مطابق ہمیں زندگیوں کو ڈھالنا ہے، ان کو نوجوان افراد کے لئے یقینی اور حتمی انداز میں سامنے لایا جانا چاہیے۔ صرف یہ بات ہی ان کی زندگیوں کو بامعنی بنا سکے گی۔ میں اس سے آگے بھی جاتا ہوں۔ ہماری قومی تقدیر کا انحصار زیادہ تر اس بات پر ہے کہ ہم اپنے بچّوں کو کس قسم کی کتابیں مہیا کرتے ہیں۔

مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی ہے۔ کہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے نصابی کتب اور اضافی کتب میں نظریۂ پاکستان کے انعکاس کے مسئلے پر پہلے ہی خصوصی توجہ دی ہے۔ اس سلسلے میں کیے گئے کام کا جائزہ لینا اور آیندہ کے لئے زیادہ مؤثر پروگرام بنانے کے لئے راہیں متعین کرنا ضروری ہے۔ بچّوں کے لئے نصابی کتب کی تصنیف دوسری قسم کی کتابیں لکھنے سے زیادہ دُشوار کام ہے۔ مصنف کو بچّوں کی نفسیات سے گہری واقفیت کے ساتھ موزوں تعلیم اور اسلوب کے طریقوں میں استعداد حاصل ہونی چاہیے۔ کتاب کے مندرجات کو نظریاتی پہلو سے مفید بنانا کافی کٹھن کام ہے۔ مصنفین کو خیال کی دولت کے ساتھ واضح اور سمجھانے والے اسلوب سے بہرہ ور ہونا چاہیے، جس سے بچّے کی توجہ اور دلچسپی حاصل کی جا سکتی ہو۔

سیمینار کا موضوع اہم اور دقیق ہے۔ اس کے لئے محنت اور مقصدی سوچ اور بحث کی ضرورت ہو گی۔ مجھے اُمید ہے کہ گفتگو، گروہی بحث اور عام اجلاس پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ اور عوام میں اس موضوع سے متعلق بہت سے سوالات کو واضح کرنے اور معاشرتی تعمیرِ نو کے کئی بنیادی سوالوں کے جوابات مہیا کرنے میں بڑے مفید ثابت ہوں گے۔

ان الفاظ کے ساتھ میں سیمینار کا افتتاح اور آپ کی کامیابی کے لئے دُعا کرنے میں مسرت محسوس کرتا ہوں۔

پاکستان پائندہ باد۔

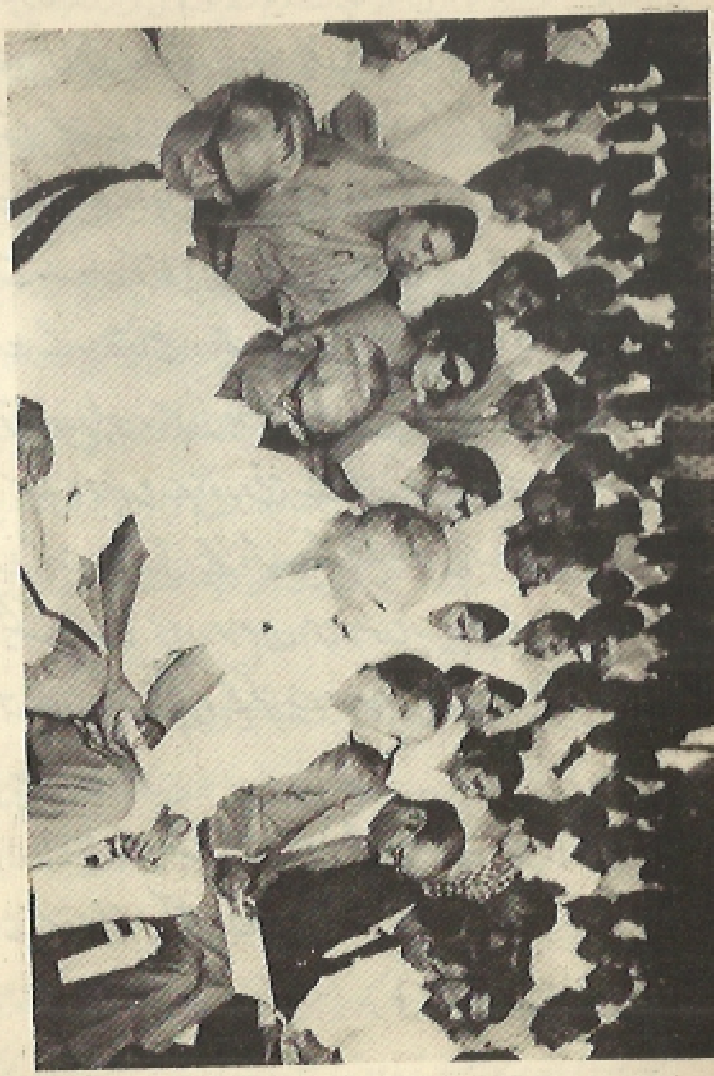

نظریہ پاکستان کے تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور اقداری مضمرات

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، کراچی

جناب صدر، خواتین و حضرات!

ایک عرصے سے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارا نظام تعلیم، ہمارا نصاب اور ہماری درسی کتابیں ہماری ضروریات اور مقاصد حیات سے ہم آہنگ نہیں ہیں اور جب تک ان میں انقلابی تبدیلیاں بروئے کار نہ آئیں ان کو مفید نہیں بنایا جا سکتا۔ نصاب اور کتابوں کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے اور تمام محب وطن ماہرین تعلیم اس امر پر متفق ہیں کہ ان کو ہمارے نظریہ حیات اور اقدار کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ کتابوں کے ذریعے سے ہمارا معاشرہ بن بھی سکتا ہے اور بگڑ بھی سکتا ہے، پاکستان کی بنیادیں مضبوط بھی ہو سکتی ہیں اور کھوکھلی بھی، ہماری نسلوں میں تعمیر ملت کے جذبے کو بیدار بھی کیا جا سکتا ہے اور انھیں تخریب کاری یا بے اعتنائی کا سبق بھی پڑھایا جا سکتا ہے۔ ہم نے چوبیس سال تک اس حقیقت کو قابل اعتنا نہ سمجھا اور ملت کا سرمایہ لٹتا رہا۔ اب اس لاپروائی کے کچھ نتائج سامنے آ گئے ہیں اور یہ معلوم نہیں کہ باقی کیا قیامت ڈھائیں گے۔ اب تو ہمیں کم از کم بیدار ہونا چاہیئے کہ اس سیلاب کے آگے کچھ بند باندھ سکیں اور آئندہ ہمارے نوجوانوں کی صلاحیتیں تعمیر ملت کا رخ اختیار کریں۔ اس لیے میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ

کے ارباب حل وعقد کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اس مسئلے کی طرف توجہ کی اور اس مذاکرے کے انعقاد کا اہتمام کیا ہے اور یہ امر میرے لئے باعث تشکر وامتنان ہے کہ اس میں مجھے شرکت کی دعوت دیکر اس موضوع پر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا ہے۔

بعض افراد جو پاکستان کی ضرورت کو تسلیم نہیں کرتے متواتر یہ وسوسہ پھیلاتے ہیں کہ اس وطن عزیز کا قیام محض ایک تاریخی حادثہ ہے اور یہ کہ بعض سیاسی کارکنوں کی خود غرضی یا جاہ طلبی نے اس کا مطالبہ پیدا کیا اور مسلمانوں کا وہ طبقہ، جو ملازمتوں میں زیادہ حصے کا خواہش مند تھا اور وہ سرمایہ کار جو اپنے سرمائے کے لئے زیادہ منفعت کے مواقع تلاش کرتے تھے جمع ہو گئے اور انہوں نے اسلام کے نام پر ایک عام جنون پیدا کر کے پاکستان کی تحریک کھڑی کر دی جب خود تحریک پاکستان شباب پر تھی تو ہندو اخباروں اور سیاسی رہنماؤں نے بھی مسلمان عوام کو یہ کہہ کر توڑنے کی کوشش کی کہ چند نوابوں اور جاگیرداروں نے مل کر ہندوستان کی آزادی میں روڑے اٹکانے کی تدبیر نکالی ہے، ورنہ مطالبۂ پاکستان کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہندو لیڈروں کا جواب تو مسلمان عوام نے دے دیا اور وہ قومی موقف سے سرمو نہ ہٹے۔ ان کا یہ فیصلہ تھا کہ ہندو یہ ساری باتیں ان کے رہنماؤں کو بدنام کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے کی غرض سے کر رہے ہیں یوں ظاہر ہے کہ تحریک میں کسی قسم کا ضعف پیدا نہ ہوا اور کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ زمانے نے یہ بھی دیکھا کہ وہی نواب اور جاگیردار اپنی املاک چھوڑ کر نیا وطن آباد کرنے کے لئے عسرت کی حالت میں یہاں آئے سب سے زیادہ ہدف نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم کو بنایا جاتا تھا،

ان کی دولت کا پاکستان آکر یہ عالم تھا کہ جب وہ شہید ہوئے تو ان کے بینک میں سو روپیہ ان کی جرابوں میں رفو اور قمیص میں پیوند تھا اور اگر حکومت متوجہ نہ ہوتی تو ان کی بیوہ اور بچوں کو نان شبینہ کا بھی سہارا نہ تھا۔ لیاقت علی خاں سے کم تر درجے کے بہت سے ایسے افراد پاکستان میں آج تک موجود ہیں جو انتہائی عسرت اور گمنامی میں زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔

جہاں تک ان افراد کے نظریے کا تعلق ہے جن کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے اور جو صرف ہندوؤں کے الزامات کو بعض اوقات اسی طرح اور بعض اوقات ذرا سا نظریاتی رنگ دے کر بیان کرتے ہیں ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ انہوں نے اس برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی نہیں کیا ہے۔ اول تو اب یہ نظریہ کہ محض معاشی قوتیں ہی تاریخ بناتی ہیں، چند خاص ممالک اور ایک مخصوص عقیدے کے افراد میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ معاشیات کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ارباب نظر اب یہ قبول کرنے پر مجبور ہیں کہ اور عوامل بھی تاریخ میں کارفرما ہوتے ہیں اور بعض اوقات معاشی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر اور بعض اوقات ان کے علی الرغم تاریخ کا دھارا موڑنے میں کامیاب ہوتے ہیں، مگر اس وقت اس نظری بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ یہ دیکھنا ہے کہ تحریک پاکستان کے مستول عوامل کیا تھے۔

سطحی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت خراب تھی، اس لئے وہ ایک بہتر معاشی دنیا بنانے کے لئے بے چین تھے اور اس غرض سے انہوں نے ایک جداگانہ وطن کا مطالبہ کیا، لیکن اس دلیل میں یہ سقم ہو گا کہ جس وقت

تحریک پاکستان شروع ہوئی تو تمام دنیا کے ماہرینِ معاشیات برابر یہ فتویٰ دیتے رہے کہ پاکستان کی معیشت کبھی ایک مستقل ملک کی ضروریات کی متحمل نہیں ہوگی اور پاکستان قائم بھی ہو گیا تو اس کی آبادی دائماً مفلوک الحال رہے گی۔ یہ سب کچھ غلط ضرور ثابت ہوا لیکن بعد میں۔ اب اگر یہ دلیل دی جائے کہ اگرچہ کل شواہد معاشی ضعف پر دلالت کرتے تھے اور تمام ماہرین اس کی تصدیق کرتے تھے کہ پاکستان میں خوشحالی کی توقع نہیں کی جا سکتی لیکن پھر بھی خواص و عوام اپنے سینوں میں ایسے تقاضے چھپائے ہوئے تھے، جن کا حقیقت سے اس وقت کوئی تعلق نظر آتا تھا تو اس کی وقعت ظاہر ہے چنانچہ دنیا میں آج تک کسی جگہ معاشی عوامل نے یوں پراسرار طریقے پر کام نہیں کیا۔ اگر رہنماؤں کی جاہ طلبی اور تمول پسندی کے افسانے گھڑے جائیں تو وہ بھی بے بنیاد ثابت ہوں گے۔ اگر قائدِ اعظمؒ جاہ کے کھوٹے سکے کے خریدار تھے تو انہوں نے متحدہ ہند کی وزارت عظمیٰ کی پیش کش کو کیوں ٹھکرا دیا اور بہت سے ایسے سرکاری افسر اس تخمینے کے باوجود کہ پاکستان ان کی تنخواہوں کا متحمل نہ ہو سکے گا، پاکستان کیوں آئے؟ کیا پاکستان انگریزوں کو شکست دینے والی کسی فاتح قوم نے بنوایا تھا کہ اسے ایک تاریخی حادثہ کہا جائے؟ کیا اس کی مثال ان مصنوعی ممالک کی سی تھی جو پہلی جنگ سے قبل افریقہ کے بٹوارے نے پیدا کیے تھے؟ وہ لوگ جو پاکستان کو ایک تاریخی حادثہ کہتے ہیں، وہ خود اپنے بیان کی صداقت پر ایمان نہیں رکھ سکتے۔ ان کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ اس ملک کی تخریبی قوتوں کو مستحکم کریں۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر اس برِعظیم کی تاریخ کا معمولی جائزہ بھی لیا جائے تو یہ بات

ثابت ہو جاتی ہے کہ جس دن سے یہاں مسلمانوں نے قدم رکھا ہے اسی دن سے ان کی یہ خواہش رہی ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کی پاسبانی کریں۔ مسلمانوں کی تمام تحریکیں بے معنی ہو جاتی ہیں، اگر ان کی اس قدرِ مشترک سے انکار کر دیا جائے کہ وہ مسلمانوں کی انفرادیت کے تحفظ کے لیے تھیں۔ انفرادیت کی یہ پاسداری اس لیے تھی کہ وہ انسانیت کے اس بحرِ ذخار میں جس کا یہ برِعظیم بہت عرصے سے مسکن رہا ہے ایسے نہ ڈوبیں کہ ان کا دین، ان کی ثقافت اور ان کا طریقِ زندگی ان کے ساتھ غرق ہو جائے۔ انہیں مسلمان ہونے پر فخر تھا اور وہ مسلمان رہنا چاہتے تھے اور اپنی اولاد کو بھی مسلمان رکھنے کے آرزومند تھے۔ ہندوؤں میں بہت سی تحریکیں اٹھیں، جو مسلمانوں کو نہایت ہوشیاری سے ہندو ثقافت و دین میں مدغم کرنا چاہتی تھیں اور خود مسلمانوں میں وقتاً فوقتاً ایسے عناصر پیدا ہوئے جو ہندو تصورات سے قریب آنے لگے۔ لیکن بالآخر مسلمانوں کی انفرادیت پسندی ان کے آڑے آئی اور انہیں من حیث القوم فنا ہونے سے بچا لیا۔

اگر مسلمانوں کے شعور اور تحت الشعور پر کوئی جذبہ مستولی رہا ہے تو وہ بقائے انفرادیت کا ہے۔ یہی سبب تو ہے کہ ان پر تاریخ کی تقریباً چودہ سو سال کی پوری بساط میں کوئی جادو نہیں چلا۔ نہ ان چودہ صدیوں کے اوائل میں وہ مٹھی بھر مسلمان جو ساحلی منڈیوں میں آباد تھے اپنے مسلک اور طریقِ حیات سے بھٹکے، نہ سندھ میں صدیاں گزرنے کے باوجود وہ ہندوؤں میں مدغم ہوئے، نہ جنوبی ہند میں ماپلوں کی معمولی سی اقلیت نے باوجود برہمن درجہ پانے کے ہندو معاشرہ اپنے انضمام کا اہل سمجھا، نہ بھگتوں کے روحانی عروج اور ان کے دل پذیر مواعظ نے انہیں جادہ سے ہٹایا۔

نہ اٹھارویں صدی میں وطنیت کے نعرے نے انہیں ہندوستانی قوم کا جزو بننے پر آمادہ کیا، نہ تحریک خلافت کے زمانے میں جذبۂ وطنیت کے عروج نے انہیں دائمی شمولیت کا چسکہ لگایا، نہ گاندھی جی کی چکنی چپڑی باتوں نے ان کے دل سے اپنی انفرادیت کے ساتھ جذبۂ وفاداری کو کم کیا۔ چودہ سو سال تک کیا ایک بھی ایسا موقعہ نہ آیا کہ معاشی تقاضے ان کی ضد توڑتے؟ ۱۸۵۷ء کے بعد انہوں نے نکبت و معاشی تباہی کو سینے سے لگایا لیکن ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریز کی خوشامد کو پسند نہ کیا۔ بعد میں جب انگریز کی مخالفت نے انہیں ہندوؤں کے ساتھ دعوتِ اتحاد دی تو انہوں نے اپنی انفرادیت پر اصرار قائم رکھا اور اتحاد کے لئے یہ شرط لگائی کہ ان کی جداگانہ حیثیت قائم رہے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء کے کانگریس لیگ میثاق کا یہی مقصد تھا۔ تحریک خلافت کے دوران کانگریس میں شمولیت کے باوجود وہ اپنے ہی خواب دیکھتے رہے اور ہندو قوم میں مل کر اپنا وجود کھو بیٹھنے پر تیار نہ ہوئے۔

یہ جذبۂ انفرادیت اور اس کی بقا کی خواہش ہی دراصل ہماری قومیت کی بنیاد ہیں۔ اگر یہ جذبہ کمزور پڑ جائے تو پھر پاکستانی ملت کے وجود کی ضامن کوئی اور شے نہیں ہو سکتی۔ ہماری تعلیم کا مرکزی ستون اسی جذبے کی نشوونما کو ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس میں تمام وہ اصول و جذبات مرتکز ہیں جن سے نظریۂ پاکستان مرکب ہے۔ ادنیٰ تامل سے ظاہر ہو جائے گا کہ کسی قوم کی خواہش زیست اس لئے ہوتی ہے کہ وہ دوسروں میں ضم ہو کر اپنی انفرادیت کو گم کرنا نہیں چاہتی۔ مختلف اقوام میں اس خواہش زیست کے بعض خارجی مظاہر ہوتے ہیں اور ان مظاہر میں سب سے زیادہ اہم قوم کا نام ہوتا ہے جو امتداد زمانہ سے دلوں میں پیوست ہو جاتا ہے اور جس سے ایک عمیق اور والہانہ

لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ نام حقیقتاً چند ایسی مضمر خصوصیات پر دلالت کرتا ہے جو تمام قوم میں مشترک ہوتی ہیں اور اس وجہ سے اسے بہت عزیز ہوتی ہیں۔ یہ خصوصیات ایک طویل عرصہ تک ساتھ رہنے اور زندگی کی کامیابیوں اور نامرادیوں میں طویل شرکت، ہم خیالی، ہم مذاقی، ہم آہنگی اور توقعات اور امیدوں کی یک رنگی سے پیدا ہوتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ یوں تو محض ساتھ رہنے سے آہستہ آہستہ تمام افراد ایک ہی طرح سوچنے اور ایک ہی راستہ پر چلنے کے عادی ہو جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ اس امر کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے اور اگر خارجی یا داخلی طوفان آئیں تو وہ بنیادی ہم آہنگی کے شجر کو اکھیڑ کر نہ پھینک دیں۔ چنانچہ بعض اوقات کسی فاتح قوت سے مغلوب ہو کر بعض اوقات کسی جدید تحریک سے متاثر ہو کر، اقوام کا ارادۂ زیست کمزور پڑ جاتا ہے اور پھر ان کی ہستی ختم ہو جاتی ہے۔

اس برعظیم کے مسلمان چودہ سو سال سے ساتھ رہنے، ایک ضابطۂ حیات کے پابند ہونے، عروج و زوال، ترقی و انحطاط، قوت و نکبت میں شریک رہنے سے ایک قوم بن گئے اور تمام ذیلی اختلافات کے باوجود ان میں صدیوں یہ جذبۂ قومیت پرورش پا کر مستحکم ہو گیا۔ اس کا ایک نتیجہ پاکستان ہے۔ اگر یہ جذبۂ قومیت استوار نہ ہوتا تو برعظیم کے مسلمان کبھی کے ہندوؤں میں مدغم ہو گئے ہوتے اور پاکستان وجود میں نہ آتا۔ اب جب کہ پاکستان وجود میں آ گیا ہے تو وہ اس برعظیم کی مسلم قوم کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ باقی ہندوستان کے مسلمان ضمنی طور پر اس سے وابستہ ہیں۔ یہ صورت ہر قسم کی قوم کو پیش آ سکتی ہے، خواہ وہ محض لسانی بنیادوں پر قائم ہو یا نسلی یگانگت کی وجہ سے وجود میں آئی ہو، یا اس کے وجود میں آنے کے اور عوامل ہوں۔ بہت سی اقوام

ایسی ہوتی ہیں جن کا مرکزی وطن ایک علاقہ ہوتا ہے جو ان کا ملک کہلاتا ہے اور ان کے بہت سے افراد دوسرے علاقوں میں پھیلے ہوتے ہیں اور دوسرے ممالک کے شہری ہوتے ہیں۔ خواہ قانونی طور سے کوئی ملک ان بکھرے ہوئے ہم قوموں سے کتنا ہی دست بردار کیوں نہ ہو لیکن وہ محبت اور یگانگت کے ان رشتوں کو کبھی نہیں توڑ سکتا جو اس کے شہریوں اور اس کے دوسرے ہم قوم غیر شہریوں کے درمیان ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔ اس سے بین الاقوامی دشواریاں ضرور پیدا ہوتی ہیں لیکن خود ان دشواریوں کا وجود اس امر کا ثبوت ہے کہ ہم قومی کے رشتوں کو جغرافیائی حدود توڑنے میں کامیاب نہیں رہتیں۔

یہ عظیم الشان اور کثیر ہندی مسلم قوم قیام پاکستان سے قبل اس برعظیم کے مختلف حصوں میں آباد تھی اور مختلف زبانیں بولتی تھی، اس کے درمیان رسم و رواج کے بہت سے جزوی اختلافات تھے لیکن اس میں جذبۂ قومیت موجود تھا۔ اگرچہ ہندوستانی مسلمان کے نام سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہیں، لیکن اس کے باوجود اس جذبہ میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ اس وقت بھی پاکستانیوں کو ہندوستان میں رہنے والے ہم قوموں کا جتنا خیال ہے عالم اسلام سے حد درجہ محبت کے باوجود دوسرے مسلمانوں کے ساتھ اتنی یگانگت نہیں ہے اور ہندوستان کے مسلمان بھی جتنے پاکستان سے مانوس ہیں دوسرے اسلامی ممالک سے نہیں ہیں۔ یہ تمام باتیں خصوصی تعلقات کی نشاندہی کرتی ہیں، جن کا سبب وہی ہے جو قوموں کی تعبیر کے سلسلے میں میں نے پیش کیا ہے۔ کیا یہ امر ہمارے داخلی اختلافات میں نرمی پیدا کرنے میں معین و معاون نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک عظیم تر پاکستانی قوم کے تصور کو

اپنائیں جو تمام تر پاکستان کی حدود میں شامل نہیں ہے؟ اس میں مجھے نقصان تو نظر نہیں آتا، فائدے بہت سے نظر آتے ہیں جن میں سے سرفہرست یہ ہے کہ دو قوموں کے نظریے کا بنیادی تصور جو قائداعظمؒ نے پیش کیا تھا وہ مردہ نہیں ہوتا اور اس کی وجہ سے پاکستان میں علاقائی تعصبات میں کمی واقع ہونے کی امید بندھتی ہے۔

خیر یہ تجویز میری تقریر کا بنیادی نکتہ نہیں ہے۔ اس لئے میں ان مظاہر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ہماری تاریخ کے رجحانِ عظیم یعنی بقائے انفرادیت کی خواہش کو مستحکم کر سکتے ہیں۔ اس میں میرے نزدیک ہر سطح پر طلبہ و عوام میں یکساں طور پر اس تاریخی حقیقت کو دہرانا چاہیے کہ ہم نے ہمیشہ اپنی بقا کے لیے متواتر ایسی کوششیں کی ہیں جو ہماری ملی حیات کی ضامن رہی ہیں اور ان کی افادیت کم نہیں ہوئی ہے بلکہ اب زیادہ ہو گئی ہے۔ اس خواہشِ بقا ہی کا کرشمہ قیام پاکستان تھا اور اب پاکستان اس کا مستقل بالذات مظہر ہے۔ اگر اس جذبۂ انفرادیت کو کمزور پڑنے دیا گیا تو ہمارا ملی وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ یہ سمجھنا سخت غلط ہوگا کہ تاریخ ایک نقطہ پر آکر ٹھہر گئی اور اب ان تاریخی تقاضوں کی ہمیں ضرورت نہیں ہے جو ہمارے ملک کے قیام کا سبب بنے۔ ان ہی تقاضوں کے فہم کا نام نظریۂ پاکستان ہے۔ تاریخی طور پر ان تقاضوں کے محرکات یہ رہے ہیں کہ ہم اپنے وجود کو لسانی، علاقائی اور نسلی بنیادوں پر قائم نہیں سمجھتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم میں کسی زمانے میں اتحاد پیدا نہ ہوتا۔ ہم ابتدا سے اب تک مختلف زبانیں بولتے رہے ہیں اور آئندہ بھی بولتے رہیں گے۔ نسلی طور پر ہم میں ایسے گروہ بھی ہیں جو خالصتاً ہندی الاصل ہیں اور اسلام کی دولت سے

مالامال ہو کر اور اس برعظیم کی اسلامی ثقافت کی تعمیر میں برابر کے شریک ہو کر اور اسے اختیار کر کے اس قوم کا جزو بنے ہیں جو صدیوں مسلمانانِ ہند کے نام سے موسوم رہی اور اب پاکستانی کہلاتی ہے۔ اس قوم میں وہ بھی شامل ہیں جو عرب، ایران، توران یا دوسرے علاقوں سے آکر آباد ہوتے اور یہاں آنے سے پہلے مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے تھے اور یہاں آکر اپنے حسب نسب کی نگرانی کے باوجود اس قوم کا جزو لاینفک بن گئے۔ وہ نہ ایرانی رہے، نہ تورانی، نہ عرب، بلکہ ہندوستانی مسلمان کہلائے اور اب پاکستانی کہلاتے ہیں۔

اب اگر اس قوم کی انفرادیت نہ ماضی میں نسلی و لسانی و علاقائی بنیادوں پر قائم تھی اور نہ اب ہو سکتی ہے تو پھر اس کی قومیت کی بنیادیں اور کیا ہو سکتی ہیں؟ اس سوال کی ضرورت نہ ترکوں کو در پیش ہو سکتی ہے، نہ ایرانیوں کو، نہ انگریزوں کو، نہ اور بہت سی قوموں کو، اس لئے کہ ان میں نسلی، لسانی اور علاقائی یگانگت موجود ہے لیکن ہم میں چونکہ یہ مادی یگانگت نہیں ہے اس لئے اس جذبہ انفرادیت کا تجزیہ ضروری ہے، جو ہمارے قومی جذبے کی نشوونما کا سبب اول رہا اور اب بھی اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اگر غور کیا جائے تو بات ہمیں آکر ٹکتی ہے کہ اس جذبے کا رکنِ رکین ہمیشہ اسلام رہا اور اب بھی اسلام ہی ہو سکتا ہے۔ اس برعظیم میں بہت سی قومیں آکر آباد ہوئیں، وہ سب اپنی انفرادیت قائم نہ رکھ سکیں لیکن ہم نے چونکہ اسلام کو اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھا، اس لئے اسے حرزِ جان بنایا اور اس کے ساتھ اپنی عقیدت اور محبت کو ہم نے کسی حالت میں کم نہ ہونے دیا۔ اسی جوشِ عقیدت نے ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رکھا اور اب بھی اسی میں یہ صلاحیت ہے کہ ہمیں زندہ رکھے۔ اسے چھوڑنے کے

بعد ہم میں اور اس برعظیم کے دوسرے گروہوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اسلام سے محبت نے ہی ہم پر اپنی انفرادیت کی اہمیت واضح کر دی، اس لئے کہ انفرادیت کی پاسبانی کے بغیر ہم مسلمان نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم نے اپنی منفرد خصوصیات میں کچھ اضطراری طور پر اور کچھ دیدہ و دانستہ ایسی بعض اور چیزیں شامل کر لیں جو ایک مددگار لیکن اہم ثقافت کی تعمیر میں ہماری مدد ہوئیں اور پھر ہم یہ دعویٰ کر سکے کہ ہم ایک منفرد دین اور منفرد ثقافت کے مالک ہیں۔ کچھ تو ان میں سے ہمارے آباؤ اجداد کے اس طبقہ کے اصلی اوطان کی روایات تھیں جو وہ اپنے ساتھ یہاں لائے اور کچھ اس برعظیم ہی میں ہم نے تخلیق کیں۔ ان میں موخرالذکر کی ہمیشہ ضمنی حیثیت رہی، اس لئے کہ ہم نے اپنی انفرادیت کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ ہم باقی اسلامی دنیا کی ثقافت سے اپنا رشتہ نہ ٹوٹنے دیں چنانچہ فارسی زبان کے فروغ کے ساتھ ہم نے فارسی شاعری کے اوزان و اسالیب کو اختیار کیا اور تمام تر استعارات و تشبیہات و خیالات کو وہیں سے اخذ کیا۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب ماحول ناسازگار ہو تو بقائے انفرادیت کے لئے شعوری تدابیر اختیار کرنی لازمی ہوتی ہیں اور غیر مانوس اثرات سے سمِ قاتل کی طرح پرہیز کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ اپنی ثقافت کمزور پڑ جاتی ہے، اپنا عقیدہ ضعیف ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ ایک منفرد ملت کی حیثیت سے زندگی کی خواہش ختم ہو جاتی ہے۔ ہم نے پاکستان کے قیام سے قبل اس پرہیز کو جاری رکھا تو پاکستان بنا لیا۔ اب آپ خود فیصلہ کیجئے کہ اس وقت جو ہمیں ثقافتی بدہضمی کا مرض لاحق ہوا ہے، وہ کن بدپرہیزیوں کا نتیجہ ہے۔ کسی ملک کی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے دفاعی سرحدی

چوکیوں پر تو پہرے بٹھانے ہی پڑتے ہیں، لیکن نظریاتی سرحدوں کی حفاظت بھی اتنی ہی ضروری ہوتی ہے۔ آج ہم نے ان سرحدوں پر نہ صرف یہ کہ خبرداری کو خیرباد کہہ دیا ہے بلکہ دشمنوں کی یلغار میں خود بھی شریک ہو گئے ہیں۔

آپ نظریۂ پاکستان کے سیاسی پہلو پر اگر متوجہ ہوں تو سب میں بڑی حقیقت یہ نظر آئے گی کہ ہم ایک ایسے برعظیم میں رہتے ہیں جسے جغرافیہ نے بعض واضح حدود عطا کی ہیں۔ اس کے شمال میں سر بفلک پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو آسانی سے آمد و رفت کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں ایسے درے موجود ہیں جو ایک آہنی دیوار میں دروازوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اگر ان راستوں سے عدم مزاحمت کی صورت میں افراد یا گروہ داخل ہونا چاہیں تو ہو سکتے ہیں، لیکن جب یہ نقل و حرکت ایسی ہو جائے کہ اندر رہنے والوں کی معاش پر اس کا اثر پڑے تو مزاحمت ہو سکتی ہے اور پھر وہی اندر آ سکتے ہیں جن میں مزاحمت کرنے والوں سے زیادہ قوت ہو۔ چونکہ اندر رہنے والوں کو یہ اندیشہ ہمیشہ لگا رہتا ہے کہ باہر سے حملہ ہو سکتا ہے، اس لئے وہ اپنی قوت بڑھاتے رہتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان دروازوں کو ایسا مستحکم کر دیں کہ کوئی معاند اندر نہ آ سکے۔ اس حالت میں اس برعظیم کو ایک قلعہ بنایا جا سکتا ہے اور حملے کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کو ہم سے سب سے بڑا شکوہ یہ ہے کہ ہم نے ان دروازوں پر قبضہ کر لیا ہے اور شمال و مغرب کی دوسری طرف ایک وسیع دنیا ہے جس میں مسلمان آباد ہیں، جو ہر وقت خطرہ بن سکتے ہیں اور ہمارے ساتھ یگانگت کی بنا پر وہ ہمیں ملا کر پھر پرانی تاریخ دہرا سکتے ہیں۔ اس وقت یہ اندیشہ چنداں وقعت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ افغانستان

کا ملک زیادہ قوت کا مالک نہیں ہے اور اس سے پرے جو مسلمان آباد ہیں، وہ خود محکوم ہیں اور اپنے آپ کو آزاد کرانے کی بھی سکت نہیں رکھتے لیکن معلوم نہیں کہ دنیا کی بساط سیاست کب الٹے اور کیوں کر الٹے اور قوت کا توازن بگڑ کر پھر کیسے بنے، ہمارے بچپن میں کون کہہ سکتا تھا کہ پاکستان کا ملک بنے گا اور ہندوستان ایک عظیم قوت بننے کے خواب دیکھے گا۔ اس زمانے کے اگر ایک فوجی معاہدے کو دیکھا جائے تو وہ موجودہ ضروریات سے زیادہ دور کے طوفانوں کا سدباب بھی چاہتا ہے۔ اس لئے کہ دونوں معاہدوں کو یہ پسند نہیں ہو سکتا کہ پاکستان و افغانستان کی سرحدوں سے آگے جو دنیا اس وقت زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، وہ انگڑائی لے کر دنیا کی بساط سیاست بدل دے اور افغانستان و پاکستان کے ساتھ اتحاد کر کے اس علاقے کی دوسری دولتوں سے زیادہ مضبوط ہو جائے۔ بہرحال اس کا امکان ہے کہ اگر پاکستان کو ختم کر دیا جائے تو ہندوستان پھر برعظیم کے دروازے مقفل کر دے اور وہ قوم جس نے پاکستان بنایا ہے پھر سے اسیر ہو جائے اور اسی طرح محکوم ہو کر رہے جو افغانستان و ایران کے شمال میں مسلمان آبادی کا مقسوم ہے۔ ایسا کرنے کے لئے پاکستان کو کمزور کرنا نہایت ضروری ہے اور کمزور کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کے اندرونی اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا جائے، چنانچہ ایک عرصے کی جدوجہد اور سازش کے بعد بنگلہ دیش کے بھوت کو کھڑا کر دیا گیا اور اسے پھر بوتل میں بند کرنے کے لئے جس کوشش کی ضرورت ہے، اس سے بہت سے تعمیری کام انجام پا سکتے تھے۔ بنگلہ دیش میں پہلے دن سے دو محاذوں پر کام کیا گیا، پہلے تو ثقافت کے رشتے کو کمزور کیا گیا۔ نہ صرف یہ کہ بنگلہ زبان کے مسئلے کو اس طریقے اور اس تخریبی جوش کے ساتھ پیش کیا گیا کہ پاکستان اس دن

سے آج تک لسانی بحران میں مبتلا ہے اور اس کا اختتام قریب نظر نہیں آتا۔ پھر بنگلہ زبان کے اندر بھی ہندی سے زیادہ سنسکرت بھری گئی۔ پہلے تو انجمن، مجلس جیسے فارسی، عربی کے مشترک الفاظ مسلمانی بنگلہ میں نظر بھی آجاتے تھے مگر اب اسے "پوتر" کرنے کو جو مہم چلی تو وہ الفاظ کھود کھود کر نکالے گئے کہ بنگلہ کا کسی پاکستانی کی زبان سے رشتہ جڑا نہ رہ جائے۔ جب ثقافتی علائق کو ختم کر لیا گیا تو پھر اسلام سے بیزاری کا سبق ایسا پڑھایا گیا کہ نوجوانوں میں مسلمان ایک چھوٹی سی اقلیت بن کر رہ گئے۔ اب اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ مغربی پاکستان ان حربوں سے آزاد ہے تو وہ یقیناً حد درجہ بے خبر ہے۔

بات آئی ہے تو کہنی پڑتی ہے کہ آپ مغربی پاکستان کی علیحدگی پسند علاقائی تحریکوں کا جائزہ لیں تو ان کے بانی مبانی زیادہ تر وہی افراد نظر آئیں گے جن کی ہم عقیدہ قوم نے افغانستان کے شمال میں رہنے والے دیو کو زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ اگر یہ شخص پاکستان کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ان علاقوں کا کیا ہو گا؟ اس کا دارومدار اس امر پر موقوف ہے کہ پاکستان کے انہدام کے بعد کس کی بن پڑتی ہے۔ اگر ہندو شاہی کامیاب ہوئی تو یہ علاقے ہندوستان کے صوبے بن جائیں گے. انہیں تو فائدہ نہیں ہو گا۔ لیکن توڑنے والوں کے ہم عقیدہ کم از کم اطمینان کا سانس لے سکیں گے کہ اب اس کا امکان نہیں رہا کہ مسلم نشاۃ ثانیہ کا طوفان جنوب سے اٹھ کر ان کے محکوم دیو کو کسی جدوجہد پر آمادہ کر دے اور اگر انہیں اسلام ترک کرنے اور ان کا عقیدہ قبول کرنے کے صلے میں نام نہاد آزادی مل بھی گئی اور ہر چھوٹے صوبے اور ہر بڑے صوبے کے اجزا کی جداگانہ اشتراکی جمہوریت بنی تو پھر دعلی الاعلان

یا خفیہ طور پر کسی زبردست اتحاد شوروی سے منسلک ہوں گی اور یہاں کی مسلمان آبادی بھی اسی مقید دیو کا حصہ بن جائے گی، جس کی بیداری سے ہندوستان اور اس کے حلیف خائف ہیں، بہر حال پاکستان سے تو ہندوستان کے لیے یہ صورت بھی بہتر ہو گی۔ رہا یہ کہ ہندوستان کب تک اپنی موجودہ حیثیت قائم رکھ سکے گا تو یہ اہم سوال ہے۔ اگر کوئی قوم فرد فرد بن کر دوسروں میں ضم ہو جائے یا گروہوں اور ریاستوں میں بٹ کر ادنیٰ حلیفوں کی حیثیت سے غلام بنے تو وہ قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر کوئی اس خیال سے اختلاف کرے تو وہ اس امر کی نشاندہی کرے کہ آج ملک ترکستان کا وجود کہاں ہے؟ وہ قوم جو عرصہ تک ایک سالم وجود کی مالک تھی، جس نے اپنی کانگریسوں اور تحریکات میں ایک بن کر جینے کا عزم کیا تھا، اسے اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ متحد ہو کر زندہ رہے۔ اس لئے کہ وہ متحد ہو کر اپنے عقائد، اپنے دین، اپنی ثقافت، اپنے نظریۂ حیات کی حفاظت کر سکتی تھی، اب وہ منتشر اور بے بس ہے۔ یہ حقائق تلخ ہیں اور ان کا ذکر ہمارے بعض ہم وطنوں کو بھی ناگوار گزرے گا۔ لیکن یہ امکانات ہماری نظر کے سامنے رہنے چاہئیں اور میرے خیال کے مخالفوں میں بھی اتنی رواداری ہونی چاہئیے کہ انہیں بیان کرنے دیں اور ان خدشات کے اگر اطمینان بخش جواب ہیں تو وہ ہمارے اطمینان کے لئے پیش کریں۔

سیاست کا سب سے بڑا پہلو یہی ہے کہ پاکستان کا بساطِ عالم پر کیا مقام ہے اور اس کی قسمت سے کسے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس وقت چین اور روس کے مفاد میں تصادم ہے۔ جب تک یہ تصادم ہے انہیں کسی قدر اطمینان ہو سکتا ہے لیکن کیا اس کے دوام کی کوئی ضمانت ہو سکتی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ داخلی اور خارجی امور میں

اسلام کی حبلِ متین کو مضبوط پکڑنے سے ہی داخلی انتشار اور خارجی خطرات سے نجات مل سکتی ہے۔

داخلی طور پر پاکستان کی سیاست اس وقت اصلاح پذیر ہو سکتی ہے، جب یہاں مقاصد کے متعلق ایک اتفاق رائے پیدا ہو۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں کسی معاملے پر اتفاق رائے پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو وہ عارضی ثابت ہوتا ہے۔ کتنے ہی فیصلے ہوتے جو اس وقت پائیدار معلوم ہوتے تھے۔ لیکن جاری خود غرضیوں اور افراتفری کی عادت نے انہیں بدل دیا۔ بہرحال اب تو قومی زندگی کے بنیادی اصول پر بھی اتفاق رائے نصیب نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ اب اسلام بھی ایک نزاعی مسئلہ بن گیا ہے۔ ملک میں تین گروہ ہیں، ایک تو اسلام کا دلدادہ ہے اور اسے حرزِ جان بنانا چاہتا ہے اور اس کو قومی زندگی کی بنیاد تصور کرتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اپنے نظریات کی عمارت کسی اور فلسفہ کی بنیاد پر قائم کرتا ہے یہ فلسفہ دین و مذہب کو عوام کے نشے کا مترادف خیال کرتا ہے اور اس لئے اس سے بیر رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اگر کسی طرح عوام و خواص کے دل سے اسلام محو ہو جائے تو پھر سرخ انقلاب لانے میں انتہائی سہولت پیدا ہو جائے گی اور بات بھی یہی ہے۔ ہمارے دلوں میں دو متضاد عقیدے بہ یک وقت حکمران نہیں رہ سکتے اس لئے ان میں یا تو اسلام رہے گا یا اس کا متضاد عقیدہ۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو انفرادی زندگی کو اسلام کے ضابطۂ اخلاق کی پابندیوں سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ کچھ تو اس خیال میں اس وجہ سے کشش ہے کہ اس سے عیش و عشرت کے بہت سے ایسے باب کھل جاتے ہیں جن پر اس وقت کسی حد تک رائے عامہ کا محتسب دربان بنا بیٹھا ہے اور کچھ

افراد مغرب کی ہر ادا کو ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں، ان کی آنکھیں مغرب کی مادی طاقت اور صنعتی ترقی سے خیرہ ہیں اور خیرگی بھی اس بلا کی ہے کہ چمک کی چکاچوند میں انہیں کوئی سیاہ داغ بھی نظر نہیں آتا۔ اسلامی نظریہ حیات کو ترک کرنے کے بعد یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ساری قوم بالخصوص نوجوانوں کے دماغوں میں ایک خلا رکھا جائے۔ اس لئے کہ فطرت اگر مادی خلا ناپسند کرتی ہے تو نظریاتی خلا تو اسے اس سے بھی زیادہ ناگوار ہے۔ اب اسلام کو چھوڑ کر اگر ہم اشتراکیت کو قبول کر لیں تو سب سے پہلے تو ہمیں پاکستان کے وجود سے ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔ اس لئے کہ اشتراکی فلسفہ ملت میں پاکستان کو کوئی جگہ نہیں مل سکتی البتہ چھوٹے چھوٹے لسانی گروہوں کو ایک شورادی جمہوریت کا مقام مل سکتا ہے اور پھر ان کا وفاق بھی بن سکتا ہے۔ لیکن وہ وفاق پاکستان کی شکل میں کس منطق کے مطابق بنے گا؟ اگر ہندوستان بھی اشتراکیت قبول کرے اور اس میں چھوٹی چھوٹی شورادی جمہوریتیں بن جائیں تو ممکن ہے کہ موجودہ پاکستان کی لسانی جمہوریتیں ہندوستان کے وفاق میں شامل ہو جائیں یا پھر ان کو کسی اور زیادہ مضبوط وفاق کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ بہرحال وفاق بنے یا ایک فوجی اتحاد میں منسلک ہو کر یہ اپنی بقا کی ضمانت تلاش کریں، نتیجہ وہی ہوگا۔ چھوٹے بڑے کا وفاق یا فوجی اتحاد ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ نہ تاجیکستان دم مار سکتا ہے نہ چیکوسلواکیہ اس سے ڈگمگا سکتا ہے۔

اس طرزِ استدلال کے خلاف پروپیگنڈا یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی حمایت مضمر ہے لیکن اس بات کو بھلا دیا جاتا ہے کہ اسلام خود ان دونوں نظاموں کا طرف دار نہیں ہے۔ وہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کو توڑ کر

معاشی انصاف کا خواہاں ہے۔ معاشی انصاف کے اصول میں بتدریج تفصیلات کا رنگ بھرا جا سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ تفصیلات بدلتے ہوئے زمانے کے مطابق توسیعِ معیشت کے مدارج اور اصل اصول کے طریقہ ہائے اطلاق کی ماتحت ہوں گی۔ جہاں تک مغرب کی اندھی تقلید والوں کا تعلق ہے تو ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ زندگی تن آسانی کا نام نہیں ہے کہ خواہ مخواہ اسلام کے ضابطۂ اخلاق کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔ کوئی شخص خدارا یہ بتائے کہ کیا مغرب کی ترقی کا انحصار شراب نوشی اور مرد اور عورت کے بیجا اختلاط پر ہے۔ اس سے کسے اختلاف کی گنجائش ہے کہ اسلامی ممالک میں سائنس اور علوم کی وہ تمام دریافتیں منتقل کی جائیں اور ان کا ایسا رواج ہو کہ اسلامی دنیا میں از سرِ نو فطرت کے رازہائے سربستہ کے انکشاف کی جستجو عام ہو جائے تاکہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے، لیکن اس میں ترکِ اسلام کے جواز کا کونسا پہلو نکلتا ہے؟ کیا مشین اپنے چلانے والے سے یہ سوال کرے گی کہ شومئی قسمت سے تو مسلمان تو نہیں ہے؟ یا طبعیات و کیمیا کے اعمال کوئی کالے جادو کی رسمیں ہیں، جن میں شیطان کی عبودیت شرطِ اول ہوتی ہے؟ ہمارے مغرب زدہ ہم وطن اس وجہ سے اسلام کے مخالف ہیں کہ مغرب اسلام کا پیرو نہیں ہے۔ اگر انہیں کوئی لمحہ فکریہ نصیب ہو تو وہ یہ تو غور کریں کہ اس وقت مغربی معاشرے میں انحطاط کے جو آثار بالکل سطح پر نمودار ہیں، ان کے اسباب کیا ہیں۔ یہ فوج در فوج نوجوان جو معاشرتی و معاشی ذمہ داریوں کو تج کر کاکل اور داڑھیاں بڑھائے پھٹے حالوں، جسموں پر میل کی تہیں جمائے اور کثافت سے بو کی لپٹیں اڑاتے ہوئے پسماندہ ممالک کے مفلوک الحال عوام سے بھیک مانگتے

پھرتے ہیں کس عروج کی نشاندہی کرتے ہیں؟ اب شراب سے تسکین نہ پانے والے دیگر مسکرات کے استعمال میں جو ڈوبتے چلے جاتے ہیں تو وہ کونسا آفتاب بن کر دوبارہ ابھریں گے؟ وہ معاشی و صنعتی ترقی اور فوجی برتری جس سے آپ کی نگاہیں خیرہ ہیں صدیوں کی محنت، جستجو اور احساسِ ذمہ داری کی پیداوار ہیں اور یہ انحطاط ضابطۂ اخلاق کے تنزل کا نتیجہ ہے۔ اب آپ اگر یہ تصور کرتے ہیں کہ اسلام محنت، جستجو اور ذمہ داری کا درس نہیں دیتا تو آپ نے اسلام سے شناسائی بھی پیدا نہیں کی، اسے سمجھنا تو درکنار۔ اور اگر آپ کے خیال میں مغرب کا تنزل ہی ترقی ہے تو پھر بحث فضول ہے۔

پاکستان کے قیام کا ایک اور سیاسی مقصد تھا جو قائداعظم کی تقریروں اور قرارداد مقاصد سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ یہاں کی حکومت جمہوری انداز کی ہونی چاہیے جس میں جمہوری اقدار پوری طرح پنپ سکیں۔ یہ ظاہر ہے کہ قیامِ جمہوریت کے لئے عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے ورنہ آمر رائے عامہ کے جن پر سوار ہو کر بھی نمودار ہو سکتا ہے اور وہ آمریت نہایت خطرناک ہوتی ہے جو کسی طرح اپنے اوپر قبولِ عام کی چھاپ لگوا لے۔ ہٹلر اور مسولینی اس صدی میں آمریت کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ اور دونوں عوامی تحریکوں کے ذریعہ سے منزلِ اقتدار پر پہنچے تھے اور پھر ان کے ہاتھوں سے جمہوریت کی جو درگت ہوئی اس سے تاریخ کا ہر ابجد خواں واقف ہے۔ جمہوریت جمہوری اقدار کی مقبولیت و استواری کے بغیر ایک عفریت بن سکتی ہے جو انسان کی تمام آزادی کو سلب کر کے اسے مجبوری اور غلامی کے آخری قعر میں گرا سکتی ہے۔ اسلام ہی فی الحقیقت ان اقدار کا حامی ہے جو جمہوریت کی ضامن ہیں۔ اسلام قانون کو افراد اور حکومتوں کے اقتدار سے بالاتر قرار دیتا ہے۔ اسلام انفرادی

حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ اسلام قانون کے اندر انفرادی رائے کی آزادی کو تسلیم کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک کسی شخص یا کسی جماعت کو خواہ اسے کتنا ہی قبول عام حاصل ہو، یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو محض اختلاف رائے کی وجہ سے ایذا پہنچائے یا ان کی جسمانی یا رائے کی آزادی پر پہرے بٹھائے۔ بالفاظ دیگر نظریۂ پاکستان اس کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ فرد کے حقوق پامال ہوں اور اسے ملت کے معاملات میں رائے دینے سے روکا جائے، بشرطیکہ وہ خود ملت کے وجود ہی کو ختم کرنے کے درپے نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص اس نظریے سے پناہ وصونت کا طالب ہے جس پر ملت کی بقا کا انحصار ہے تو پھر اسے اس نظریے کی حمایت بھی کرنی چاہیئے۔ ہر ملت کی صحت مندی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے معاشرے کو مریض نہ ہونے دے۔ معاشرے میں خرابیاں اس طرح پیدا ہوتی ہیں کہ وہ کسی نظریۂ حیات کا پابند نہ ہو اور اپنی خود غرضیوں یا تن آسانی کی وجہ سے ضابطۂ اخلاق کو پامال کرے۔ ادنیٰ تامل سے ظاہر ہو جائے گا کہ اس وقت ہمارے معاشرے میں جتنی خرابیاں ہیں، وہ سب اسلام سے علی الاعلان یا خفیہ روگردانی کے سبب پیدا ہوتی ہیں۔ اب کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ ان اشخاص کے علاوہ جو اسلام کو طعن و تشنیع کا ہدف بناتے ہیں اور جو اس کی تعلیمات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے، ایسے افراد کی کثرت ہے جو اسلام کا نام تو لیتے ہیں لیکن جہاں ان کی خود غرضی اسلام کے ضابطۂ اخلاق سے متصادم ہوتی ہے، وہاں وہ اپنی غرض کے لئے خواہ اس کے تقاضے معاشرے کے حق میں زہر ہلاہل ہی کا حکم رکھتے ہوں، معاشرے کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے سے باز نہیں آتے۔

گلہ جفائے وفا نما جو حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

اب یہ ظاہر ہے کہ جب افراد اپنی خود غرضی کو کسی قانون کا پابند نہ کریں اور معاشرے میں ان کی طرف سے ایسی رواداری برتی جائے کہ بڑے سے بڑے مجرم کو بھی ہر مجلس میں سر آنکھوں پر بٹھایا جائے، نہ قانون ان کی سرزنش کرے، نہ معاشرہ ان سے نفرت، تو پھر بہتری کی امید کیوں کر پیدا ہو۔ صحیح طریقہ تو یہی ہے کہ اس معاشرے کو خشیتِ الٰہی اور مسئولیت کا درس پھر پڑھایا جائے اور خود غرضی اور نفس پرستی کی کھلی چھوٹ کی خرابیاں کھول کھول کر بیان کی جائیں تاکہ کچھ انفعال پیدا ہو اور یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب اسلام کو زبانی جمع خرچ کے ذریعے سے نہیں بلکہ اعمال کا حکم بنا کر دلوں میں اتارا جائے، ہمارے معاشرے کی بے راہ روی اب اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی اور سبب نہ بھی ہو تو بھی صرف بے اصولی ہی پاکستان کو ختم کر سکتی ہے۔ اصول یوں ہی مرتب نہیں ہوتے، خود غرضیاں یوں ہی تلف نہیں ہوتیں بلکہ پہلے یہ متعین کرنا پڑتا ہے کہ انفرادی اور ملی زندگی کے مقاصد کیا ہیں۔ جب تک ان پر اتفاق رائے نہ ہو معاشرے کی بہبود و صحت سے وہ لگاؤ پیدا نہیں ہو سکتا جو انسان کو معاشرے کی صحت کے لئے اپنے فائدے کو قربان کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ نظریۂ پاکستان کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ ایک بامقصد ملت وجود میں آئے جو دنیا میں ترقی کرے اور آخرت میں سرخرو ہو۔ مسلمان اگر اس لئے آزادی چاہتا ہے کہ وہ اپنے معین آئین کے مطابق زندگی گزارنے کی سہولتیں مہیا کرے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کی درستی کی طرف متوجہ ہو اور اس باب میں ماحول معاشرے کا ہی دوسرا نام ہے

اگر یہ استدلال درست ہے تو تعلیم کے تمام وسائل اور ابلاغِ عامہ کے تمام اداروں کو معاشرے کی درستی اور ضابطۂ اخلاق کی استواری کے لئے استعمال کرنا ضروری ہے۔ ابلاغِ عامہ کے اداروں کی تو اس وقت یہ کیفیت ہے کہ مثبت طور پر تو انہیں اسلام کی تبلیغ کی کیا توفیق ہوگی، اگر منفی طور پر ہی یہ ایسے پروگرام نشر کرنے چھوڑ دیں جن سے اسلام اور پاکستان کی بیخ کنی ہوتی ہے تو بھی موجودہ حالات کے پیشِ نظر یہ نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوگی۔

معاشرہ، سیاست اور خود ملی زندگی کا اقدار سے بہت گہرا تعلق ہے۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ علی وجہ البصیرت ہے محض تعصب نہیں ہے کہ پاکستان بغیر اسلام کے قائم نہیں رہ سکتا۔ اس تقریر میں میں نے جو دلائل پیش خدمت کئے ہیں ان سے میرے اس موقف کی معقولیت کو شاید آپ کی نظر میں تھوڑے وقعت حاصل کرنے میں کچھ مدد ملے، لیکن اگر پاکستانی قوم مسلمان نہ ہوتی اور اسلام پاکستان کی اساس نہ ہوتا تو بھی ہر معاشرہ اور ہر ملت کو قانون کے علاوہ ایک ضابطۂ اخلاق مرتب کرنا پڑتا ہے جس کے بغیر اجتماعی زندگی میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ عروج و زوالِ ملل میں اخلاقی اقدار کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ جب یہ اقدار مرتب ہو کر کسی ملت کو امتیازی اوصاف سے مسلح کرتے ہیں تو وہ قوم آگے بڑھنا شروع کرتی ہے اور اپنی برتری سے دنیا میں ایک مقام حاصل کرتی ہے۔ جب تک اقدار سے یہ وابستگی قائم رہتی ہے وہ ملت کی ترقی کی ضامن اور زوال کے رجحانات کے خلاف سپر ثابت ہوتی ہے۔ لیکن جب اقدار کا احساس کمزور پڑنے لگتا ہے تو زوال کے قدم جمنے لگتے ہیں۔ ہر وہ قوم کی تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا کو اس سے جو کام لینا تھا وہ عروج کے زمانے میں، جب وہ

قوم ممیز اوصاف کی حامل تھی، اسے چکی اور جب وہ اوصاف ختم ہوگئے تو پھر زمانے نے اسے تاریخ کے ردی خانے میں ڈال دیا۔ اب یہ کیوں کر ممکن ہے کہ یہ تقدیرِ الٰہی بدل جائے کہ اقوام اپنی قابلیت اور خوبیوں کے باعث ہی منازلِ ترقی و تنزل طے کرتی ہیں۔ اقوام کو بگاڑنے والے وہ افراد ہوتے ہیں جو اجتماعی مفاد کو قربان کرکے بظاہر اکتسابِ زر یا حصولِ اقتدار میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ مگر ان کی کامیابی کی مثال یہی ہے کہ کوئی شخص کشتی کو الٹا کرکے اس پر سوار ہو اور یہ امید رکھے کہ وہ اس طرح منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا اس لئے کہ کشتی بھی ذرا دیر کے بعد ڈوبے گی اور وہ بھی اس کے ساتھ غرقاب ہوگا۔

اقدار کی ہمہ گیری اور اہمیت سے انکار کسی ذی ہوش کے لئے ناممکن ہے اس لئے کہ اقدار وجود میں آتی ہی اجتماعی زندگی کے تحفظ کے لئے ہیں، ان اقدار کا ملت کے عزائم و مقاصد اور عقائد سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کی اندھا دھند تقلید کرکے کامیاب نہیں ہوسکتی۔ نہ وہ اس کی اقدار کو اپنے ہاں مروج کرسکتی ہے اگر وہ اپنی انفرادیت کی بقا چاہتی ہے تو اسے ان عام اقدار کے علاوہ جو تمام بنی نوعِ انسان عقائد میں مشترک ہیں اپنی منفرد اقدار کو بروئے کار لانا پڑے گا ورنہ وہ کبھی کوئے فلاح و ترقی میں قدم نہیں رکھ سکے گی۔ پاکستانی قوم کی اعلیٰ اقدار اسلام کی محکم چٹان پر قائم ہیں اس لئے ان کے استحکام کے متعلق شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ شبہ تو اس بات پر ہے کہ ہمیں ان پر عمل کرنے کی توفیق ہوگی یا نہیں۔

بعض شرارت پسند یہ وسوسہ پیدا کرتے ہیں اور بہت سے سادہ دل اس میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ زمانے کے ساتھ اقدار بھی بدلتی ہیں۔ اگر زمانے کے ساتھ اس

حقیقت میں کوئی فرق نہیں آیا کہ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں اور سائنس اور علوم کی کوئی ترقی یا کوئی سیاسی، معاشرتی یا معاشی ضرورت اسے بدلنے میں کامیاب نہیں ہوتی تو کیا زمانہ اب یہ درس دے کر انسانی اجتماعی زندگی کا کفیل ہو سکتا ہے کہ سچ بولنا، وعدہ پورا کرنا، ایمانداری، ذاتی اغراض پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دینا، قتل سے اجتناب، عصمت، فیاضی، دوسروں کے درد میں شریک ہونا، دوسروں کے حقوق میں دست اندازی سے بچنا، اب افعال شنیعہ میں داخل ہو گئے یا یہ کہ کم از کم ان کی افادیت جاتی رہی؟ یہ تو درست ہے کہ زمانے کے بدلنے سے اقدار کے طریقۂ اطلاق یا مواقع و مقامات میں فرق آ سکتا ہے۔ لیکن اقدار اگر واقعی ارفع ہیں تو وہ کیوں کر فرسودہ ہو سکتی ہیں؟ یہ تو ممکن تھا کہ عام افلاس کو دور کرنے کا یہ طریقہ فرسودہ ہو گیا کہ انفرادی خیرات کے طریقے کو جاری رکھا جائے، لیکن مجرد فلاحی کاموں کی افادیت کیوں کر معرض خطر میں پڑ گئی۔ اس قسم کے وسوسے کہ ہر اچھے کام کو یہ کہہ کر ٹال دینا کہ اب زمانہ بدل گیا یا دنیا کا کام ایمانداری اور اقدار کی پابندی سے نہیں چلتا عین شرارت یا سادہ لوحی اور خام خیالی کی انتہا ہے۔

جناب صدر و خواتین و حضرات! اس گفتگو کا سلسلہ بہت طویل ہو گیا۔ میں اس سمع خراشی کے لئے معذرت خواہ ہوں اور صمیم قلب سے ممنون ہوں کہ آپ نے اسے صبر و سکون کے ساتھ شرف سماعت بخشا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مقالہ پڑھ رہے ہیں

نظریۂ اسلام

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے، جسے قائد اعظم نے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کی حیثیت سے قائم کیا تھا، تاکہ مسلمان وہاں اسلامی اصولوں کے مطابق آزادی کی زندگی بسر کر سکیں۔ پاکستان جن اغراض و مقاصد سے قائم ہوا تھا، اسے "نظریۂ پاکستان" کہتے ہیں اور چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اس لیے "نظریۂ پاکستان" درحقیقت "نظریۂ اسلام" ہی کی بنیاد پہ استوار ہے اور یہ دونوں اصطلاحیں عملی طور پر ایک دوسرے کی مترادف ہیں۔ لہٰذا یہ امر بیحد ضروری ہے کہ مملکت پاکستان کے تعلیم یافتہ رہنماؤں کے ذہنوں میں اسلامی اصول اور اسلامی نظریات کا ایک واضح تصور موجود ہو۔

مقالہ ہذا میں اسلامی اصولوں اور تعلیمات کو حتی الوسع اختصار لیکن وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلام چونکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور مسائلِ الٰہیات اور اصولِ اخلاق کے علاوہ ہماری سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی زندگی میں بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے، اس لیے میں نے اپنے مفہوم و مطلب کی وضاحت کے لیے اس مقالہ کو چند فصلوں میں تقسیم کر دیا ہے اور یہ تقسیم زندگی کے مختلف شعبوں کے اعتبار سے ہے اور یہ ساری بحث کتاب اللہ اور

سنت نبوی پر مبنی ہے۔

اسلامی عقائد

(الف) **توحید باری تعالیٰ** - دینی عقائد کے سلسلہ میں اسلام ایک خدائے واحد کے وجود کو تسلیم کرتا ہے، جو تمام کائنات کا خالق ہے اور اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ توحید کا یہ اسلامی عقیدہ زرتشتیوں کی ثنویت اور عیسائیوں کی تثلیث اور بت پرست ہندوؤں کے بے شمار دیوی دیوتاؤں کی قطعی طور پر نفی کرتا ہے۔ اسلامی تعلیم کے مطابق خدا اپنی ذات اور صفات میں یگانہ اور لاثانی ہے اور اس کی یکتائی میں کسی شریک یا قرابت دار کی گنجائش نہیں ہے۔ خدا کی قدرت کاملہ اور اس کی بزرگی و عظمت کے اسلامی تصور کو آیت الکرسی میں کس خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ج اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ج لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ط لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ج وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ج وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا ج وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۝

(سوائے اللہ کے اور کوئی خدا نہیں ہے، وہ زندہ ہے اور قائم بالذات ہے۔ اس کو نہ تو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے پاس کسی کی سفارش کرے۔ وہ

جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے ، سوائے اس چیز کے جو وہ چاہے - اس کی سلطنت آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے اور ان کی نگہبانی اس پر گراں نہیں ہے اور وہ بلند مرتبہ اور بزرگ ہے)

خدا تعالیٰ خالق ہے ، قادرِ مطلق ہے ، منتقم ہے ، سریع الحساب ہے ، لیکن ان پُرشکوہ اور پُرجلال صفات کے ساتھ قرآن پاک نے اس کی رحمت اور فیاضی پر بھی زور دیا ہے اور رحمٰن اور رحیم بتایا ہے ، جو سچے دل سے توبہ کرنے والے کی توبہ کو قبول کرتا ہے -

توحید کے اسلامی عقیدے کا ایک منطقی نتیجہ یہ ہے کہ صرف خدا کی ذات ہماری عبادت گزاری اور نیاز مندی کی سزاوار ہے اور اسلامی طریقِ عبادت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان عبادت گزار اپنے پروردگار کے حضور میں کھڑا ہوتا ہے تو اس کا اپنے معبود کے ساتھ براہِ راست تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اس کو کسی وسیلہ یا واسطہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی - اسلام نے نماز با جماعت پر بھی بہت زور دیا ہے جس سے مسلمانوں میں اتفاق اور یکجہتی پیدا ہوتی ہے -

(ب) **رسالت انبیاء** - خدا کی وحدانیت کے بعد رسالت کا عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے - قرآن پاک کی رُو سے خداوند کریم اپنے احکام اپنے بندوں کو خاص پیغمبروں کے ذریعے سے پہنچاتا ہے جن کو عربی میں انبیا یا رُسُل کہتے ہیں - اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر وقتاً فوقتاً بھیجتا رہا ہے - خدا کا آخری پیغام یعنی اسلام اس کے برگزیدہ رسول حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت

سے آیا ، جو تمام اہلِ عالم کی رہنمائی کے لیے بھیجے گئے تھے - رسُولِ اکرمؐ کامل ترین انسان تھے ، جن کی ذات گرامی ہمارے لیے بہترین نمونہ پیش کرتی ہے -

(ج) **آخرت کا تصور** - اسلامی تعلیم کے مطابق انسان اپنے تمام اعمال کے لیے جوابدہ ہے ، خواہ وہ اعمال کتنے ہی معمولی نظر آئیں - قرآن پاک میں آیا ہے کہ

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

یعنی جو شخص ایک ذرہ بھر بھی نیکی کرے گا اس کا صلہ پائے گا اور جو شخص ایک ذرہ بھر بھی بدی کرے گا وہ اس کی سزا بھگتے گا - انسان کی ذاتی اور انفرادی ذمہ داری کا یہ عقیدہ اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے اور انسان کے کردار پر لامحالہ اثر انداز ہوتا ہے - اہلِ اسلام کے ہاں یوم آخرت کا جو تصور ہے وہ اسی انسانی ذمہ داری کے احساس پر مبنی ہے - قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ ایک دن آخرکار یوم الحساب آنے والا ہے ، جب لوگوں کو ان کے اچھے اور بُرے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا -

(د) **حج بیت اللہ** کو خدا تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ گہرا تعلق ہے ، اسی لیے اسلام کے ارکان خمسہ میں شمار ہوتا ہے - ہر ذی استطاعت مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے کہ وہ اپنی عمر میں کم از کم ایک مرتبہ بیت اللہ کی زیارت کرے - بیت اللہ اہلِ اسلام کی عالمگیر برادری کا روحانی مرکز ہے ، اسی لیے حج بیت اللہ کو مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے - ہر سال ہزاروں لاکھوں مسلمان تمام اطرافِ عالم سے مکہ مکرمہ کا قصد کرتے ہیں اور خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں - حج کے موقع پر مسلمانوں کے دلوں میں اپنے قرون اولیٰ کی یادیں تازہ ہوتی ہیں اور وہ ایک نئے جوش اور ولولہ کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں - حج کیا ہے ؟ دنیا بھر کے مسلمانوں کا ایک بین الاقوامی

اجتماع ہے جس سے عالم اسلام کی وحدت اور مسلمانوں کی باہمی اخوت کا جذبہ بیدار رہتا ہے ۔

۲ — اسلامی اخلاق

انسانی ارتقا کی تاریخ میں ایک صاحبِ فکر کے سامنے یہ دلچسپ اور اہم سوال پیش آتا ہے کہ وہ اخلاقی اصول کیسے وضع ہوئے جن کا مقصد ہماری عملی زندگی کی رہنمائی ہے ۔ جہاں تک اہل اسلام کا تعلق ہے ۔ ایک سچے مسلمان کی زندگی ایک متعین ضابطۂ اخلاق کے ذریعے سے منضبط ہوتی ہے اور ان کے ہاں ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ سوسائٹی میں کسی فرد کی عزت و وقار کا دار و مدار اس کے محاسن اخلاق پر ہے نہ کہ اس کی دولت و ثروت پر ۔ امت کے ایک مفید اور فعّال فرد کی حیثیت سے ہر ایک مسلمان کے حقوق و فرائض معین ہیں ۔ لہٰذا ان فرائض کا ادا کرنا اس کے مذہبی واجبات میں داخل ہے ۔ اسی لیے اسلام میں ایمان اور صحیح عقیدہ کے ساتھ ساتھ اعمال حسنہ کی بہت تاکید کی گئی ہے ۔ چنانچہ کلام پاک میں آیا ہے ۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ
الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ
وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ
وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ
فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (سورہ بقرہ)

(نیکی اس بات پر منحصر نہیں ہے کہ تم اپنا رخ مشرق یا مغرب کی طرف پھیرو بلکہ نیکی اس شخص کی شمار ہوگی ، جو اللہ پر ایمان لایا اور یوم آخرت پر اور ملائکہ پر اور کتاب پر اور انبیاء پر اور جس نے اپنی رضامندی اور خوشی سے قرابت داروں کو مال دیا اور یتیموں اور مسکینوں کو اور مسافروں اور سوالیوں کو ، اور قیدیوں کو آزاد کرایا اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور جس نے اپنے عہد و پیمان کو پورا کیا اور دکھ سکھ میں صبر اختیار کیا اور میدان جنگ میں پامردی دکھائی ۔ یہی وہ لوگ ہیں جو صادق اور پرہیزگار کہلانے کے مستحق ہیں)

آیت بالا میں صدقہ و خیرات ، صبر و ثبات اور ایفاء عہد جیسے اوصاف کو ویسی ہی اہمیت دی گئی ہے جتنی ایمان اور عبادات کو ۔ ان باتوں کے علاوہ قرآن پاک نے والدین کی اطاعت پر بہت زور دیا ہے اور بعض مقامات میں اطاعتِ والدین کی تاکید اطاعتِ خداوندی کے ساتھ ساتھ آئی ہے ۔ اس کے علاوہ رسولِ مقبول (صلعم) کا ارشاد ہے کہ اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّهَاتِكُمْ یعنی جنت تمہاری ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے ،، ۔ اس حدیث نبوی سے ثابت ہے کہ اسلام میں والدہ کا درجہ کس قدر بلند رکھا گیا ہے ۔ مزید براں مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ یتیموں کی نگہداشت کریں اور مسلمانوں کے متخاصم گروہوں میں مصالحت کرائیں ، اپنے قرضوں کو ادا کریں اور خطاکاروں کی خطاؤں سے درگزر کریں ۔

قرآن حکیم کے بعض ایسے احکام ہیں ، جن کا اسلامی معاشرہ پر دائمی طور پر خوشگوار اثر پڑا ہے ، مثلاً کلام پاک میں شراب کی جو ممانعت آئی ہے وہ مسلمانوں کے لیے ایک رحمت ثابت ہوئی ہے اور وہ شراب کی تحریم سے بہت سی خرابیوں سے بچ گئے ہیں اور

جب کبھی انہوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی ہے انہیں ادبار و ذلت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

اسلام کا نظامِ معاشرت

(الف) **اسلامی اخوت** ۔ بنی نوع انسان مختلف قسم کے رشتوں میں منسلک ہیں چنانچہ بہت سی اقوام کی وحدت ان کے مشترک وطن پر استوار ہے اور لبا اوقات ایک مشترکہ زبان بھی اس وحدت کی تائید کرتی ہے لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی ملت کی بنیاد مشترک وطن یا مشترک نسل یا مشترکہ زبان پر نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیاد ایک مشترک مذہب پر قائم ہے اور مذہبی اشتراک کے مقابلہ میں وطن اور نسل کے باقی تمام رشتے مہمل اور بے معنی سمجھے جاتے ہیں۔ اہل اسلام کی باہمی اخوت اسی مشترکہ مذہب پر مبنی ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ جو برادرانہ تعلقات رکھتا ہے، قرآن پاک نے اسے خداوند کا خاص احسان قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں آیا ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۝ (اے ایماندارو، تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو اور خدا کے احسان کو یاد کرو جب تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن خدا نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے)۔

اس کے علاوہ قرآن پاک میں ایک اور مقام پر آیا ہے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ یعنی "تمام مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں"۔ اخوت کے اس تصور سے مسلمانوں کو باہمی ہمدردی کا سبق ملتا ہے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کی ترغیب ملتی ہے۔

(ب) **اسلامی مساوات** ۔ اخوتِ اسلامی کے تصور سے اسلامی معاشرہ کے تمام طبقات میں اسلام کی روح پیدا ہوتی ہے اور اس سے یہ اصول قائم ہوتا ہے کہ سب مسلمان آپس میں برابر ہیں، اس لیے ان سب کے حقوق بھی برابر ہیں۔ مسلمان خواہ کسی خاندان کا ہو یا کسی طبقہ اور قوم سے تعلق رکھتا ہو وہ بہرحال مسلمان ہے اور تمام حقوق میں دوسرے مسلمانوں کے برابر ہے۔ اسلامی مساوات کا مظاہرہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہوتا ہے، مثال کے طور پر مسجد کو لیجئے، جب نمازی شانہ بشانہ اپنے مالک کے حضور میں کھڑے ہوتے ہیں تو اس موقع پر ادنیٰ و اعلیٰ اور امیر و فقیر میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔

(ج) اسلامی معاشرے کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ نسلی امتیاز سے پاک ہے اور نسل و رنگ کے اختلاف پر کسی سے تعصب نہیں برتا جاتا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں میں ذات پات کی تمیز نہیں، کیونکہ رسول اکرم (صلعم) نے اس بارے میں بڑی حکمت سے کام لیا ہے۔ اگرچہ آپ عرب قوم سے تھے لیکن آپ نے عرب قوم کو دوسروں پر فضیلت نہیں دی۔ چنانچہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ دیا تھا اس کے دوران میں آپ نے فرمایا تھا۔ اَیُّهَا النَّاسُ، اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ، اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی۔

(اے لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ خدا کے

نزدیک تم میں سب سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا ترس ہے ۔ کسی عرب کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ ہی کسی عجمی کو کسی عربی پر فوقیت حاصل ہے اور اسی طرح کسی گورے کو کالے پر فضیلت نہیں ہے اور نہ ہی کسی کالے کو گورے پر برتری حاصل ہے مگر پرہیزگاری کے سبب سے)

مشہور برطانوی مورخ پروفیسر ٹائن بی (TOYNBEE) نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں نسل اور رنگ کا امتیاز نہیں ہے اور اس نے اس وصف کو ان کے محاسن میں شمار کیا ہے ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ " ہماری مغربی سوسائٹی اس وقت عیاں طور پر دو مہیب خطروں سے دوچار ہے : اول نسلی تعصب اور دوسرے شراب نوشی ۔ ان خرابیوں کے سدباب کے لیے ہم جو جدّ و جہد کر رہے ہیں ، اس میں شریعتِ اسلامی کا تحریمی حکم ہمارے لیے ممدّ و مددگار ثابت ہو سکتا ہے ۔ اسلام نے اخلاق کے میدان میں جو نمایاں کارنامے سرانجام دیئے ہیں ، ان میں ایک کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اسلامی معاشرہ میں نسلی امتیاز کو مٹا دیا ہے اور عہد حاضر میں اس اسلامی وصف کو عام کرنے کی سخت ضرورت ہے " ۔

(د) اسلام عورت کو معاشرہ میں ایک باعزت مقام دیتا ہے چنانچہ عورت کو مسلم سوسائٹی میں ایک آزاد ممبر ہونے کی حیثیت سے وہی حقوق اور سہولتیں حاصل ہیں ، جو مرد کو حاصل ہیں ۔ اس کو ذاتی ملکیت کا حق حاصل ہے اور وہ اپنے مال کو جس طرح مناسب سمجھے صَرف کر سکتی ہے ۔ بعض مغربی ملکوں میں دستور ہے کہ شادی کے بعد شوہر اپنی منکوحہ بیوی کی جائداد اور اس کے مال میں تصرّف کر سکتا ہے ، لیکن اسلامی شریعت شوہر کو ایسی اجازت نہیں دیتی ۔ کسی کے حبالۂ نکاح میں آنے کے

بعد عورت کے حقوق میں کسی طرح کی کمی نہیں آتی بلکہ اس کی عزت اور اس کے احترام میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ بدستور اپنے والدین کے ترکہ میں سے حصہ پانے کی حقدار ہوتی ہے ۔ چونکہ اسلامی معاشرہ میں مرد اور عورت کے حقوق مساوی ہیں اس لیے آج کل اکثر اسلامی ملکوں میں قومی مجالس کے لیے مردوں کے دوش بدوش عورتوں کو بھی ووٹ دینے کا حق حاصل ہے ۔

(ھ) ایک مشہور حدیث میں رسول مقبول کا یہ ارشاد منقول ہوا ہے کہ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ ۔ یعنی اسلامی معاشرہ میں راہبوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ اسلام مردوں اور عورتوں کو آخرت میں فلاح حاصل کرنے کے لیے ترکِ دنیا اور نفس کُشی کی ترغیب نہیں دیتا بلکہ اسلام کا اصول یہ ہے کہ اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ یعنی آخرت کی فلاح کے لیے ہم نے جو کچھ کرنا ہے ، اسی دنیا میں رہ کر اور اس کے کاروبار میں حصہ لے کر کرنا ہے ۔ خدا نے ہمیں اس دنیا میں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں ، اس کے بندوں کی خدمت کریں اور ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں ۔ تجرّد کی زندگی ایک غیر فطری چیز ہے ، اسی لیے جن مذاہب میں راہبوں اور راہبات کے لیے خانقاہیں قائم ہوئی ہیں ۔ تاریخ شاہد ہے کہ وہاں طرح طرح کی معاشرتی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں اسی لیے رسول خدا (صلعم) نے ارشاد فرمایا کہ اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي وَ مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي یعنی نکاح کرنا میری سنت ہے اور جس کسی نے میری سنت سے انحراف کیا وہ ہم مسلمانوں کی جماعت میں سے نہیں ہے

اسلام میں کسب حلال کی بڑی تاکید آئی ہے اور جو شخص اپنے پسینے کی کمائی سے روٹی کھاتا ہے ۔ وہ اس شخص سے ہزار درجہ بہتر ہے جو دوسروں کا دست نگر ہے

اور دوسروں کی محنت سے اپنا پیٹ پالتا ہے، اسی لیے رسول اکرم (صلعم) نے گداگری کو بہت ناپسند فرمایا ہے۔

(د) زکوٰۃ ۔ صدقہ وخیرات ایک ایسی نیکی ہے جس سے معاشرے کے نادار اور مفلوک الحال لوگوں کو قوت لایموت مل جاتی ہے اور ان کی سلامتی اور بقا کا سامان ہو جاتا ہے ۔ اسلام نے صدقہ وخیرات کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے زکوٰۃ کی صورت میں منظم کر دیا ہے اور اسے اسلام کے ارکانِ خمسہ میں شمار کیا ہے ۔ زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ ایک ذی استطاعت مسلمان اپنی کمائی کا ایک حصہ نیک مقاصد کے لیے دیتا ہے اور اس طرح سے اس کی کمائی کا باقی حصہ پاک ہو جاتا ہے اور اس کے طمانیت قلب کا موجب ہوتا ہے ۔ زکوٰۃ کی ادائیگی سے ایک مسلمان معاشرے کی مشترکہ ذمہ داریوں میں حصہ لیتا ہے ۔ پہلے وقتوں میں سرکاری عامل زکوٰۃ جمع کرتے تھے اور یہ زکوٰۃ قوم کے نادار افراد میں تقسیم کی جاتی تھی اور رفاہِ عامہ کے دیگر کاموں میں بھی صرف ہوتی تھی ۔

۴ ۔ سیاسی تصوّرات

(الف) مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں مشوریٰ (یعنی باہمی صلاح مشورہ) کے اصول کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ خداوندِ کریم نے اپنے کلام پاک میں مومنین کی صفت یوں بیان فرمائی ہے ۔ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ ۔ یعنی وہ لوگ جو اپنے پروردگار کا فرمان مانتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور ان کا دستور یہ ہے کہ وہ آپس میں صلاح مشورہ کرتے ہیں ۔ قرآن پاک

میں ایک اور مقام پر خدا تعالیٰ اپنے رسولؐ کو حکم دیتا ہے کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (سورہ آل عمران) یعنی اے رسول، ان سے یعنی اپنے اُمتیوں سے حکومت وسیاست کے معاملہ میں صلاح ومشورہ کر لیا کرو ۔" اس سے ظاہر ہے کہ ہر طرزِ حکومت (مثلاً پارلیمانی طرزِ حکومت) جو باہمی صلاح ومشورہ کے اصول پر مبنی ہو، اسلام کی رُوح کے مطابق ہے ۔

(ب) اہلِ اسلام مذہبی رواداری کے قائل ہیں کیونکہ قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔ یعنی مذہب کے معاملہ میں جبر اور زبردستی جائز نہیں ہے" چنانچہ اسلام غیر مسلموں کو پوری مذہبی آزادی بخشتا ہے ۔ ایک مسلمان سلطنت کے غیر مسلم باشندے ذمی کہلاتے تھے اور ایک ٹیکس ادا کرتے تھے جو جزیہ کہلاتا تھا اور اس کے بدلے میں اسلامی حکومت ان کے جان ومال کی حفاظت کرتی تھی ۔ عورتیں، بچے اور معذور لوگ جزیہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ تھے ۔

مذہبی رواداری ایک سنہری اصول ہے، جس پر مسلمان ہمیشہ مضبوطی کے ساتھ کاربند رہے ہیں ۔ انھوں نے دوسرے مذاہب والوں (یعنی یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں) کے ساتھ مذہب کے معاملہ میں ہمیشہ رواداری برتی ہے لیکن اس کے جواب میں ان مذاہب کے پیروؤں نے مسلمانوں کے ساتھ کبھی فراخدلی اور رواداری کا سلوک نہیں کیا، بلکہ اکثر اوقات تشدد سے کام لیا ہے لیکن اس مایوسی اور ناکامی کے باوجود مسلمان اس اصول کے پابند رہے ہیں جس اصول کو وہ صحیح اور عقل وانصاف کے قرین سمجھتے ہیں ۔

مذہبی رواداری کا جو اصول ہے، اس کی معقولیت اور افادیت کی ایک درخشاں

مثال ہمیں اندلس کی تاریخ میں ملتی ہے۔ عرب حکمرانوں نے وہاں کے عیسائیوں اور یہودیوں کو مکمل مذہبی آزادی دے رکھی تھی، جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ غیر مسلموں نے بھی ملک کی سیاسی، اقتصادی اور علمی زندگی میں پورا حصہ لیا اور اندلس ترقی اور خوشحالی کے ایک نئے دور میں داخل ہوا اور جلد ہی یورپ کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک قرار پایا۔ زراعت اور صنعت وحرفت نے فروغ پایا اور تجارت کا بازار گرم ہوا۔ علوم وفنون نے ایسی ترقی پائی کہ اندلس کی دانش گاہوں نے تمام یورپ میں قابلِ رشک شہرت پائی اور تمام اطرافِ یورپ سے طالبعلم جوق درجوق اندلس میں کھنچے چلے آئے، خصوصاً قرطبہ نے اپنے عالی شان دربارِ خلافت اور شہرۂ آفاق علما وفضلا کی بدولت خاص نام پیدا کیا لیکن افسوس صد افسوس کہ مسلمانوں کی حکومت کے ختم ہوتے ہی نئے عیسائی حکمرانوں نے مذہبی رواداری کی پالیسی کو ترک کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارا ملک جلد ہی قعرِ مذلّت میں گر گیا۔ ثمردار باغات اور لہلہاتے کھیت وحشت ناک ویرانے بن گئے اور روشن دماغ علما کی جگہ تاریک ذہن پادریوں نے لے لی اور مبارز طلب شہسواروں کی جگہ رہزنوں اور لٹیروں کی بن آئی۔ علم ودانش کی شمع بجھ گئی اور تمام ملک جہالت کی تاریکی میں ڈوب گیا۔

۵۔ مسلمانوں کی علمی زندگی

قرآن مجید میں علم کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے چنانچہ سورۂ الزمر میں آیا ہے هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ "کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ لوگ جو نہیں جانتے آپس میں برابر ہو سکتے ہیں" اسی سبب سے

اہلِ اسلام کو علوم وفنون کے ساتھ بڑا شغف رہا ہے اور انہوں نے علم حاصل کرنے میں بڑی جانفشانی دکھائی ہے اور جو لوگ علم کی جستجو میں سرگرم رہتے ہیں، اہلِ اسلام نے ان کی جستجو کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

رسولِ کریم (صلعم) کا ارشاد ہے کہ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ ۔ "یعنی علم کی جستجو ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے" اس کے علاوہ آپ نے فرمایا کہ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ بِالصِّیْنِ "یعنی علم کو طلب کرو خواہ وہ چین میں ہو"۔ ان ارشادات کی موجودگی میں یہ امر باعثِ تعجب نہیں کہ مسلمانوں کے دل ودماغ پر علم کی فضیلت کا تصور غالب رہا ہے اور انہوں نے اپنے آپ کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کی ہر امکانی کوشش کی ہے اور اسی لیے ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں علوم وفنون کا چرچا رہا ہے۔

الغرض معارف پروری اسلامی کلچر کا ایک نمایاں امتیاز رہا ہے۔ سلاطین وامرا نے علما وفضلا کی دریا دلی سے شاہانہ پیمانہ پر سرپرستی کی ہے اور عامۃ الناس نے بھی ان کو ہمیشہ ادب اور احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

اہلِ اسلام نے قرآن پاک سے نورِ ہدایت حاصل کیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے علومِ قدیمہ میں بھی کمال شوق کا اظہار کیا۔ اسلام کے قرونِ اول میں یونان، ایران اور ہند کے علوم کی بہت شہرت تھی، چنانچہ خلفاء بغداد نے یونان کے فلسفہ وحکمت کی طرف خاص توجہ کی اور ان کی شاہانہ سرپرستی میں بہت سے یونانی فلاسفہ اور سائنس دانوں کی کتابیں یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان تراجم سے گویا مسلمانوں کے سامنے نئے نئے خزانوں کے منہ کھل گئے اور وہ علم کی دولت

ملامال ہو گئے۔ سقراط کی حکمت، افلاطون اور ارسطو کا فلسفہ اور جالینوس کی طب، یہ سب علوم مسلمانوں کی دسترس میں آگئے۔

خلیفہ ہارون الرشید نے بغداد میں ایک علمی ادارہ "بیت الحکمت" کے نام سے قائم کیا اور تراجم کا جو ذخیرہ فراہم ہو چکا تھا، اسے وہاں جمع کیا۔ جنگوں کے دوران میں جو یونانی کتابیں مسلمانوں کے ہاتھ آئی تھیں وہ تمام بیت الحکمت میں داخل کی گئیں اور اس زمانے کا ایک مشہور مترجم یوحنا بن ماسویہ اس کا ناظم مقرر ہوا۔

اسی علمی تحریک کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں کے ہاں ایک نئی علمی بیداری پیدا ہوئی اور ان کے ہاں فارابی، ابن سینا اور ابن رشد جیسے فلسفی پیدا ہوئے اور البیرونی، محمد بن زکریا رازی اور ابن الہیثم جیسے سائنسدانوں نے ظہور کیا۔

تعلیم عامہ کے لیے عالم اسلام کے بہت سے شہروں میں مدارس قائم ہوئے۔ ان تعلیمی اداروں میں مدرسہ نظامیہ نے خاص شہرت پائی، جسے نظام الملک طوسی نے بغداد میں قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ چار سو سال تک علم و حکمت کی روشنی پھیلاتا رہا۔ اس دوران میں بہت سے جید علما مثلاً ابو اسحٰق شیرازی، امام غزالی اور خطیب بغدادی نے مسندِ درس کو زینت بخشی اور ان کے حلقۂ درس سے ہزاروں طلبہ مثلاً شیخ سعدی شیرازی دستارِ فضیلت پہن کر نکلے۔

مسلمانوں نے جو دانش گاہیں اندلس میں قائم کیں، وہ اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں کے علوم و فنون یورپ کے عیسائی ملکوں میں انھی یونیورسٹیوں کے ذریعے سے پہنچے تھے اور یہ علوم و فنون یورپ کی تمدنی اور ثقافتی ترقی میں بہت ممد و مددگار ثابت ہوئے۔

اسلام اس لحاظ سے ایک عقلی مذہب ہے کہ اس کے تمام احکام عقل کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ قرآن پاک نے جہاں کہیں کوئی حقیقت بیان کی ہے یا کوئی حکم صادر کیا ہے، اس کے ساتھ ہی اس کے حق میں اپنے دلائل و براہین بھی پیش کیے ہیں اور اسلام کی یہی وہ عقل پسندی کہیے یا معقولیت تھی کہ مشرق و مغرب کی بے شمار قوموں نے اس پیغام کو سنا، اسے قبول کیا اور اسے اپنے لیے مشعلِ راہ بنایا۔ یہاں تک کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب بن گیا اور اس وقت نوعِ انسان کی آبادی کا کم از کم پانچواں حصہ اس کا حلقہ بگوش ہے۔ قرآن پاک کی ایک آیت نہایت فکر انگیز ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ قرآن ان لوگوں کو مخاطب کرتا ہے، جو سوچ بچار کرتے ہیں۔ (لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ) اسی مضمون کی اور بہت سی آیات ہیں جن میں انسان کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے اور ان سے اس بات کی توقع کی گئی ہے کہ وہ قرآنی احکام کے پرکھنے میں عقل اور سوچ بچار سے کام لیں۔ آج کل عالم اسلام پر جو ادبار چھایا ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہم مسلمانوں نے عقل سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔

عہدِ حاضر کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ اپنی نئی پود کو اسلام کے اعلیٰ اور پاکیزہ اصول سے روشناس کرایا جائے۔ وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ ہمارے پاس ایک اعلیٰ و ارفع نظریۂ حیات ہے، جس میں زندگی کے تمام شعبوں کے لیے ہمارے لیے ہدایت موجود ہے اور ہم ایک اعلیٰ تہذیب و تمدن کے وارث ہیں، جو مذہب اور اخلاق کے متعین اصولوں پر قائم ہوئی تھی۔ ہماری تہذیب و ثقافت کو دنیا کی تمدنی اور روحانی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل رہا ہے اور

جن اصولوں کی اساس پر یہ تہذیب قائم ہوئی تھی ان اصولوں میں اب بھی اتنی جان باقی ہے کہ ان کی روشنی میں ہم اپنی بہت سی مشکلات حل کر سکتے ہیں اور بساطِ عالم میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

نظریۂ پاکستان کی اساس

جناب بختیار حسین صدیقی

انسان فطری طور پر اور بنیادی حیثیت سے روحانی مخلوق ہے۔" اس کی سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو ایک نظریے پر استوار کرے جتنا بہتر یہ نظریہ ہوگا، افراد اور اس نظریے کے پیروکار اتنے ہی اچھے ہوں گے۔ ان کی زندگیاں زیادہ جامع اور زیادہ تخلیقی ہوں گی اور وہ مخالف قوتوں کے خلاف مدافعت اور باہمی ربط کے لئے ایک بہت بڑی طاقت بن جائیں گے۔" ہمارے لئے اس قسم کا نظریہ صریح طور پر اسلام ہے۔ اسی اساس پر ہم ایک مملکت (پاکستان) کے حصول کے لیے لڑے اور اسی پر ملت کی حیثیت سے ہمارے اتحاد و استحکام کا انحصار ہے۔

۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے الہ آباد میں پاکستان کے فلسفی شاعر علامہ اقبالؒ نے "اسلام اور ہندوستان کی بہتری کے لئے ایک مضبوط مسلم ریاست کے قیام" کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ "اسلام کے لیے ایک بہترین موقع ہوگا کہ وہ عرب شہنشاہیت کی چھاپ سے رہائی حاصل کرے اور اپنے قوانین، اپنی تعلیم اور اپنی ثقافت کو حرکت میں لائے اور ان کو اپنی اصل روح کے قریب تر لائے اور عہد جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرے۔"

یہ عہد اقبالؒ جیسی قدآور شخصیت کا ملت کی طرف سے ملت کے ساتھ ہے اور آج ان کی طرف سے ہم اس عہد کو پورا کرنے پر اخلاقی اور آئینی طور پر مجبور ہیں کہ اسلام کی سابق

حیثیت اور بنیادی قوت کو بحال کریں اور موجودہ ترقی یافتہ عہد کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے حوالے سے اسلام کی متحرک صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔ پاکستانی نظریے کی اساس کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے اپنی اس ذمے داری کا شدید ادراک لوگوں کو دلانا بہت ضروری ہے۔ میں آپ کو اس حقیقت کی طرف لانا چاہتا ہوں کہ نظریۂ پاکستان نظریۂ اسلام ہے، جو اپنی بنیادی اساس کے ساتھ اور عہد جدید کے تقاضوں کے ساتھ گہری ہم آہنگی کا حامل ہے۔ چنانچہ ہمارا اولین فریضہ یہ ہے کہ ہم نظریۂ پاکستان کی سادہ مگر جدید اصطلاحات میں تعریف کریں کہ لوگ پورے تیقّن اور امید کے ساتھ اس کے مطابق عمل کرنے کے قابل ہو سکیں اور ان کی کارکردگی بے دلی کے ساتھ اس کے متعلق سوچنے تک ہی محدود نہ رہے۔

مذکورہ بالا حقائق سے تین باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ اولاً ایک قوم کی زندگی کے لیے نظریے کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ اس قوم کے قیام و بقا اور استحکام کا واحد ذریعہ ہے۔ ایک نظریاتی قوم میں لچک تو ہو سکتی ہے مگر اسے توڑا نہیں جا سکتا۔ ثانیاً یہ کہ نظریۂ پاکستان صریحاً نظریۂ اسلام ہے اور ثالثاً ہمیں اس نظریے کو سادہ مگر عہد جدید کی اصطلاحات کے مطابق "سمجھانا چاہیے۔

(۲)

ایک نظریے کی حیثیت سے اسلام اپنے چند بنیادی نظریات و اقدار پر قائم ہے اور اپنے پیروکاروں کے تمام ظاہری اور جذباتی پہلوؤں کو متعین کرتا ہے۔ یہی اقدار و نظریات ہمیں نظریۂ پاکستان کی بنیاد کو سمجھانے کا کردار ادا کرتے ہیں۔

ہر نظریہ ایک عقلی انداز اور خاص تصورِ حیات رکھتا ہے، جو لوگوں کی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام میں یہ تصور عقیدۂ توحید ہے خدا کے ایک ہونے

کا تصور یہ عقیدۂ توحید اسلام پر ایمان لانے والے کی جذباتی اور ذہنی زندگی کو مرتب کرنے کا کام کرتا ہے، امت اور ملت کے بین الانسانی روابط کو مجتمع کرتا ہے، مسلمان ریاستوں کے درمیان اتحاد کے رشتوں کو مضبوط کرتا ہے اور عمومی طور پر امن و سلامتی کو تقویت پہنچاتا ہے۔ یہ بیک وقت افراد، ملت اور مجموعی طور پر ساری دنیا کے درمیان اتحاد و سلامتی کا علمبردار ہے۔ ذات، رنگ، خون، نسل اور جغرافیائی بنیادوں کے بجائے اسلام کا بنی نوع انسان کو جذباتی بنیادوں پر اس طرح اکٹھا کرنا تہذیب عالم کی بہت بڑی خدمت ہے۔

ہمیں ایک لحظہ توقف کرنا چاہیے۔ اب بھی مختلف حلقوں کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ عقیدۂ توحید صرف اسلام ہی سے مختص اور مخصوص نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ یہودیت اور عیسائیت کے قدیم مکاشفات میں بھی پایا جاتا ہے۔ میں اس موقع پر اس دعویٰ کی تردید نہیں کرنا چاہتا۔ توحید کے تصور کی حقیقتاً اسلام سے بہت پہلے یہودیت اور عیسائیت نے تبلیغ کی لیکن اس کو تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کا عقیدۂ توحید یہودیت و عیسائیت کے تصورِ توحید کے عین مطابق ہے۔ اسلام کا نظریۂ توحید انسانیت، معاشرتی نظام اور معاشی انصاف کے احساس کے ساتھ مضبوطی سے منسلک ہے۔ اس پر بذاتِ خود نظریۂ توحید اور قرآن پاک نے بہت زیادہ زور دیا ہے۔ چنانچہ جو شخص رسول کریمؐ کے شروع کے الہامات کا بغور مطالعہ کرتا ہے، وہ اس تجربے کے حاصل کردہ نتائج سے پہلو تہی یا گریز نہیں کر سکتا۔ قرآن کہتا ہے۔

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝	کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو دین کو
فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝	جھٹلاتا ہے۔ یہی تو ہے جو یتیم سے ناروا
وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝	سلوک کرتا ہے اور مسکینوں کو کھانا کھلانے

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝

پرادروں کو آمادہ نہیں کرتا۔ افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں، جو دکھاوا کرتے ہیں اور مانگے کی بھی چیزیں نہیں دیتے۔

(القرآن، سورۃ الماعون ۱۰۷)

یہ عقیدۂ توحید کا وہ انسانی پہلو ہے، جو تاریخ کے صفحات سے ظاہر ہے کہ بعد میں مدینے میں ایک اسلامی سوسائٹی کے قیام کا باعث ہوا۔ جہاں تک برصغیر پاک و ہند کا تعلق ہے، اقبالؒ کہتے ہیں یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ اگر اسلام کو ایک اخلاقی نصب العین رکھنے والے نظام حیات کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے (نظام حیات سے میری مراد ایک ایسا معاشرتی ڈھانچہ ہے جس کا اپنا قانونی نظام اور ایک اخلاقی نصب العین ہو) تو یہی اسلام ہے جس کے ظہور سے نظام قانون کا ایک مضبوط اخلاقی نصب العین ہندوستان میں مسلمانوں کی اجتماعی تاریخ کا بنیادی عنصر رہا ہے۔ دراصل، نظام مملکت کے طور پر صرف اسلام ہی بنی نوع انسان کی جذباتی اور عقلی زندگی میں عقیدۂ توحید کو ایک زندہ حقیقت بنانے کا عمل ذریعہ ہے۔ اس لئے اگرچہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ عیسائیت اور یہودیت میں مبہم قسم کا عقیدۂ توحید تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے تاریخی شواہد نہیں مل سکتے کہ یہ عقیدۂ توحید معاشرتی اصلاح کی کسی تحریک کے ساتھ متعلق ہو جیسا کہ اسلام میں ہے۔ اسلام میں انسانی اور روحانی تمام چیزیں شامل ہیں۔ اسلام میں مذہبی فرائض کی ادائگی، خیرات و صدقات دینا اور گھریلو، معاشرتی، معاشی اور سیاسی حیثیت سے فرائض ادا کرنا سب کچھ شامل ہے۔ اسلام روحانی اور دنیوی زندگی میں، مذہبی اور غیر مذہبی زندگی میں، "متبرک اور دنیوی میں کوئی تفریق روا نہیں رکھتا

اور اسی لیے یہ بات قطعاً تعجب انگیز نہیں ہے کہ اس کے عقیدۂ توحید کا بڑا لطیف تاثر اس معاشرتی اصلاح کی تحریک پر ہوا جس کے باعث وہ سوسائٹی عمل میں آئی جس میں مذہب کی نسبت قانون کو زیادہ مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔

(۲)

نظریاتی اصول کے طور پر جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اسلام کے عقیدۂ توحید میں انسانیت کے اجتماع و اتحاد کے جذباتی تصور کے ساتھ ساتھ عالمگیر معاشی و معاشرتی اصلاح کی مضبوط بنیاد موجود ہے۔ اب ہمیں اس نظریے کی جزئیات کی تفسیر کرنی ہے۔

دنیا بھر کے مسلمان ایک وسیع اخوت یا بھائی چارے کے احساس میں منسلک ہیں کیونکہ پیغمبر اسلام ان کے واحد رہنما ہیں، ایک قرآن ان کے لیے ذریعۂ ہدایت ہے، وہ ایک ہی نصب العین کی طرف نگراں ہیں اور ایک خدا کے عقیدے کے مطابق اپنی زندگیاں گزارتے ہیں۔ اسلام میں قومیت کی بنیاد رنگ، خون، نسل یا جغرافیائی حدود کے ایک ہونے پر نہیں ہے بلکہ طریقۂ زندگی اور ثقافت کی وحدت پر ہے۔ چنانچہ پاکستان کے فلسفی شاعر علامہ اقبالؒ متنبہ کرتے ہیں،

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

ایل۔ سٹوڈرڈ کا کہنا ہے کہ "استحکام اسلام کی دو مضبوط بنیادیں ہیں، حج کعبۃ اللہ اور خلافت"۔

مغرب کی عمومی رائے ہے قطعِ نظر خلافت سے زیادہ حج نے اسلام کو مضبوط کرنے میں کردار ادا کیا ہے۔ ہر سال مسلم دنیا کے تمام ممالک سے تقریباً ایک لاکھ (اب تین لاکھ) حجاج اکٹھے ہوتے ہیں۔ مکہ معظمہ میں کعبہ شریف کے سامنے تمام نسلوں، زبانوں اور ثقافتوں کے انسان باہمی اخوت کے احساس سے سرشار مجتمع ہوتے ہیں۔ اسی جذباتی اتحاد کا نتیجہ ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کے عوام آپس میں ایک ہزار میل سے زائد فاصلے کے ہوتے ہوئے ایک ناقابل تقسیم اکائی کی صورت میں منظم ہیں اور واحد انسانی برادری کا رکن ہونے کی حیثیت سے اکٹھے سوچنے، محسوس کرنے اور عمل کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہیں۔

تحریکِ اصلاحِ معاشرہ کے طور پر اسلام مساوات، آزادی اور اخوت کی اقدار پر زور دیتا ہے۔ ہم سب ایک اور ایک جیسے ہیں کیونکہ ہم سب حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں۔ اقبالؒ نے مندرجہ ذیل اشعار میں اسلام کی ان سیاسی اور معاشرتی اقدار کو بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے
یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

اسلام عالمگیر برادری، مذہبی رواداری اور معاشرتی انصاف کے تقاضوں کے مطابق قومی اور بین الاقوامی مسائل کو حل کرنا اور ایک معاشرتی ڈھانچہ ترتیب دینا چاہتا ہے۔ یہ بات ناقابل تردید ہے کہ اس سے پیدا شدہ عالمگیر اخوت کا تصور دنیا میں پھیلی ہوئی جارحانہ قوم پرستی، تنگ نظری، نسل پرستی اور دوسرے تعصبات کی تفرقہ پرداز قوتوں سے پیدا ہونے والے سیاسی انتشار سے محفوظ رہے گا۔

اسلام کے تجربے نے دنیا کو دکھایا کہ کس طرح اسلام کی اخلاقی اقدار کی اساس پر مذہبی اقلیتوں کے حقوق کو پامال ہونے سے بچاتے ہوئے ایک مثالی سوسائٹی کا قیام عمل میں آ سکتا

ہے۔ اسی طرح معاشرتی انصاف کی صفت دنیا کو متعدد معاشی ناانصافیوں اور معاشرتی برائیوں کا خاتمہ کرنے کی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس کی جڑیں توحیدِ خداوندی کے عقیدے اور شعور پر ہیں۔ یہ بے خدا اشتراکیت اور مغربی سرمایہ داری کا مسکت جواب ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کے ضمن میں اسلام امن اور بہتر ہمسائیگی کے تعلقات پر زور دیتا ہے۔ یہ قومی پالیسی کے طور پر جارحانہ جنگ کی غیر اخلاقی حرکت کو قابلِ ملامت گردانتا ہے۔ اسلام اپنی حفاظت کے لیے اور جارحیت و استبداد کو ختم کرنے کے لیے جنگ کو جائز قرار دیتا ہے۔ دنیا میں امن اور استحکام کی اسی پالیسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے پاکستان نے بہت سے ممالک کے ساتھ مختلف قسم کے معاہدات کیے ہیں، جن کا مقصد ان کے ساتھ دوستانہ مراسم کو مضبوط تر کرنا اور قومی ترقی کی رفتار کو تیز تر کرنا ہے، کسی دوسری مملکت کے خلاف جارحیت کا ارتکاب نہیں۔ پاکستان نے خاص طور پر اپنے برادر مسلم ممالک کے ساتھ اتحاد کے رشتوں کو مضبوط تر کرنے پر زور دیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کی خواہش پاکستان کو ہے اور ہمیشہ سے رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے مجلسِ اقوام متحدہ میں دنیا بھر کے مسلمانوں کی سرگرم طرفداری اور حمایت میں خصوصی دلچسپی لی ہے اور رہنمایانہ کردار ادا کیا ہے۔ ماضی قریب میں پاکستان کی طرف سے اسرائیل جارحیت کے خلاف عربوں کی بھرپور حمایت عرصے تک مسلم دنیا میں یاد رکھی جائے گی۔

(۴)

اسلام کا عقیدۂ توحید، جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں، معاشرتی نظام اور معاشی انصاف کے احساس سے ناقابلِ تقسیم حد تک متعلق ہے یہی وجہ ہے کہ مسلم ذہن نے الٰہیات کے بجائے قانون میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ ترقی پسندانہ اظہار کیا۔ مسلم روایت میں یہ حکمتِ قانون حقوق و فرائض کا وہ علم ہے جس سے انسان اپنی زندگی کو صحیح

طریقے سے گزارنے اور مستقبل کی دنیا کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس طرح سے اسلامی قانون دنیوی اور اخروی زندگی کو واضح اور روشن کرتا ہے۔ اس میں مذہبی فرائض کی ادائیگی، خیرات دینا اور گھریلو، معاشرتی، معاشی اور سیاسی حیثیت سے فرائض ادا کرنا سب کچھ شامل ہے۔ اس کے علمی کردار اور دانشورانہ عظمت سے قطع نظر اسلامی قانون ایک معاشرتی نظام کی تشکیل اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ اس نے اپنی انتہائی جامعیت کے ذریعے تمام انفرادی اور اجتماعی سرگرمیوں پر مسلسل دباؤ ڈالا اور ایسا معیار قائم کر دیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پرانی عادات اور قدیم معزز رسومات کے باوجود لوگ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ اس کے مطابق ڈھالتے رہے۔

قرآن اور سنت اسلامی قانون کے بنیادی ماخذ ہیں تاکہ اسلام کے قانون کی روحانی بنیاد لازوال اور دوامی ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں لینے چاہئیں کہ اسلام ترقی اور تبدیلی کا مخالف ہے اور بدلتی ہوئی معاشرتی ضروریات اور حالات پر کان نہیں دھرتا۔ اسلامی قانون کی اصل بنیاد اس کا لازوال اور ابدی ہونا ہے اور اقبال کے نزدیک اس کی یہ ابدیت تنوع اور تغیر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ "حقیقت کے اس تصور پر مبنی معاشرے کے لیے لازم ہے کہ زندگی میں ابدیت اور تغیر کے مدارج کے ساتھ مطابقت پیدا کرے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اجتماعی زندگی کی تنظیم کے لیے ابدی اصولوں کا حامل ہو کیونکہ دنیا کی مسلسل تغیر پذیری میں ابدیت ایک مستحکم بنیاد کا کام دیتی ہے۔ لیکن اگر امکاناتِ تغیر جو قرآن کے مطابق آیاتِ الٰہی میں سے ہیں، کو ابدی اصولوں کے مفہوم سے خارج کر دیا جائے تو وہ زندگی کو جامد کر دیتے ہیں حالانکہ یہ اپنی فطرت و روح کے اعتبار سے متحرک ہے۔"

اسلامی قانون جامد نہیں ہے۔ یہ حالات کے ساتھ متحرک ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے

لیکن یہ حرکت کیسے جنم لیتی ہے؟ اجتہاد کے عمل سے، جو علامہ اقبال کے الفاظ میں "تحرک کا اصول ہے۔ اسلامی قوانین کی زبان میں اجتہاد کے معنی ہیں "قانون کے کسی مسئلے پر کسی کا شخصی فیصلے پر زور دینا۔ قرآن کے الفاظ میں اس کی بنیاد یہ ہے" اور وہ لوگ جو ہمارا راستہ دکھانے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں" اور پیغمبر اسلامؐ کا معاذ کے بارے میں رویہ جب انہیں حضورؐ نے یمن کا حکمران مقرر کیا تو انہوں نے کہا کہ اگر معاملے کا انہیں قرآن وسنت سے کوئی حل نہ مل سکا تو وہ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے اپنی انفرادی رائے کو استعمال کریں گے۔ لیکن اجتہاد کو کسی طرح بھی انفرادی رائے پر مبنی فیصلے سے خلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔ اجتہاد کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی خاص مسئلے پر قرآن وسنت کی تعلیمات کی مطابقت تلاش کرنے کے لیے اپنی ذاتی کوشش کو استعمال کرے اور یہ فیصلہ کسی طرح بھی قرآن وسنت کی تعلیمات کی روح کے خلاف نہیں ہونا چاہیئے۔ رسول اکرمؐ کے ساتھیوں اور مسلمانوں کی پہلی نسلوں کا اس معاملے میں یہی طریقہ رہا اور انہوں نے اس طرح سے غور وخوض کر کے اسلامی قانون کی بالیدگی کا اہتمام کیا، جو ایچ اے آر گب کے الفاظ میں "انسانی دلائل کی درخشندہ کاوشوں میں سے ایک" ہے۔

انہوں نے پیش آمدہ معاشی اور معاشرتی مسائل پر کھلے اور تازہ ذہن سے غور کیا اور بہترین قابلِ عمل حل تلاش کیئے یہی سبب ہے جس کی وجہ سے اسلام کی پہلی صدیوں نے علم اور تخلیقی تفکر کو پھولتے پھلتے دیکھا، جس نے انسانی ترقی میں صحتمندانہ کردار ادا کیا۔ مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری کے وسط سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک قانون کے ۱۹ مکاتب ایجاد کیے۔ قانون کے ان وسیع مکاتب کے ابھرنے سے اسلام کی کشادہ دلی اور بے تعصبی کی طرف اشارہ ملتا ہے جس نے اس قسم کے دانشورانہ عمل اور تجربات میں تیزی پیدا کی۔ اس نے مسلمانوں کی اتحاد کی جستجو کی خصوصیات کا عملی اظہار کیا۔ اسلامی قانون کے ان تمام مکاتب میں اصولیات

پر مکمل ہم آہنگی تھی، اگرچہ ان میں فروعات پر اختلاف پایا جاتا تھا۔

راسخ الاعتقاد مذہب پرست حضرات اس خدشے کے پیش نظر کہ اجتہاد کی حقیقت کو تسلیم کر لینے سے بدعت اور اختراع کا دروازہ کھل سکتا ہے، رفتہ رفتہ اس کی وسعت کو تنگ کرتے گئے، جب کہ فقیہوں کی بعد کی نسلوں نے اصول اور قانونی طریقوں سے ان خلاؤں کو پُر کیا۔ آخر کار کوئی خلا باقی نہ رہا یا بالکل ادنیٰ اور بے معنی سے خلا باقی بچے اور اس پر اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا اور پھر کبھی نہیں کھولا گیا۔ لیکن اقبالؒ جیسے جدید مفکرین جو اجتہاد کا حق مانگتے ہیں، دلیل دیتے ہیں کہ قانون کے قدیم طریقے اگرچہ جامع ہیں اور عزت وتکریم کے مستحق ہیں، مگر پھر بھی "انفرادی تعبیرات ہیں، جو حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتیں۔ قرآن کی رو سے زندگی مسلسل تخلیقی عمل ہے، جو اس امر کا متقاضی ہے کہ ہر نسل کو اس کے پیشروؤں کے کام سے رہنمائی حاصل کر کے مزاحمت کے بغیر اپنے مسائل حل کرنے کی اجازت ہونی چاہیے"

چنانچہ ہمیں اس سخت خول کو ختم کرنا ہے، جو اجتہاد کا دروازہ بند کر کے اسلام کو بے حرکت اور جامد بناتا ہے۔ صرف اسی طرح اسلام کی اصلی آزادی اور ایجادانہ متحرک صلاحیت کو سامنے لایا جا سکتا ہے۔ ہمیں F. SCHUON کے مشرق ومغرب کے زوال کی دانشورانہ تشریح کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے "تمام تہذیبیں آخر کار زوال پذیر ہوئیں۔ صرف ان کے زوال کے طریقے مختلف ہیں۔ مشرق کا زوال انفعالیت کی وجہ سے ہوا ہے اور مغرب کا حد سے بڑھی ہوئی فعالیت سے۔ مشرق کے زوال کی وجہ یہ ہے کہ یہ بہت کم تفکر کرتا ہے اور مغرب کے زوال کا سبب یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ سوچتا ہے اور غلط انداز میں سوچتا ہے۔ مشرق سچائیوں پر سویا رہتا ہے اور مغرب غلطیوں میں زندگی

بسر کرتا ہے۔ اس تشریح و ترکیب کے مطابق ہماری تمام مصیبتوں کا علاج تفکر اور صحیح انداز کا تفکر ہے۔ جس کا ہمارے لئے مطلب یہ ہے کہ ہم اجتہاد کے ترقی پسندانہ اصولوں پر دانشمندانہ عمل کریں۔ یہ کچھ کرنے سے پہلے ہمیں اپنے خزانوں کو تلاش کرنا ہے، جن سے ہم اب تک اغماض برتتے رہے ہیں۔

اجتہاد کا شخصی اجماع یا اتفاق رائے ہے یہ اسلامی اصولیات کو نافذ کرنے کی تمام تر بنیاد ہے۔ اجتہاد ہمیں سمجھ کے مطابق قانون کی عملی تعبیر کا حق دیتا ہے لیکن ایسی کسی تعبیر کو قانونی اجازت اسی صورت میں مل سکتی ہے جب کہ اس میں ملحد عناصر کے گھس آنے کے خلاف مکمل حفاظت کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ اجتہاد کو قابل قبول بنانے کے لئے اجماع ملت کی متفقہ تائید کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے۔ اجماع کے قابلِ اعتماد ہونے کے متعلق پیغمبر اسلام ؐ کی مشہور حدیث میں زور دیا گیا ہے کہ "میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی"۔ اس کی بنیاد میں یہ تصور کام کر رہا ہے کہ مذہب ایک ایسی حقیقت ہے جو عام ذہین اہل ایمان کے ضمیر میں محفوظ ہوتا ہے۔

اجماع کی روح جمہوری ہے کیونکہ یہ متفقہ رائے کو قانون سازی کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

بہر حال اگر مکمل اتفاق رائے ممکن نہ ہو تو یہ اختلاف رائے کی بھی اجازت دیتا ہے۔ یہ اجماع ہملٹن گب کے الفاظ میں "اصولِ اقتدار" بھی ہے، اور "اختلاف کو برداشت کرنے کا اصول" بھی ہے۔ اصول اقتدار اس اعتبار سے ہے کہ امت جو کچھ کہے اس سے انحراف نہیں ہو سکتا لیکن بعض حدود میں یہ اختلافات کو برداشت کرنے کا اصول بھی ہے۔ چونکہ یہ سب کچھ امت کے اجتماعی ضمیر پر مبنی ہے اس لئے اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا خاص نظریات کا کوئی گروہ چاہے وہ جتنا بھی طاقتور ہو، کسی دوسرے گروہ کے خیالات کو گمراہ کن اور ملحدانہ

قرار دینے اور دوسرے کے خیالات کو طاقت کے ذریعے دبا دینے کا (اگر وہ ایسا کرے) مجاز نہیں ہے۔ اجتہاد بحیثیت "اصول تحریک" اور اجماع بحیثیت "اصول اقتدار" اور "اختلافات کی برداشت کا اصول" اسلام کی طرف سے ہم پر بہت بڑی ذمے داری منتقل کرتے ہیں کہ اسلام کی سابق حرکی صلاحیت اور حیات کو بحال کریں اور اس کی اصلی روح اور عہد جدید کے تقاضوں سے قریب تر کرنے کی کوشش کریں۔

لیکن اسلامی قانون اگرچہ حرکی ہے مگر تبدیلی برائے تبدیلی کی اجازت نہیں دیتا۔ اقبال کہتے ہیں "زندگی اپنے ماضی کا بوجھ کمر پہ لیے ہوئے حرکت کرتی ہے اور معاشرتی تغیر کے کسی بھی مفہوم کے اعتبار سے "قدامت" کے کردار اور قوت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔"

یہ تصور ہمیں اپنے عظیم اسلاف اور قدیم فقیہانِ اسلام سے منہ پھیر کر جدتوں کی طرف راجع ہونے سے بچاتا ہے اور ہمیں اپنی دانشورانہ آزادی کو رضاکارانہ طور پر چھوڑ دینا سکھاتا ہے لیکن آزاد خیال مجاہدین کو اس راہ کی خاص حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔ یہ انتہائی اہم ہے کہ ترقی کی تحریک اسلام کی حدود کے اندر چلائی جائے۔ اس نظام کو ضائع نہیں کرنا چاہیے جس میں کہ اسے کام کرنا ہے۔

(۵)

خلاصہ یہ کہ عقیدۂ توحید کا انسانی پہلو اور قرآن کے لازوال قانون کی حرکی صلاحیت دونوں مل کر نظریۂ پاکستان کی بنیاد قائم کرتے ہیں۔ ایک میں بنی نوعِ انسان کے اتحاد کے جذباتی اصول نظر آتے ہیں اور عالمگیر اخوت، مذہبی رواداری اور معاشرتی انصاف کی اقدار پر مشتمل ایک معاشرے کے قیام کی مضبوط بنیاد کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر ان کا قیام اور خصوصاً اسلامی ممالک میں اتحاد کی خواہش موجود ہے۔ دوسرے میں اجتہاد کے عمل اور اجماع یعنی

"اصولِ تحریک کے ذریعے سے اسلام کی ایجادی اور متحرک صلاحیت اور اصل آزادی کے قیام کی صورت موجود ہے۔ ان ضوابط کے احساس کی ایک شکل یہ ہے کہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، راولپنڈی (سابق مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی، کراچی) ۱۹۶۰ء کے آئین، جس کی منظوری بورڈ آف گورنرز نے دی ہے، کی شق نمبر ۳ میں ادارے کے مندرجہ ذیل چار کام بتائے گئے ہیں:

۱۔ بنیادی اصولوں کی روشنی میں اسلام کی شائستہ اور کشادہ دلانہ انداز میں تعریف اور عالمگیر برادری، رواداری اور معاشرتی انصاف کی بنیادی اسلامی اقدار پر زور دینا۔

۲۔ تعلیماتِ اسلام کو اس طریقے سے پیش کرنا کہ عہدِ جدید کی سائنسی اور دانشورانہ ترقی کے حوالے سے اس کی متحرک صلاحیت کو بروئے کار لایا جائے۔

۳۔ فکر، سائنس اور ثقافت کے شعبوں میں اسلام کی خدمات پر اس نقطۂ نظر سے تحقیق کرنا کہ مسلمانوں کو ان شعبوں میں دوبارہ خصوصی مقام حاصل ہو سکے۔

۴۔ اسلامی تاریخ، فلسفہ، قانون اور اصولیات پر تحقیق کا انتظام کرنا اور اس کی حوصلہ افزائی کرنا۔

یہ اسلام کے سیاسی نظام میں نفوذ کرنے والی الحادی قوتوں کے مقابلے میں قدامت کی قوتوں کے کردار و قیمت تسلیم کرنے ہی کی وجہ سے تھا کہ دستورِ پاکستان کی دفعہ ۲۰۴ کے تحت اسلامی مشاورتی کونسل کے درج ذیل فرائض طے کیے گیے تھے:

۱۔ مسلمانانِ پاکستان کو ہر لحاظ سے اسلام کے نظریات اور اصولوں کے مطابق زندگیاں گزارنے پر مائل کرتے اور انہیں اس کے قابل بنانے کے لئے مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کو سفارشات بھیجنا۔

۲۔ قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلی یا گورنر کو ہر ایسے سوال پر مشورہ دینا جس کے متعلق

شق نمبر ۲ کے تحت ان سے رجوع کیا گیا ہو، مثلاً کوئی سوال یا کوئی مجوزہ قانون، قانون سازی کے اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتا یا بے تعلق ہے یا اس کی حدود کو پامال کرتا ہے۔

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اور اسلامی مشاورتی کونسل کا قیام اسلام کو اس کی اصل روح اور عہدِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی اہم ذمے داری کا احساس کرنے کے لئے حکومتِ پاکستان کے دو اہم اقدام ہیں۔ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اسلامی نظریے کی فیاضی کے مفادات کی نمائندگی کرتا ہے اور مشاورتی کونسل نظریے کی محافظ طاقتوں کی اہمیت کی نگران ہے اور اس قدامت اور آزادیٔ فکر کی آمیزش سے وہ بنیاد ظہور میں آتی ہے، جس پر ہمیں پاکستان میں مسلم معاشرے کی تعمیر کرنی ہے۔

برِصغیر میں اسلامی دَورِ حکومت اور اس کی خصوصیات

پروفیسر شیخ عبد الرشید

برِصغیر پاک و ہند میں ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک کے اسلامی عہدِ حکومت کی خصوصیات اور ہندوستانی ماحول میں اسلامی تہذیب کا جائزہ اور اس کی افادیت کا تذکرہ ایک مختصر سے مقالے میں بہت مشکل ہے۔ اس لیے میں اس تہذیب کی صرف نمایاں خصوصیات اور ان شخصیات تک محدود رہوں گا، جنھوں نے اس تہذیب کے خدوخال کی تشکیل میں مدد دی۔

بعض اوقات دعوٰی کیا جاتا ہے کہ ہندی مسلم کلچر جیسا کہ اس نے برِصغیر میں صورت اختیار کی، اپنے اجزا و عناصر کے لحاظ سے بعینہٖ وہی اسلامی تہذیب ہے، جو دنیا کے کسی دوسرے حصے میں ہو سکتی ہے اور یہ کہ "یہ اسلامی تہذیب کی جامع، مختلف النوع اور ایک مربوط صورت ہے" لیکن یہ تہذیب بحیرۂ روم، ایران اور عرب کی ان قدیم روایات پر مشتمل نہیں، جنھوں نے اسلامی تہذیب بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا بلکہ اس میں اس برِصغیر کی تہذیب ـــــ ہندو اور بدھ تہذیبوں کے عناصر شامل ہیں، جنھوں نے اسے ایک زیادہ پیچیدہ اور مخلوط تہذیب بنا دیا۔ تاہم ہندو مسلم تمدن کی تشکیل میں سب سے اہم عنصر اسلام ہی تھا۔ قدیم تمدن کو نئے تمدن سے مربوط کرنے اور نئی شکل دینے کا یہ عمل بالآخر ایک نئی تمدنی ہیئتِ ترکیبی پر منتج ہوا "یا ایک ایسی ہیئتِ ترکیبی پر، جو کہ بالعموم تاریخ کے ان مراحل پر رونما ہوئی ہے، جہاں دو

تہذیبیں آپس میں ملتی ہوں۔" نئے ماحول میں ہندو روایات اور رسومات کا اثر و ران و میں جول ناگزیر تھا لیکن یہ سب کچھ اسلامی تصورِ حیات کے تحت ہُوا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میل جول کا ایک اور مقصد خارجی اندازِ فکر اور اقدار کی برتری سے نجات حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ مادی تہذیب، سیاسی اداروں اور انتظامی طریقِ کار کا خیر مقدم کیا گیا لیکن نظریاتی طور پر (اور نظریے کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایسے اجتماعی خیالات ہیں جنھیں جذبات نے گھیر کر دیا ہو) ان اجتماعی تصورات یا اس طرزِ حیات کو مسترد کر دیا گیا، جو اسلامی عقائد کے منافی تھا۔ ساتھ ہی کسی بات کے قابلِ قبول ہونے کا معیار اس کی افادیت تھا۔

"تمام تمدنی ترقیات کسی وجودی صورتِ حال کی پیداوار ہوتی ہیں اور ان کی ہیئت کی تشکیل اسی صورتِ حال کے سیاق و سباق میں قرار پاتی ہے، جو کسی خاص وقت کے معاشرے کے نفسیاتی، روحانی اور مادی تقاضوں کے عین مطابق ہوتی ہے۔ بعد کی تبدیلیاں دراصل زندگی کے متعلق بنیادی اندازِ فکر یا ان احساسات کی وجہ سے ہوتی ہیں کہ بیرونی تمدن کے بعض پہلو اس معاشرے کی روح کے خلاف ہیں، یہاں یہ جان لینا مفید اور دلچسپی کا باعث ہوگا کہ مختلف تمدنی عناصر مل کر کیسے ایک نئے اندازِ کار اور احساسات کو جنم دیتے ہیں۔ ہمارے تمدن کے مختلف خدوخال اور شدید مذہبی جذبات میں مصالحت کی کیا کوششیں ہوئیں اور کس طرح پابندئ شریعت کا جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا ہے۔ اس مطالعے کے دوران زندگی کی مسرتیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ حظ اٹھانے کی خواہش اقتصادی بوجھ اور پریشانیاں، متروک سماجی ادارے جو اپنی افادیت اور توازن کھو چکے ہیں اور تصور اور حقیقی عمل میں تضاد نہایت اہمیت کے حامل ہوں گے۔ ہو سکتا ہے، کوئی یہ پوچھے کہ اس تمدن کی اساس روحانی ہے یا مادی۔ لیکن اس سوال کا

جواب آسان نہیں۔ اس تہذیب کی تشکیل و تعبیر کا مطالعہ دراصل اس معاشرے کا مطالعہ ہے "جہاں ایک طرف پس منظر کا اختلاف اور دوسری طرف موجودہ سیاسی و ثقافتی اداروں کا اتحاد اس معاشرے کی تخلیق کرتے ہیں، جہاں انسان قدیم مواد سے ایک نئی دنیا کو جنم دینے کی کوشش کرتا ہے۔" صوفیا اور نیک لوگوں نے مسلم معاشرے کو روایتی اسلامی معاشرے کا مثیل بنانے کی کوشش کی، جب کہ بادشاہوں اور ان کے درباریوں نے ایک نیا نظریۂ حیات اور سیاسی رجحانات کا ایک نیا طرزِ عمل تشکیل دے کر اسے اجنبی اور بیرونی ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ یہ حکمران طبقہ ہی تھا جس نے برصغیر میں انسانوں کے طبعی تضاد اور ان متخالف رجحانات کو نظر انداز کر کے ایک مخلوط تمدن کو تشکیل دینے کی کوشش کی جو انسانی طبائع کے تضاد، تمدن میں اختلافات اور پھر ان اختلافات کے شعور کو جنم دیتے ہیں، جب کہ دوسری طرف علما نے مسلم قوم کے بنیادی اسلامی کردار کو برقرار رکھنے پر زور دیا۔ اس لیے برصغیر میں اسلامی دورِ حکومت کا ایک نمایاں وصف بقائے باہمی کی پالیسی تھی، جو برداشت اور معاشرتی انصاف پر مبنی تھی اسے مفاہمت و مصالحت اور سیاسی مصلحتوں کی پالیسی قرار دیا گیا، جو ناکام رہی اور ایسی مصالحتیں عام طور پر ناکام ہی ہو جایا کرتی ہیں۔

ٹیلر تمدن کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ "تمدن افراد کی عام زندگی کی تمام شقوں کا مجموعہ ہے، جب کہ تہذیب بلند تر معیارِ زندگی کی نمائندگی کرتی ہے، جو مادی نقطۂ نظر سے تمدنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے اور ہمیشہ تمدن کی دوست نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات مخالف بھی ہوتی ہے۔ تہذیب کی اصل تجسس اور جسمانی ضرورت میں ہے، جب کہ تمدن کی اصل خوب سے خوب تر کی تشنہ جستجو ہے۔"

(لیکن آج کل تہذیب اور تمدن کے الفاظ کم و بیش مترادف کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں)

اسلامی تمدن کی تعریف مشکل ہے۔ یہ ایک ذہنی رجحان ہے، جس کا منبع اسلام کی بنیادی تعلیمات — خدا کی وحدانیت، وحدتِ انسانی، اپنے افعال کے لیے ہر فرد کا ذمے دار قرار پانا اور انسانی عزت و وقار ہیں۔ اسلامی تمدن کو سمجھنے کے لیے اسلام کی مبادیات کا سمجھنا ضروری ہے۔ اسلامی تمدن جو سادہ، متعین اور عملی ہے، افراد اور معاشرے کی مادی اور روحانی ضروریات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پکتھال کے الفاظ میں اسلام کے تمدن کا مقصد انسانی زندگی کے لوازم کو خوبصورت اور عمدہ بنانا نہیں، بلکہ اس کا مقصد بجائے خود انسانی زندگی کو خوب تر اور سرفراز کرنا ہے۔"

سندھ اور بعد ازاں شمالی ہند میں مسلم افواج کی آمد سے بہت پہلے اسلام عرب تاجروں اور سیاحوں کی وساطت سے برصغیر کے جنوبی علاقوں میں قدم جما چکا تھا۔ ان تاجروں اور سیاحوں کے مقامی آبادی سے تعلقات دیرینہ اور پرامن تھے۔ مسلم افواج کی شمال مغربی دروں سے آمد گیارھویں صدی کے اوائل میں شروع ہوئی اور برصغیر میں اسلام کی اشاعت و ترویج، ہندی عوام کے ردِ عمل کی نوعیت اور بعد کے واقعات سے اس حقیقت کا گہرا تعلق ہے۔ جنوبی ہند میں اسلام افواج کی تحریک سے نہیں بلکہ تاجر برادری کے ساتھ آیا، اس لیے اس کا اچھی طرح خیر مقدم ہوا اور یوں مسلم برادری نے اس نئے ماحول میں ایک قابلِ عزت مقام حاصل کر لیا۔ سندھ میں عربوں نے ایک مفاہمت آمیز اور مفید سرپرستانہ حکومت قائم کی۔ برہمن آباد کی حکومت میں سیاسی ضرورت اور انصاف کی اندرونی حس سے پیدا ہونے والے

سیاسی تدبر اور عمدہ سلوک کا بہترین مظاہرہ کیا گیا۔ ہندوؤں کو ذمیوں کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا۔ ان کی زمینیں ان کے پاس رہنے دی گئیں۔ ان کی عبادت گاہوں کا احترام کیا گیا، حتیٰ کہ قدیم بُت خانوں کی مرمت کی اجازت بھی دے دی گئی اور روائتی حکمران طبقوں کے لوگوں کو جہاں یہ امر خطرے سے خالی سمجھا گیا ساتھ ملا لیا گیا اس اصول کو آنے والے حکمرانوں نے ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ ترک حملوں کو جو گیارھویں صدی میں شروع ہوئے، زیادہ سخت مزاحمت اور رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے فاتحین نے عربوں کی نسبت مفتوح عوام کے بارے میں زیادہ سخت رویہ اختیار کیا۔ یہ حملہ آور آریہ ورت کے قلب تک جا پہنچے اور انہوں نے "ہندوؤں کے مذاہب کو اس شدت سے متاثر کیا کہ اس سے قبل ہندوستان میں اس کی مثال نہیں تھی اور نہ یہ اب تک فراموش کیے جا سکے ہیں نہ معاف کیے گئے ہیں۔"

شمالی ہند میں مسلم حکومت کا قیام برصغیر کی معاشرتی، مذہبی اور سیاسی زندگی میں ایک نئے موڑ کا نقطۂ آغاز ہے۔ ہرش کی موت کے بعد ہند و خود کو محفوظ کرنے کے لیے تنہائی کے جس خول میں جا گھسے تھے، وہ ٹوٹ گیا اور بیرونی تعلقات دوبارہ قائم ہوئے۔ تیرھویں صدی کو عظیم ترین اور خوفناک انسانی المیوں ـــــ منگولوں کی تاخت و تاراج کا سامنا کرنا پڑا۔ ترکوں نے شمالی ہند کو منگول حملوں کے تباہ کن سیلاب سے محفوظ رکھا۔ ۱۲۱۰ء میں سلطنت دہلی کے قیام اور بعد ازاں خلجیوں اور تغلقوں کے دور میں اس میں توسیع سے کسی حد تک سیاسی وحدت اور ایسا ماحول پیدا ہو چکا تھا، جو آرٹ، ادب اور طرزِ تعمیر کی ترقی اور نشوونما کے لیے سازگار تھا۔ تین صدیوں تک سلاطینِ دہلی نے جانشینی کی جنگوں اور فوجی

سربراہوں کی بدنظمی، مغربی سرحدوں پر زبردست دباؤ اور مفتوح عوام کی سرکشی مخالفت کے باوجود خود کو ہندو معاشرے میں ضم ہونے سے بچائے رکھا۔ جیسا کہ اس سے قبل یونانی، ہُن اور شاکوس ضم ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ ایک تو ان کے بین الاقوامی طور پر ترقی یافتہ تمدن کی جاندار ی و قوت تھی اور دوسری یہ کہ انہوں نے سرحد پار رہنے والے ہم مذہبوں سے ثقافتی و معاشرتی تعلقات برقرار رکھے۔ سلطان نہ تو اس کے خواہش مند تھے نہ انہیں اس کا موقع ملا یا شاید وہ اس کی اہلیت نہیں رکھتے تھے کہ سیاسی وحدت کو، جو انہوں نے جزوی طور پر عسکری برتری سے حاصل کی تھی، قومی وحدت میں بدل سکتے ۔ اس قسم کی ایک کوشش ملحقہ ریاستوں بنگال، جون پور، گجرات اور کشمیر میں ضرور ہوئی لیکن جس شخص نے ہندوستان میں قومی وحدت پیدا کرنے کا غیر معمولی اقدام کیا، وہ اکبر تھا۔" اس سلسلے میں سلطنت دہلی کی تین صد سالہ تاریخ اپنی ناکامیوں اور کامیابیوں کے ساتھ اس کی معاون ثابت ہوئی لیکن مغلوں کی یہ کوشش ناکام ہوئی کیونکہ مسلمانوں کے متوازی ایک ہندو معاشرہ تھا، جو بے حد جنگ پسند اور جنگ آزما تھا۔ مسلمانوں کی برتری نے ایک حسد پیدا کر دیا تھا، جسے رحمدل مسلم حکومت نہ جان سکی۔

ہندوستان میں مسلم دہلی سلطنت اس دور میں وجود میں آئی، جو بالعموم مسلمانوں کے آزمائش اور آفت کا دور تھا۔ اندرونی نقشہ آرائی اور مسلم سلطنت پر بیرونی دباؤ، عباسی خلافت کے زوال، مسلمانوں کے اندر فرقہ وارانہ اور گمراہ کن تحریکیں، مغرب میں صلیبی جنگوں کے شدید اثرات اور مشرق میں منگولوں کے قتلِ عام نے اسلامی سلطنتوں کے لیے تباہ کن خطرات پیدا کر دیے تھے۔" تاریخِ اسلام کے اس نازک

مرحلے پر، جب کہ وسط ایشیا کے مسلمان عملدار فرار کی راہوں کی تلاش میں تھے، سلطنتِ دہلی نے اسلام کی بکھری ہوئی افواج اور ثقافتی قوتوں کے لیے پناہ گاہ کا کام دیا۔ لاہور، ملتان اور دہلی مسلم تمدن کے مراکز بن گئے اور انہوں نے وسط ایشیا کی اسلامی سرزمین کے بے گھر عالموں، صوفیا، شاعروں، جرنیلوں اور مدبرین کو اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا اور سلطنتِ دہلی "خود بخود اس دور کی مشرقی اسلامی سلطنتوں کے سانچے میں ڈھل گئی" اور تمدنی، انتظامی اور دینی زندگی بھی اسی نمونے پر تشکیل پائی۔

ہندوستان میں بھی، اسلام نے اپنے خاص اوصاف کے ساتھ ہندوستان کے منفرد ماحول کے مطابق مخصوص تمدن کو ترقی دی۔ "آخری گزشتہ دس صدیوں میں ان تصورات، اداروں اور تحریکوں نے (جن کا مسلمانوں کو دوسرے علاقوں میں اور مختلف اقوام کے درمیان بھی سامنا کرنا پڑا) گاہے شعوری اور گاہے غیر شعوری طور پر برصغیر کی معاشرتی اور دینی تحریکوں کی تشکیل پر عملاً اثر ڈالا۔ تازہ امنگوں اور احساسات کی اس مستقل اور دوامی رسد نے ہندی مسلمانوں کے لیے اسلام کی ابتدائی جدوجہد کی مسرور کن یاد کے لیے غذائیت کا کام دیا اور ان میں" ہندوستان کے زمان و مکان سے ایک وسیع تر دنیا کے جزو ہونے کا احساس پیدا کر دیا، جس سے ان کے لیے اسلام سے وفاداری، اجنبی روایات سے مصالحت اور تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کے قدم بہ قدم چلنے کا ایک مشکل مسئلہ پیدا ہو گیا، جب ہندوؤں نے جو مواقع کی تلاش میں رہتے تھے، قبل از اسلام کے تمدن کو زندہ کرنے کی تحریکیں شروع کیں تو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے الفاظ میں "مسلمان تنہا رہ گیا۔ اسے الگ تھلگ کر دیا گیا۔ ہند و مسلم تمدن اس کی تخلیق تھا اور اس کی رگوں میں اس کا خون جاری و ساری تھا۔ جہاں تک اس

کے مذہبی ہونے کا تعلق ہے، وہ عالم اسلام میں ایک امتیازی گروہ کی حیثیت رکھتا تھا اور جہاں تک اس کے مسلمان ہونے کا تعلق ہے، وہ ہندوستان میں ایک ممتاز اور الگ قوم تھا۔"

بالخصوص ہندوؤں کے بے لچک معاشرتی نظام اور مشکل فوجی اور سیاسی صورت حال نے وسیع تر پیمانے پر تبدیلیٔ مذہب کو ناممکن بنا دیا تھا جس کی وجہ سے مسلمان برصغیر پاک و ہند میں اپنی چھ سو سالہ سیاسی برتری کے باوجود اقلیت میں رہے۔ حتیٰ کہ ان علاقوں مثلاً "آگرہ و اودھ" میں بھی جو اس سارے عرصے میں مسلمانوں کی سیاسی قوت اور تمدن کا مرکز تھے، ان کی حیثیت اقلیت کی تھی۔ مسلمانوں کو برصغیر میں جو مقصد درپیش تھا، وہ ضدی اور سرکش مخالف اکثریتی رعایا پر موثر اقلیت کی حکمرانی کو برقرار رکھنے ہی کا نہیں بلکہ ایک دینی برادری کی جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھنے کا تھا۔ یہ برصغیر میں اسلام کی تاریخ اور اپنی جداگانہ حیثیت کو محفوظ رکھنے کی مستقل معاشرتی و تمدنی کوشش کا وہ پہلو ہے، جسے ہمارے مؤرخین اور دانشوروں نے ایک طویل عرصے تک نظر انداز کیے رکھا اور وہ برصغیر کی تہذیب پر ملک کی فوجی فتح کے مذہبی اور تمدنی اثرات کا صحیح اندازہ کرنے میں ناکام رہے۔ دو قومی نظریہ، جو گزشتہ صدی میں مسلمانوں کی علیحدگی کی تحریک کا نعرہ بنا، اس کی اصل ہندو معاشرے کی وہ تنگ نظری ہے، جس نے صدیوں تک مسلمانوں سے اجنبیوں کا سا رویہ اختیار کیے رکھا اور جس کے بارے میں ہندوستان کے معاشرتی اور فلسفیانہ نظام کا گہرا جائزہ لینے والا مبصر البیرونی لکھتا ہے کہ "ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ حماقت یا پاگل پن ایک ایسا مرض ہے، جس کا کوئی علاج نہیں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ روئے زمین پر کوئی ملک ان کے ملک جیسا نہیں اور کوئی قوم ان جیسی نہیں اور کسی قوم کے بادشاہ ان کے بادشاہوں کے ہم پایہ نہیں۔ کوئی مذہب ان کے مذہب سے لگا نہیں

کھاتا اور کوئی سائنس ان کی سائنس جیسی نہیں۔ وہ انتہائی خود بین حماقت کی حد تک لاف زن، خود پرست، مغرور اور نادان ہیں۔ وہ اپنے علم کے بارے میں انتہائی بخیل اور اپنے ہی مذہب کی دوسری ذاتوں تک اس علم کو پہنچنے سے روکنے میں نہایت سخت رویّہ رکھتے ہیں، جب کہ اس علم کو اجنبیوں سے بچانے کے سلسلے میں ان کا رویّہ اس سے بھی کہیں زیادہ سخت ہے۔" ان کے تمام تر مذہبی جنون اور تعصب کا نشانہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جو ان میں سے نہیں — یا تمام غیر ملکی اقوام۔ وہ انہیں ملیچھ یعنی پلید قرار دیتے اور ان سے ہر قسم کے ربط و ضبط پر پابندی لگاتے ہیں، ان سے شادی بیاہ کا تعلق ہو یا کسی اور قسم کے تعلقات کا مسئلہ یا ان کے ساتھ بیٹھنے کھانے اور پینے کا معاملہ۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ ناپاک ہو جائیں گے۔"

اس برصغیر میں، جو اپنے تمام تمدنی ورثے کے ساتھ، ساتویں صدی کے وسط میں جمود اور ٹھہراؤ کا شکار تھا، اسلام نئے دین، نئی تہذیب، نئے اندازِ فکر اور نئی اقدار کے ساتھ نمودار ہوا، جن کے پیچھے اسلام کی آفاقیت اور ادب و فن، تمدن و تہذیب اور معاشرتی و سیاسی اداروں کی شاندار روایات کارفرما تھیں، جو اس سرزمین کے لیے قطعاً اجنبی تھیں۔

ہندو معاشرے کی حیثیت میں مسلمانوں کے ساتھ طویل اور گہرے تعلق نے بلاشبہ انقلاب پیدا کیا۔ پانیکر کہتا ہے "اسلام نے ہندوستان میں انسانی مساوات کا وسیع تر تصور اور قانونی نظام دیا، جو کئی طرح سے مروجہ قوانین کے مقابلے میں ترقی یافتہ تھا۔"

"وہ نئی روح، جس کا مظاہرہ مذہب کے علمبرداروں اور دھرم کے عقیدت مندوں کی حیثیت سے راجپوتانہ اور وجیا نگر کے حکمرانوں نے کیا، اسلام سے براہِ راست

رابطے کا نتیجہ تھا — اسلام کی بدولت مذہبی عنصر ہندو بادشاہوں کی پالیسی میں مؤثر حیثیت اختیار کر گیا۔

مذہب کے میدان میں اسلام نے ہندو مت پر جو اثر ڈالا، وہ جیسا کہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے، زیادہ گہرا اور دُور رس تھا۔ دورِ وسطیٰ کی ہندوانہ خدا پرستی، بھگتی تحریک کا آغاز، انتہائی سخت ذات پات کے نظام میں آسانیاں اور نفس کشی اور تجرد کی مذہبی رسومات سے نجات اسلام کے اثر و نفوذ کی واضح علامات ہیں۔ دیسی اور مادری زبانوں کا علاقائی حیثیت اختیار کرنا، دراصل ان زبانوں کے مصنفین کی مسلم حکمرانوں کی طرف سے حوصلہ افزائی اور سرپرستی کا نتیجہ تھی۔

اسلامی اثرات نے انسانی تعلقات میں وسعت اور فراخدلی پیدا کر دی۔ بھگتی تحریک کے عروج اور علاقائی زبانوں کی ترقی نے اٹھارھویں صدی کی انتہا پسند ہندو تحریکوں کے آغاز میں مؤثر کردار ادا کیا۔ یہ اثرات ان میدانوں اور علاقوں میں زیادہ گہرے اور انقلاب آفریں تھے، جہاں عربوں نے تعلقات قائم کیے یا جن پر مسلمانوں کو برتری حاصل تھی۔

اسلام، جو روح و عمل کے لحاظ سے جمہوری اور اخوت و مساوات کا علمبردار ہے، ہندو معاشرے کے اعلیٰ طبقوں کے طویل استحصال کے شکار، نچلے متوسط طبقے، محنت کشوں اور دست کاروں کی توجہ اور دلچسپی کا خصوصی مرکز بن گیا۔" ان غریب ماہی گیروں، شکاریوں اور نیچی ذات کے کسانوں کے لیے اسلام ایک نیا پیغام لایا۔ اس نے انہیں خدا کا بلند تر تصور اور انسانی اخوت کا ایک بلند نظریہ دیا۔ اس نے ان کچلی ہوئی نچلی اقوام کے لیے ایک نئی معاشرتی تنظیم میں آزادانہ داخل ہونے کی راہیں کھول دیں۔" ہمارے

روحانی اور مادّی تمدن کا انحصار دو اصولوں — معاشرے کے اخلاقی تقاضوں کی شرافتوں اور دین کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر ہے۔ مسلم امرا نے اپنے پیشے کے لحاظ سے اور علما و صوفیا نے اپنے شوق، مثال اور سرپرستی سے علم کے سوتوں کو انتشار کے دوران اور جنگ کے میدان تک میں بھی کبھی خشک نہ ہونے دیا۔ ہندوستان میں تاریخ اسلام کے مطالعے اور ہندوستان کے مسلم تمدن کی ترقی میں صوفیا نے جو کردار ادا کیا، اس کا بھی ابھی پوری توجہ اور غور سے جائزہ نہیں لیا گیا۔

پروفیسر گب لکھتا ہے کہ "بارھویں صدی سے تمام علاقوں کے مسلمانوں کی زندگی سے متعلق مسائل میں صوفیا اور مشائخ کا اثر سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ صوفی تحریک کے دوران میں مسلم برادری میں زندگی کی حرارت سب سے تیز تھی۔ اسلام کی کوئی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک کہ صوفیا اور درویشوں کی تحریکوں کا اور ان کی تمام وجوہات و اثرات کا عالمانہ اور محتاط جائزہ نہ لیا جائے۔ مزید برآں یہ مطالعہ دوسرے تمام علاقوں کی نسبت اسلامی ہند کے لیے انتہائی ضروری اور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔"

دورِ وسطیٰ کے ہندوستان نے معاشرتی نظام کی ناانصافیوں، جبر و استبداد کی آمرانہ حکومت کے مظالم و مشکلات اور دیانت کے روکش فارمولوں سے وقت کے مقبولِ عام تصوف میں نجات حاصل کی۔ یہ تصوف نیک افعال، نیک عقائد پر زور دیتا اور موت و حیات کے مسائل کے بارے میں انتہائی سادہ اندازِ فکر رکھتا تھا۔ صوفیا کی تعلیمات کبھی بھی انقلابی نہیں رہیں۔ انہوں نے معاشرے یا مذہبی نظام کے بارے میں عدم اطمینان یا اضطراب کا کبھی اظہار نہیں کیا بلکہ ان کا رویہ زندگی کی بے رحمانہ

حقیقتوں اور مشکلات کے بارے میں انتہائی مسالمانہ اور فرمانبردارانہ تھا۔

دہلی اور بعض صوبائی قصبات کے عظیم صوفیا نے بادشاہوں اور ان کے درباریوں سے بڑی حد تک کنارہ کشی کی، انہوں نے مادّی حاکمیت کی سختیوں کو نرم بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ ایک طرف روشنی اور حرارت کا منبع بنے تو دوسری طرف انہوں نے ایسے معاشرے کو، جو تیزی سے منتشر ہو رہا تھا، متحد اور مربوط رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ چشتی صوفیا، کبیر، نانک اور چیتانیہ کے پیشرو بن گئے۔

برصغیر کی تمدنی زندگی کا کوئی میدان ایسا نہیں، جسے مسلم حکمرانوں اور حکمران طبقے کے دوسرے افراد کی سرپرستی حاصل نہ رہی ہو۔ تعمیراتی یادگاریں آج بھی موجودہ نسلوں کے لیے باعثِ حیرت ہیں اور ستائش پر مجبور کرتی ہیں اور ادب و فن اور تعمیر کے یورپی ماہرین بھی اس سلسلے میں مسلمانوں کی ذہانت اور تدبر کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلامی طاقت کے زوال سے قبل جو فارسی اور عربی ادب تخلیق کیا گیا، خواہ وہ سیکولر تھا یا مذہبی، اسلامی دنیا کی ادبی روایات میں اہم اور باوقار مقام کا حامل ہے۔ پاک و ہند کے مسلمانوں نے حدیث اور فقہ کے مطالعے میں نہایت اہم حصہ لیا اور تعلیم کا بلند تر معیار برقرار رکھا۔ تمدن کا اعلیٰ معیار بھی دراصل اس عمدہ تعلیمی نظام کا مرہونِ منت تھا، جو اس ملک میں موجود تھا۔ حکمرانوں اور با ممتاز امرا نے بڑی بڑی لائبریریاں قائم کیں۔ فادر مانریک کے بیان کے مطابق ۱۶۴۱ء میں آگرہ کی لائبریری ۲۴ ہزار کتابوں پر مشتمل تھی، جن کی قیمت کا تخمینہ ۶۵ لاکھ روپے کیا گیا۔ سنسکرت حتیٰ کہ یونانی اور لاطینی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا، جو کہ اس دور کے تمدن اور تہذیب کی زبان تھی۔ ہمارا تمدنی ورثہ اگرچہ فی الحقیقت اپنے خدوخال کے لحاظ سے عالمی اور

ترک و اختیار کے مسلسل عمل کا نتیجہ تھا لیکن وہ اپنی ہیئت کے لحاظ سے قومی رہا۔ میں نے ان باتوں کا تذکرہ دراصل مسلم دور کی امتیازی خصوصیات واضح کرنے کے لیے کیا ہے۔ مقامی تمدن کے تحفظ، ترقی اور تزئین نے اور تعلیم کی توسیع و ترویج نے عوام کی مادّی دولت میں اضافہ کیا، سب کو یکساں مواقع مہیا کیے اور امن و سکون کے ماحول میں جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دی۔

سچ یہ ہے کہ ابتدائی مراحل میں مسلم حکمرانوں، اولیا، صوفیا اور علما کا رویّہ اکثریتی رعایا کے سیاسی و ثقافتی چیلنج کی نوعیت کے مطابق ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ بعض نے ہندوؤں کی تمدنی اور مذہبی رسوم کے بارے میں مفاہمت اور یک جہتی کی پالیسی میں اسلام کے ہندومت میں مدغم ہو جانے کے خطرے کو بھانپتے ہوئے نظریاتی اور سیاسی طور پر اس کی سخت مذمت کی جب کہ دوسروں نے مصالحت و مفاہمت کو زندہ رہنے کا ایک ذریعہ سمجھا۔ حتیٰ کہ بعض امرا نے اورنگ زیب عالمگیر کی طرف سے جزیہ کے نفاذ کو ایک غیر دانشمندانہ فعل قرار دیا۔ یہ دونوں کوششیں ناکام رہیں اور ۱۷۰۷ء کے بعد مسلمانوں کی صلاحیتیں مسلم معاشرے کے انتشار اور سیاسی زوال کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے وقف ہو گئیں، تاکہ مسلم معاشرہ مادّی اور روحانی طور پر زندہ رہے۔ اٹھارھویں صدی کا آخر ہند مسلم تمدن کے انتہائی تخلیقی بار آور دور کا خاتمہ ثابت ہوا۔

نیا پاکستانی تمدّن کیا صورت اختیار کرتا ہے؟ یہ کہنا مشکل ہے۔ اب تک اس کے سامنے انتخاب اور اخذ کا سوال ہے۔ بظاہر یہ نیا تمدن بے روح ہے اور نقالی پر مبنی ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ غیر منظم، ذہنی طور پر گھٹے ہوئے اور اقتصادی طور پر غیر

متوازن دانشور خود غرض نو دولتیوں کے سامنے اپنا چراغ نہیں جلا سکیں گے۔

اسلوب کے لحاظ سے ہمارے تمدن پر اب تک امرا کی اجارہ داری ہے، جو خود کو دیہات میں زندگی گزارنے والے عوام یا گندی آبادیوں میں زندگی بسر کرنے والے محنت کش طبقے سے الگ تھلگ سمجھتے ہیں۔ اس نے ان کے لیے اپنے اردگرد کی عام طبقاتی زندگی میں حصہ لینا مشکل بلکہ ناممکن بنا دیا ہے۔ لوتھر کہتا ہے کہ ”کسی قوم کی خوشحالی کا انحصار ٹیکسوں کی کثرت یا قلعوں کی مضبوطی یا سرکاری عمارتوں کی خوبصورتی پر نہیں ہے بلکہ محنتی شہریوں، تعلیم یافتہ، باشعور اور صاحب کردار افراد پر ہے۔“

ایک بہتر اور تخلیقی زندگی کے لیے ایک نئی تعلیمی پالیسی کی ضرورت ہے، جو اسلام کی اخلاقی اقدار پر مبنی ہو اور جس میں ہر سطح کے اساتذہ سے عمدہ سلوک کیا جائے اور جو نئی نسلوں میں اپنے ماضی سے محبت کا جذبہ پیدا کر سکیں۔ اس عالمی اصول کو کہ ”اپنے آپ کو پہچانو“ ایک ذمے داری کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔ جب لوگ اسے بھول جاتے ہیں تو اپنی روح سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اچھی نصابی کتب اور زیادہ مطمئن اور مشنری جذبے کے حامل اساتذہ ہی اندازِ فکر کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

پاکستان ایک تصور اور خواب کی تعبیر کے طور پر وجود میں آیا اور اس کے لیے ہمیں ناقابلِ بیان مصائب اور قربانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ طرزِ زندگی، جسے اختیار کرنے کی ہمیں امید تھی اور وہ عمارت جو ہم تعمیر کرنا چاہتے تھے، ابھی تک ہماری کوششوں اور حصولِ نصب العین کے لیے انتھک جد و جہد کے منتظر ہیں۔ ”ہماری نسل موعودہ سرزمین میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکی۔ البتہ اگر ہماری محنتیں ہمارے بچوں کو اس راہ پر ڈال سکیں، جو اس منزل کی طرف جاتی ہے تو یہی ہمارے لیے غنیمت ہے۔“

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آمد اور تبلیغ دین

پروفیسر محمد اسلم

عرب و ہند کے تجارتی تعلقات زمانۂ قدیم سے چلے آتے ہیں اور زمانۂ قبل از اسلام میں عربوں کے تجارتی جہاز جنوبی ہند کی بندرگاہوں میں رکتے ہوئے جزائر شرق الہند تک جایا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں بحرین کے گورنر عثمان بن ابی العاص الثقفی کے بھائی حکم بن ابی العاص نے بحری بیڑا تیار کر کے تھانہ اور بھڑوچ پر حملے کئے[1]۔ ان کے ایک دوسرے بھائی مغیرہ نے دیبل پر بڑا کامیاب حملہ کیا[2]۔ مسلمانوں کو چونکہ بحری جنگوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے حضرت عمر فاروقؓ نے بحری جنگوں کی مخالفت کی اور بحرین کے گورنر کو لکھا کہ وہ آیندہ اس طرح کی غلطی کا ارتکاب نہ کرتے[3]۔ علامہ بلاذری لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ سندھ میں بڑی دلچسپی لیتے تھے اور وہ وہاں کے حالات سے بخوبی واقف تھے[4]۔ امیر معاویہ کے جرنیل المہلب نے متعدد بار سندھ کے سرحدی شہروں پر حملے کئے لیکن انہیں سرحدی جھڑپوں سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔ اموی عہد میں سندھ کے حکمران راجہ داہر نے مکران کے گورنر سعید بن اسلم کو قتل کر کے

[1] علامہ بلاذری، فتوح البلدان مطبوعہ قاہرہ ۱۹۳۲ء ص ۴۲۰۔
[2] سید سلیمان ندوی، عربوں کی جہازرانی مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۳۵ء ص ۵۹۔
[3] علامہ بلاذری، فتوح البلدان مطبوعہ قاہرہ ۱۹۳۲ء ص ۴۲۰۔
[4] ایضاً

عربوں کی مخالفت مول لے لی۔ چند سال بعد جب سندھی قزاقوں نے عربوں کے چند جہاز لوٹ لئے تو مجبوراً عربوں کو سندھ پر حملہ کرنا پڑا۔

حجاج بن یوسف نے جو مملکت اسلامیہ کے مشرقی صوبوں کا گورنر جنرل تھا، اپنے داماد اور بھتیجے محمدؒ بن قاسمؒ کو فوج دے کر سندھ روانہ کیا اور اس نوجوان فاتح نے سندھیوں کے دلوں پر اپنی تلوار کی دھاک بٹھا دی۔ محمد بن قاسم کا مقصد محض کشور کشائی نہ تھا، اس لئے وہ جہاں بھی گیا اس نے تبلیغ اسلام کو بڑی اہمیت دی۔ میر محمد معصوم بھکری کی روایت کے مطابق سب سے پہلے سندھ کی چنہ قوم نے اسلام قبول کیا[1]۔ علامہ بلاذری لکھتے ہیں کہ محمد بن قاسم نے دیبل کی فتح کے بعد وہاں چار ہزار مسلمان آباد کئے اور ایک مسجد تعمیر کروائی[2]۔ اسی طرح محمد بن قاسمؒ نے داہر کے دارالحکومت ارور کی فتح کے بعد وہاں بھی ایک مسجد بنوائی[3]۔ میر محمد معصوم بھکری کی روایت ہے کہ محمد بن قاسم نے مال غنیمت کے خمس سے ہر شہر اور قصبے میں مساجد تعمیر کروائیں[4]۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم نے ان مساجد کو آباد رکھنے کے لئے پورے سندھ میں مسلمان آباد کئے تھے۔

عمر بن عبدالعزیز کو تبلیغ اسلام کا بڑا خیال تھا چنانچہ انہوں نے سندھی امیروں کے نام خط تحریر فرمائے جن میں انہیں دعوتِ اسلام دی گئی تھی۔ ان کی اس دعوت پر جو سندھی امرا مشرف باسلام ہوئے ان میں راجہ داہر کا فرزند جے سنگھ خاص طور پر قابل ذکر ہے[5]۔ عمر بن عبدالعزیز کو سندھی نومسلموں کی تربیت کا اتنا خیال تھا کہ انہوں

[1] میر معصوم بھکری، تاریخ سندھ مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۸ء ص ۲۳
[2] علامہ بلاذری، فتوح البلدان مطبوعہ قاہرہ ۱۹۳۲ء ص ۴۲۵
[3] ایضاً ص ۴۲۷۔
[4] میر محمد معصوم بھکری، تاریخ سندھ مطبوعہ مصر ۱۹۳۸ء ص ۲۴۰
[5] علامہ بلاذری، فتوح البلدان مطبوعہ قاہرہ ۱۹۳۲ء ص ۴۲۹

نے اہم شہروں کی مساجد میں جید علما کو خطیب بنا کر بھیجا۔ جب مشہور سیاح ابن بطوطہ اپنی سیاحت کے دوران سیہون آیا تو وہاں کے خطیب نے اسے عمر بن عبدالعزیز کا وہ فرمان دکھایا، جس میں اس کے جدِ اعلیٰ الشیبانی کو جامع مسجد سیہون کا خطیب مقرر کرنے کا ذکر تھا۔[1]

سندھ میں تبلیغ اسلام کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ کے مدارس کھل گئے اور پورے ملک میں علوم اسلامیہ کا چرچا ہونے لگا۔ ابو حفص ربیع بصری کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے۔ آپ امام حسن بصریؒ کے شاگرد تھے اور بڑے ثقہ محدث تسلیم کئے جاتے ہیں اور ان کے شاگردوں میں امام سفیان ثوری اور وکیع جیسے فضلائے دہر کے نام آتے ہیں۔ انہوں نے سندھ میں احادیث نبویؐ کا درس جاری کیا۔[2] ابو حفص ربیع جیسے بزرگوں نے جو شمع علم سندھ میں روشن کی تھی، اس کی ضو سے پورا سندھ روشن ہو گیا اور سندھ نے بڑے نامی گرامی علما پیدا کئے۔

ابو معشر سندھی کا شمار ان محدثین میں ہوتا ہے جنہوں نے بغداد جا کر عربوں کو حدیث نبویؐ کا درس دیا۔ خلیفہ بغداد کے ہاں ان کی اتنی قدر و منزلت تھی کہ جب ان کا انتقال ہوا تو اُن کی نماز جنازہ خود خلیفہ نے پڑھائی۔[3] اسی طرح سندھ نے ابو عطا سندھی جیسا قادر الکلام شاعر پیدا کیا جس کے قصائد نے عربی ادب کی مشہور کتاب الحماسہ میں عربی شعرا کے قصائد کے ساتھ جگہ پائی۔[4] اسی عہد میں ابو علی

---

[1] ابن بطوطہ، عجائب الاسفار، جلد دوم مطبوعہ قاہرہ ۱۲۸۷ھ ص ۵
[2] رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۹۴ء، ص ۳
[3] Muhammad Aslam: Muslim News Internation, London Feb. 1963, P. 33
[4] ابی تمام حبیب: دیوان الحماسہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء، ص ۲۲

سندھی نام کے ایک بڑے عابد و زاہد بزرگ ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور صوفی بایزید بسطامی نے ان سے تصوف کی تعلیم پائی تھی۔ یاقوت الحموی کی روایت کے مطابق ایک اور سندھی فاضل ابو جعفر محمد بن اسمٰعیل دیبلی مکہ مکرمہ میں جا بسے تھے، ان کا شمار بھی محدثین میں ہوتا ہے۔ ان کے ایک بیٹے ابراہیم کا نام بھی حدیث کے راویوں میں آتا ہے۔ یہ دونوں باپ بیٹا مکہ مکرمہ میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے اور ان کی سند سے عرب محدثین حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔[1] غرض یہ کہ دیکھتے ہی دیکھتے دیبل سے لے کر ملتان تک اسلامی تہذیب و تمدن کی جڑیں بڑی مضبوط ہو گئیں۔

شہرۂ آفاق مورخ اور جغرافیہ نویس المقدسی جب احسن التقاسیم لکھنے بیٹھا تو ان دنوں ملتان کے نواحی قصبات میں حنفی بڑی تعداد میں موجود تھے اور لوگ صلاح و تقویٰ سے آراستہ تھے۔[2] ابن حوقل نے سندھ کے شہر بلری میں "صالح الحال" لوگوں کی موجودگی کی نشاندہی کی ہے۔[3] البلاذری نے "ملتان، کابل اور قشمیر" کے درمیان ایک شہر عسیفان کا ذکر کیا ہے۔ وہاں کے ہندو راجہ کا فرزند بیمار پڑا اور اس کی زندگی کے لالے پڑ گئے۔ اس نے اپنے پروہتوں سے دعا کے لئے التماس کی۔ انہوں اپنے معبود کے سامنے شہزادے کی صحت یابی کے لئے دعا کی جو بے اثر ثابت ہوئی اور شہزادہ راہیٔ ملک بقا ہوا۔ راجہ نے خفا ہو کر اپنی سلطنت کے تمام بت مسمار کر دیئے اور مسلمان تاجروں کو بلا کر ان کے سامنے اسلام قبول

---

[1] یاقوت الحموی، معجم البلدان جلد چہارم، مطبوعہ مصر ۱۹۰۶ء ص ۱۱۸
[2] المقدسی، احسن التقاسیم، مطبوعہ لندن ۱۸۷۷ء ص ۴۸۱
[3] ابن حوقل، کتاب صورۃ الارض، جلد دوم مطبوعہ لیدن ۱۹۳۹ء ص ۳۲۳

کرلیا۔ علامہ بلاذری لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ خلیفہ معتصم باللہ کے عہد میں وقوع پذیر ہوا تھا۔[1]

عرب تاجروں کی مساعیٔ جمیلہ سے گجرات میں بھی اسلامی اثرات نفوذ کرنے لگے تھے۔ یاقوت الحموی، الاصطخری اور ابن حوقل رقمطراز ہیں کہ ساحل گجرات پر چیمور نام کی ایک بندرگاہ تھی جہاں بلہرا نامی ایک ہندو راجہ حکمران تھا۔ بلہرا کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ بہت اچھا تھا اور عرب تجار اس کی مملکت میں آباد ہونے لگے تھے[2]۔ جب ۹۱۶ء میں مسعودی بغرض سیاحت چیمور آیا تو وہاں دس ہزار کے لگ بھگ عرب اور مخلوط النسل مسلمان آباد تھے[3]۔ مسلمانوں نے بلہرا کی مملکت میں مساجد تعمیر کرلی تھیں، جہاں پانچوں وقت اذان ہوا کرتی تھی۔ مسعودی نے گجرات کے متعدد ساحلی مقامات پر مسلمانوں کی موجودگی کی نشاندہی کی ہے۔ وہ جہاں بھی گیا اس نے مسلمانوں کو فارغ البال اور مرفہ الحال پایا۔

چیمور سے کچھ آگے سندان نام کے ایک شہر کا ذکر ملتا ہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری لکھتے ہیں کہ سندان موجودہ مہاراشٹر اور گجرات کے درمیان بمبئی سنٹرل ریلوے اسٹیشن سے شمال کی طرف ۱۴۵ کیلومیٹر اور سورت سے جنوب کی طرف ۱۱۸ کیلومیٹر پر ایک معمولی اسٹیشن ہے۔ قدیم عرب جغرافیہ نویس اور مورخ اسے سندان لکھتے ہیں مگر آج کل مقامی زبان میں اسے سنجان کہا جاتا ہے۔ ابوالفضل نے بھی آئینِ

---

۱ علامہ بلاذری، فتوح البلدان مطبوعہ قاہرہ ۱۹۳۲ء ص ۴۲۳

۲ (۱) یاقوت الحموی، معجم البلدان جلد پنجم، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۰۶ء ص ۴۰۶

(۲) الاصطخری، المسالک والممالک، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۱ء ص ۱۰۴

(۳) ابن حوقل، کتاب صورۃ الارض جلد دوم مطبوعہ لیدن ۱۹۳۹ء ص ۳۲۰

۳ سید سلیمان ندوی، عربوں کی جہازرانی، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۳۵ء ص ۸۱

اکبری میں سنجان ہی لکھا ہے اور اسے جھالہ وارہ کلاں کا پرگنہ بتایا ہے۔ قدیم زمانے میں یہ بلاد ہند کا مشہور شہر اور بندرگاہ تھا اور یہاں بحری تجارت کی عالمی منڈی تھی[1] جب علامہ بلاذری فتوح البلدان لکھنے بیٹھے تو انہیں معلوم ہوا کہ وہاں کی جامع مسجد میں مامون الرشید کے لئے دعا مانگی جاتی ہے[2]

ڈاکٹر تاراچند کی تحقیق کے مطابق بمبئی کے نواح میں چاول، کلیان اور سوپارہ میں ظہور اسلام سے قبل عربوں کی آبادی کا سراغ مل گیا ہے[3]۔ ظہور اسلام کے بعد ساحل مالابار پر ایک عربی النسل قوم نوائت آباد ہوئی جن کا پیشہ جہازرانی تھا[4]۔ جنوبی ہندوستان کے ساحل پر اسلام کی تبلیغ اور علوم اسلامیہ کی اشاعت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ڈاکٹر تاراچند نے کولم میں عربوں کے ایک قدیم ترین قبرستان کا سراغ لگایا ہے، جہاں علی بن عثمان نامی ایک شخص کی قبر پر ۱۶۶ھ کا ایک کتبہ نصب ہے[5]۔ اسی طرح بمبئی کے قریب تھانہ میں بھی مسلمان قدیم الایام سے آباد ہیں۔ جب ۱۸۸۲ء میں گزیٹیئر آف تھانہ ڈسٹرکٹ مرتب ہوا تو وہاں ۸۰۰ سال کی پرانی قبریں موجود تھیں[6]۔ اسی طرح ساحل مالابار پر موپلہ قوم بھی قدیم الایام سے آباد ہے۔ یہ لوگ جہاز راں تھے اور مصر و عرب اور ہندوستان کے درمیان تجارت کرتے تھے[7]۔ ابن بطوطہ نے ساحل مالابار پر چودھویں صدی کے نصف اول میں سفر کیا تھا اور یہ بات

---

۱ اطہر مبارکپوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۷ء ص ۵۳

۲ علامہ بلاذری، فتوح البلدان، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۳۲ء ص ۴۳۲

۳ تاراچند، تمدن ہند پر اسلامی اثرات، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء ص ۵۵

۴ سید سلیمان ندوی، عربوں کی جہازرانی، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۳۵ء ص ۹

۵ تاراچند، تمدن ہند پر اسلامی اثرات، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء ص ۵۹

۶ گزیٹیئر آف تھانہ ڈسٹرکٹ، مطبوعہ بمبئی ۱۸۸۲ء ص ۲۰۳

۷ سید سلیمان ندوی، عربوں کی جہازرانی، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۳۵ء ص ۱۷۲

اس کے اطمینان کا باعث تھی کہ پورے علاقے میں مسلمانوں کی بستیاں موجود تھیں، جہاں وہ خوشحالی اور فارغ البالی سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب تک اس علاقے پر پرتگیزوں نے قبضہ نہیں کیا تھا، ساحل مالابار پر مسلمان چھائے ہوئے تھے[1]

جنوبی ہندوستان کا مشرقی ساحل "معبر" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہاں عرب ساتویں صدی میں آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ عربوں کے تجارتی جہاز جو عرب اور جزائر شرق الہند کے درمیان سامان لایا اور لے جایا کرتے تھے، وہ اکثر یہاں لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر تارا چند کی تحقیق کے مطابق یہاں بھی مسلمان بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے[2]۔ جب دکن کی ہندو ریاست وجیانگر نے ان مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر دی تو وہ اس علاقے سے ہجرت کر کے جزائر شرق الہند چلے گئے۔ آج جنوب مشرقی ایشیا میں جتنے مسلمان نظر آتے ہیں یہ انہی مہاجروں کی تبلیغ کا نتیجہ ہیں جو ساحل معبر سے وہاں جا کر آباد ہوئے تھے۔

برصغیر پاک و ہند میں قدم جماتے ہی بزرگان دین نے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا کام شروع کر دیا تھا۔ المقدسی کی ملاقات منصورہ میں قاضی ابا محمد المنصوری سے ہوئی تھی۔ موصوف امام داؤد ظاہری کے پیرو تھے اور ان کے مسلک کی حمایت میں انہوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں[3]۔ سلطان محمود کے لاہور پر قبضہ سے بہت پہلے یہاں اسمٰعیل بخاری تفسیر اور حدیث کا درس دیا کرتے تھے[4]۔ مخدوم علی ہجویریؒ نے یہیں اپنی شہرۂ آفاق تصنیف کشف المحجوب تحریر کی تھی۔

---

[1] سید سلیمان ندوی، عربوں کی جہاز رانی مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۳۵ء ص ۱۶۲

[2] تارا چند، تمدن ہند پر اسلامی اثرات، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء ص ۵۱

[3] المقدسی، احسن التقاسیم، مطبوعہ لیڈن ۱۸۷۷ء ص ۴۸۱

[4] مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، مطبوعہ لاہور ۱۲۸۴ھ ص ۸۸۲

سلطنت دہلی کے قیام سے پہلے لاہور میں مولوی اسحاق کا مدرسہ بہت مشہور تھا، جہاں سے سلطان سخی سرور جیسے کامیاب مبلغ فارغ التحصیل ہو کر نکلے تھے[1]۔ حسن صغانی لاہوری صاحب مشارق الانوار کا شمار دنیائے اسلام کے نامور علما میں ہوتا ہے۔ موصوف عربی لغت کے امام مانے جاتے ہیں اور عرب بھی ان کے کمال فن کے معترف ہیں۔ ناصر الدین قباچہ نے ملتان میں ایک مدرسہ بنوایا تھا، جہاں علامۂ روزگار قطب الدین کاشانی درس دیا کرتے تھے[2]۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ ملتانی نے ایک چھوٹے سے گاؤں کوٹ کروڑ میں ایک قاری سے ساتوں قرأتوں میں قرآن پڑھنا سیکھا تھا۔ حضرت زکریاؒ کی خانقاہ اپنے زمانہ میں علم و ادب کا گہوارہ سمجھی جاتی تھی۔ سید امیر حسینی نے اسی جگہ نزہت الارواح، زاد المسافرین، اور کنز الرموز جیسی کتابیں تحریر فرمائی تھیں[3]۔ فخر الدین عراقی جیسے قادر الکلام شاعر نے اپنی زندگی کے بیس سال اسی خانقاہ میں بسر کیے تھے۔ التتمش کے عہد میں بخارا کے ایک عالم ابو توامہ حنبلی نے سنار گاؤں میں سکونت اختیار کر لی اور اس شہر کو علم حدیث کا مرکز بنا دیا[4]۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے پاس ایک بہت اچھا کتب خانہ تھا اور آپ کا ایک مرید کتابوں کی نقلیں تیار کرنے پر مامور تھا[5]۔

---

[1] Muhammad Aslam: Muslim News Internation, London Feb. 1963, P. 34

[2] ہندو شاہ فرشتہ، تاریخ فرشتہ، جلد دوم مطبوعہ بمبئی ۱۸۳۲ء ص ۴۹۶

[3] ایضاً ص ۴۳

[4] Muhammad Ishaq: India's Contribution to The Study of Hadith Literature, Dacca 1955, P. 53-54

[5] Prof. Sh. A. Rashid: Historians of India, Pakistan and Ceylon, London 1960, P. 135

آمدم برسرِ مطلب۔ شمالی ہندوستان میں تبلیغ کا فریضہ صوفیائے کرام نے انجام دیا۔ ان بزرگوں میں سے خواجہ معین الدین اجمیریؒ بڑے کامیاب مبلغ ثابت ہوئے۔ انہوں نے راجستھان کے قلب میں اسلام کی شمع روشن کی جس کی ضو سے پورے ہندوستان سے ظلمت کی گھٹائیں چھٹ گئیں۔ پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں کہ آپ اجمیر جاتے ہوئے دہلی میں کچھ عرصے کے لئے ٹھہرے تھے اور اس مختصر سے قیام میں ہی سات سو کافروں کو مشرف باسلام کر گئے۔[1] ان کے خلفاء نے راجستھان کے متعدد شہروں میں تبلیغی مرکز قائم کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس دیارِ کفر میں ناگور، سوالے اور کھاٹو جیسی خالص مسلمانوں کی بستیاں وجود میں آگئیں۔

شمالی بنگال اور آسام میں تبلیغ اسلام کا فریضہ شیخ جلال الدین تبریزیؒ اور شاہ جلال مجرد سلہٹیؒ نے انجام دیا۔ موخر الذکر بزرگ سات سو مریدوں کے ساتھ بنگال میں داخل ہوئے اور انہوں نے سلہٹ کے ہندو حکمران گوڑ گوبند کو شکست دے کر سلہٹ میں قیام فرمایا۔ آپ کے سوانح نگار عبدالجلیل بسمل رقمطراز ہیں کہ آپ جو علاقہ فتح کرتے وہ ایک مرید کی نگرانی میں دے کر خود آگے بڑھ جاتے اور وہ مرید اس علاقے میں تبلیغ دین کا فرض پورا کرتا۔ آپ نے اپنے تمام ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ شادیاں کریں تاکہ اس علاقہ میں مسلمان آبادی میں اضافہ ہو۔[2] آپ کے مریدوں نے پورے بنگال اور آسام میں تبلیغی کاموں میں بڑی سرگرمی دکھائی اور غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد کو مشرف باسلام کیا۔

لاہور میں جن دنوں ابھی ہندوؤں کی حکومت تھی، بخارا سے شیخ اسمٰعیل نام کے

[1] Arnold, T. : The Preaching of Islam, Lahore 1956, P. 281

[2] عبدالجلیل بسمل، تذکرہ شیخ سید جلال مجرد کنیاؒ، مطبوعہ سلہٹ ۱۹۶۷ء، ص ۹۲

ایک بزرگ یہاں آکر مقیم ہو گئے۔ مفتی غلام سرور رقمطراز ہیں کہ وہ جمعہ کے روز وعظ کہا کرتے تھے اور ان کا وعظ اتنا پُرتاثیر ہوتا تھا کہ سینکڑوں کی تعداد میں غیر مسلم کلمہ توحید پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو جایا کرتے تھے۔ آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے لاہور میں تفسیر اور حدیث کا درس جاری کیا۔[3]

حضرت اسمٰعیل بخاری کے بعد لاہور میں سید علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ تشریف لائے۔ آپ کی توجہ سے لاہور کا ایک نامی گرامی جوگی اپنے چیلوں سمیت مشرف باسلام ہوا۔ آپ نے لاہور میں ہی کشف المحجوب قلمبند فرمائی، جو تصوف کے موضوع پر فارسی زبان میں اولین کتاب ہے۔

بلخ کے مشہور صوفی ابو اسحٰق گازرونی کے بھتیجے شیخ صفی الدین گازرونی (م ۱۰۰۰ء) سلطان محمود غزنوی کی تخت نشینی سے بھی پہلے سابق ریاست بہاولپور کے مشہور رُوحانی مرکز اوچہ میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ ان کی تبلیغی کوششوں سے بہت سے غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔[4] ان کی وفات کے تقریباً ایک صدی بعد شاہ یوسف گردیزی نے ملتان کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ ان کی سعی وکاوش بارآور ہوئی اور ان کے ہاتھ پر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

سلطنت دہلی کے قیام سے قبل پنجاب میں سلطان سخی سرورؒ نے بڑا کام کیا تھا۔ اور آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی پنجاب کے جاٹوں پر ان کا اثر نمایاں ہے۔[5] جنوب مغربی پنجاب میں حضرت بہاؤالدین زکریاؒ بڑے کامیاب مبلغ ہو گزرے ہیں۔

[3] مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، مطبوعہ لاہور ۱۲۸۴ھ، ص ۸۸

[4] بہاولپور سٹیٹ گزیٹیر، مطبوعہ لاہور ۱۹۰۸ء، ص ۳۹۰

[5] شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۹۳

ان کی سعی و کاوش سے بہت سی غیر مسلم قومیں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں جن میں کھچی قوم قابلِ ذکر ہے۔[1] آپ کے ایک مرید حضرت موسٰی نواب نے چھک اور اندھرار نام کے دو قبیلے مسلمان کئے۔[2] اسی طرح آپ کے ایک مرید سید جلال بخاری نے چدھڑ، سیال، داہر اور وارن نامی ہندو قوموں کو مسلمان کیا۔[3] ان کے پوتے مخدوم جہانیاںؒ سید جلال الدینؒ جہانگشت کے ہاتھ پر کھرل قوم مشرف باسلام ہوئی۔ منج راجپوتوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انہیں سلطان فیروز تغلق کے عہد میں مخدوم جہانیاںؒ نے مسلمان کیا تھا۔[4] اسی طرح ارائیں قوم کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ انہیں بھی مخدوم جہانیاں نے ہی صراطِ مستقیم پر لگایا تھا۔

حضرت بہاء الدینؒ کے پوتے شاہ رکن العالم کے مرید شیخ حمید الدین حاکم نے مؤ مبارک کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ سکھر اور اوچ کے درمیانی علاقے میں ان کی سعی و کاوش سے بہت سے گمراہوں نے راہ ہدایت پائی۔[5] گزیٹیر آف ملتان ڈسٹرکٹ کی روایت ہے کہ مخدوم محمد غوث اُچی کے ایک مرید مخدوم شیر شاہ نے سوا لاکھ کے قریب غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا تھا۔[6]

بابا فرید الدین گنج شکرؒ بھی بڑے کامیاب مُبلّغ ثابت ہوئے اور ان کی کوششوں سے پنجاب کے بہت سے غیر مسلم قبائل نے اسلام قبول کیا۔ وٹو، سیال اور ٹوانے

---

[1] Gazetteer of Montgomery District, Lahore 1884, P. 66
[2] District Gazetteer of Bahawalpur State, Lahore 1908, P. 169
[3] Ibid, P. 160
[4] Gazetteer of Montgomery District, Lahore 1884, P. 62
[5] District Gazetteer of Bahawalpur State, Lahore 1908, P. 167
[6] Gazetteer of Multan District, Lahore 1884, P. 54-55

آپ ہی کی تبلیغ سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے۔[1] بعض حضرات کے خیال میں جنوبی پنجاب کے غیر مسلموں کو مسلمان کرنے میں آپ کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔[2] بابا صاحب کے ایک پوتے شیخ تاج الدین نے بیکانیر کے علاقے میں متعدد راجپوت قبائل کو مسلمان کیا جس کی وجہ سے غیر مسلم راجپوت ان کے درپئے آزار ہوئے۔[3] تقسیم ملک سے قبل پانی پت کے نواح میں جو مسلمان راجپوت آباد تھے، ان کا کہنا تھا کہ ان کے مورثِ اعلیٰ امیر سنگھ کو حضرت بو علی قلندرؒ نے مشرف باسلام کیا تھا۔[4]

دکن کا علاقہ سلطان علاء الدین خلجی اور اس کے نامور جرنیل ملک کافور کی توجہ کا خاص مرکز بنا رہا۔ ان دونوں نے دکن میں جو معرکے سر کئے، ان سے دکن کے قلب میں تبلیغ اسلام کے راستے کھل گئے اور بہت سے صوفیائے کرام نے شمالی ہندوستان کی سکونت ترک کر کے دکن کو اپنا مسکن بنایا۔ انہی ایام میں سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ نے دکن میں تبلیغ اسلام پر خصوصی توجہ دی۔ آپ نے اپنے ایک جلیل القدر خلیفے حضرت برہان الدین غریب کو چار سو درویشوں کے ہمراہ تبلیغ اسلام کے لئے دکن بھیجا۔[5] سلطان المشائخ کے جانشین حضرت نصیر الدینؒ چراغ دہلی کے خلیفے حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ نے بھی گلبرگہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

---

[1] Gazetteer of Montgomery District, Lahore 1884, P. 63-64
[2] Ibid, P. 184
[3] Ibbetson & Maclagan : A Glossary of Tribes & Castes of the Punjab and N.W.F.P., Lahore 1919, Vol. I, P. 533
[4] Arnold, T. : The Preaching of Islam, Lahore 1956, P. 282
[5] شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۲۱۲

آپ کی سعی و کاوش سے اضلاع پونا و بلگام میں کفار کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا[1]

جن دنوں صوفیائے کرام دکن پر خصوصی توجہ دے رہے تھے، انہی ایام میں سلطان محمد بن تغلق کے دل میں بھی دکن میں تبلیغ اسلام کا خیال آیا۔ اس نے دکن میں اسلام کا ایک مضبوط مرکز قائم کرنے کے ارادے سے دولت آباد کو پایۂ تخت بنایا۔ دولت آباد کی ٹکسال میں اس نے جو سکے مضروب کئے ان پر قبۃ الاسلام اور دارالاسلام کے الفاظ منقوش ہیں، جو خصوصی توجہ کے مستحق ہیں[2]۔ سلطان کے دل میں تبلیغ اسلام کا جو جذبہ پایا جاتا تھا، اس کی عکاسی اس واقعہ سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ ایک بار اس نے حضرت سلطان المشائخ کے مرید شمس الدین یحییٰ کو بلا کر یہ کہا کہ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تجھ جیسا عالم بیکار پڑا ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ کشمیر جا کر کسی بت خانے میں ڈیرہ لگاؤ اور اس دیار کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دو[3]۔

سلطان محمد بن تغلق کے جانشین سلطان فیروز تغلق نے بھی تبلیغ اسلام میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ سلطان اپنی تالیف "فتوحات فیروز شاہی" میں رقمطراز ہے۔

> ہمیں توفیق ملی کہ ذمیوں کو دین ہدیٰ کی طرف رغبت دلائیں۔ ہم نے یہ اعلان کیا کہ کافروں میں سے جو بھی کلمۂ توحید پڑھ کر دین اسلام قبول کریگا، جیسا کہ شریعتِ محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں آیا ہے، اس سے جزیہ ہٹا لیا جائے گا۔ یہ آواز سب کے کانوں تک پہنچا دی اور

[1] Arnold, T. : The Preaching of Islam, Lahore 1956, P. 271

[2] Thomas, E : The Chronicles of the Pathan Kings of Dehli, London 1871, P. 208-209

[3] امیر خورد کرمانی، سیرالاولیا، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ورق ۱۳۷ ب۔

ہندوؤں نے فوج در فوج اور گروہ در گروہ آکر اسلام قبول کیا اور اسی طرح آج تک وہ ہر طرف سے آکر ایمان لاتے ہیں[1]

بسا اوقات ایسے مواقع اتفاقیہ پیش آگئے کہ کسی بزرگ کے ہاتھ پر صدہا غیر مسلم کفر و شرک سے تائب ہو گئے۔ جب جہانگیر نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو قلعہ گوالیار میں محبوس کیا تو اس کی سعی و کاوش سے صدہا قیدی مشرف باسلام ہوئے[2]۔ جب وہ قیدی اپنی سزا بھگت کر رہا ہوئے تو ان کی اکثریت سرہند میں مجدد صاحب کے قرب میں جا بسی۔ پانچ پشتیں گزرنے کے بعد جب صاحبزادہ کمال الدین محمد احسان روضۃ القیومیہ لکھنے بیٹھے تو ان نومسلموں کی اولاد ہنوز سرہند میں موجود تھی[3]۔

مسعود سالار غازی کے دم قدم سے بہرائچ اضلاع پورب میں ایک اہم روحانی مرکز بن گیا تھا جب ۱۹۰۳ء میں ایچ۔ آر۔ نیول ڈسٹرکٹ گزیٹیر آف بہرائچ لکھنے بیٹھے تو ان دنوں صرف ضلع بہرائچ میں ۲۷۷۴ مسلمان بنجے آباد تھے[4]۔ بہرائچ کے علاوہ پورے ہندوستان میں اور کسی جگہ مسلمان بنجے نہیں ملتے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کے آباو اجداد کو کس بزرگ نے مسلمان کیا تھا۔

کشمیر میں حضرت بلبل شاہ اور امیر کبیر سید علی ہمدانی کی کوششوں سے بہت بڑی تعداد میں لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور آج وادی کشمیر میں جو مسلمانوں کی اکثریت ہے، یہ انہی بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ عمل صالح میں محمد صالح کنبو

[1] محمد اسلم فتوحات فیروز شاہی (اردو ترجمہ) مشمولہ تاریخی مقالات، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء ص ۱۹۹

[2] Arnold, T: The Preaching of Islam, Lahore 1956, P. 412

[3] کمال الدین محمد احسان، روضۃ القیومیہ، رکن اول، مطبوعہ لاہور ۱۳۳۵ھ ص ۱۹۱-۱۹۳

[4] Navill, H. R. : District Gazetteer of Bahraich, Allahabad 1903, P. 74

لکھتا ہے کہ کشمیر کے سفر کے دوران جب شاہجہان بھمبر پہنچا تو اُسے معلوم ہُوا کہ اس جگہ بہت سے ہندوؤں نے مسلمان عورتوں سے شادی کی ہوئی ہے۔ یہ سُنتے ہی بادشاہ نے حکم دیا کہ جن غیر مسلموں نے مسلمان عورتوں سے شادی کی ہوئی ہے، وہ مسلمان ہو جائیں ورنہ ان عورتوں کو ان سے الگ کر دیا جائے۔ محمد صالح کی روایت ہے کہ اس موقع پر بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔[1]

ضلع لدھیانہ کے جاٹ اور ضلع جالندھر کے گوجر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں مشرف باسلام ہوئے۔[2] برصغیر پاک و ہند میں تبلیغ کا سلسلہ اورنگزیب عالمگیر کے عہد تک جاری رہا۔ اورنگ زیب کے بعد علما اور صوفیا کی توجہ غیر مسلموں میں تبلیغ کی بجائے مسلمانوں کی اصلاح کی طرف مبذول رہی۔ البتہ بنگال میں سید احمد بریلوی کے خلفا نے تبلیغ کا کام بڑی شد و مد سے جاری رکھا۔ انگریزی عہد میں اکا دکا مسلمان انفرادی طور پر تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آرنلڈ نے پریچنگ آف اسلام میں ان میں سے اکثر کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] محمد صالح کنبوہ، عمل صالح، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء، جلد دوم، ص ۵۳

[2] (i) District Gazetteer of Ludhiana, Lahore 1907, P. 56

(ii) District Gazetteer of Jullundur, Lahore 1908, P. 87

پاکستان کا قیام

ڈاکٹر محمد اسلم قریشی

قیام پاکستان کی غرض وغایت

جونہی پاکستان قائم ہوا، اس کے قیام کے جواز میں نئے نئے نظریات نمودار ہونے لگے۔ قیام پاکستان سے پہلے بھی اس کی غرض وغایت کی مختلف اور متضاد توجیہات کی گئیں۔ حصولِ پاکستان کی جدوجہد کے دوران ہندو یہ الزام تراشی کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو برطانیہ کی پُشت پناہی حاصل ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ برطانیہ ایسا اس لیے کر رہا ہے کہ وہ اپنی "نفاق کے ذریعے حکومت" کی پالیسی کے بل پر اپنی حکومت کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ ان کے نزدیک پاکستان "نفاق کے ذریعے حکومت" کی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ اس پروپیگنڈے کے مقاصد یہ تھے:۔

۱۔ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت پیدا کرنا۔

۲۔ انگریزوں کا ساتھ دے کر وہ بالآخر ان کے جانشین بننا چاہتے تھے۔

انگریزوں کے لیے یہ صورتِ حال خاصی پریشان کن تھی۔ انہیں اپنے دفاع میں اس الزام کی تردید کرنی پڑی۔

اس نظریے کی اپنے ہی بیان سے بیخ کنی ہوتی ہے۔ اگر ہندو اور مسلمانوں کے

درمیان منافرت کے ذمے دار انگریز ہوتے تو ان کے رخصت ہوتے ہی یہ منافرت بھی دور ہو جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جوں جوں انگریزوں کی روانگی قریب آتی جاتی تھی حالات زیادہ بگڑتے جاتے تھے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہندوستان میں انگریزوں کی موجودگی تقسیم کا باعث نہیں بنی۔ جس چیز نے دونوں قوموں کو الگ الگ کیا، اس کی صورت کچھ اور ہی تھی۔ اس معاملے کی اصل بنیاد یہ تھی کہ ہندو نہ صرف ہندوؤں پر بلکہ مسلمانوں پر بھی اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انگریزوں پر الزام دھرنے سے ہندو اپنی ملوکیت پرستانہ روش کے کلنک سے بچ نہیں سکتے تھے۔

ایک گروہ قیام پاکستان کا کریڈٹ کانگرسی سرمایہ داروں کو دیتا ہے۔ ۱۹۴۶-۴۷ء میں لیاقت علی خاں کا پیش کیا ہوا بجٹ ان کے لئے ضرب کاری سمجھا گیا۔ پاکستان کا مطالبہ اس امید پر قبول کر لیا گیا کہ پاکستان کی زندگی بہت مختصر ہوگی کیونکہ ان کا گمان تھا کہ یہ اقتصادی طور پر مستحکم مملکت نہ ہوگی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آزادی کے مسائل کے حل کے طور پر پاکستان کا مطالبہ منظور ہو جانے کے بعد بھی ہندو رہنما جن میں نہرو، گاندھی اور پٹیل شامل تھے، اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ اگرچہ اس روش کے بانی اس دنیا سے کوچ کر چکے ہیں لیکن ابھی تک بھارتی پالیسی کا طرۂ امتیاز یہی روش ہے۔ یہ نقطۂ نگاہ اس لئے پیش کیا جاتا ہے "تاکہ حصول پاکستان کی جدوجہد میں مسلمانوں کی قربانیوں پر دھول ڈال جائے۔ لہٰذا پاکستان کے قیام کی یہ توجیہہ سراسر غلط ہے۔ اگر ہندوؤں کے بس میں ہوتا کہ مسلمانوں کے عزم کی روک تھام کر سکیں تو وہ مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کو ہرگز تسلیم نہ کرتے۔ پاکستان کا قیام ناگزیر تھا اور ہندوؤں کی تمام تر دولت مسلمانوں کو نہیں خرید سکتی تھی۔ اس دلیل کے ساتھ ملا ہوا، ایک اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب نظریہ ہے۔ اس

بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کی اصل جنگ ہندوؤں نے لڑی اور مسلمان اس راہ میں بہت پیچھے رہنے والوں میں سے تھے۔ اگر آزادی کے لئے ہندو جدوجہد نہ کرتے تو مسلمان عرصۂ دراز تک انگریزوں کے محکوم بنے رہتے۔ لہٰذا ان کے بقول، جو آزادی مسلمانوں کو ملی ہے، وہ دراصل ہندوؤں کی طرف سے تحفے کے طور پر ملی ہے۔ یہ ایک نہایت شر انگیز اتہام ہے۔ یہ یاد رہنا چاہیے کہ مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف اس وقت جنگ کی تھی، جب یہ محسوس کیا گیا تھا کہ انگریز ہندوستان میں اسلامی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے۔ یہ جنگ ناکام ہوئی۔ پھر بھی مولانا ابوالکلام آزاد نے اس جنگ کو مسلمانوں میں سیاسی بیداری سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے برعکس ہندوؤں میں سیاسی بیداری ۱۸۸۵ء میں مسٹر اے۔ او۔ ہیوم کے ہاتھوں کانگریس کی تشکیل کے بعد ہوئی۔ ہیوم کو توقع تھی کہ مسلمان اور ہندو یکساں طور پر اس جماعت کے قیام کا خیر مقدم کریں گے لیکن سر سید احمد خان کی ہدایات کے تحت مسلمان زیادہ تر اس سے الگ تھلگ رہے۔ مسلمانوں کے اس فیصلے کی تاریخ نے تصدیق کر دی۔ پاکستان کا وجود اس کا بیّن ثبوت ہے۔

اس لیے یہ کہنا نامناسب ہوگا کہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری کا فقدان تھا اور صحیح معنوں میں جنگ آزادی ہندوؤں نے تن تنہا لڑی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو فریب اور منافقت میں استادِ کامل تھا۔ ہندو کی سیاست ہمیشہ یہی رہی ہے کہ پس پردہ بیٹھ کر سازش کے جال بچھاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوؤں نے اپنی تحریک کی عمارت مسلمانوں کی قربانیوں کی بنیاد پر کھڑی کی۔ تحریک خلافت اس سلسلے میں روشن مثال ہے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ پاکستان کی غرض وغایت کی اور بھی توجیہہ کی جاتی ہے۔ کچھ لوگ پاکستان میں سوشلسٹ طرز زندگی رائج کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے اس نقطۂ نظر سے عوام کو اس

وقت تک متاثر نہیں کر سکتے تھے، جب تک کہ وہ تحریک پاکستان کی اپنے رنگ میں توجیہہ نہ کرلیں۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمان چونکہ غریب تھے، وہ سرمایہ دار ہندو بنیوں کے خلاف لڑتے رہے۔ اس نقطۂ نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان کی تحریک دراصل غریبوں کی سرمایہ داروں کے خلاف جنگ تھی، ان کے نزدیک ۱۹۴۷ء سے پاکستان کا اصل مقصد فراموش کر دیا گیا اور وہ اس نصب العین کی تکمیل کے عزم کا اظہار کرتے ہیں۔

اسلامی سوشلزم کی اصطلاح دو قائدین نے استعمال کی لیکن یہ ضروری ہے کہ جس سیاق و سباق میں اسے استعمال کیا گیا، اس کو بھی نگاہ میں رکھا جائے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ قائد اعظم ہندوستان کے مسلمانوں کی آزادی کے لئے نبرد آزما رہے۔ اگر ان کا مقصد سوشلزم کا قیام ہوتا تو آل انڈیا کانگریس کا پلیٹ فارم اس مقصد کے لیے موزوں تھا۔ کانگریس کی اپیل کو مسترد کر کے انہوں نے سوشلزم اور سیکولرزم (لادینی نظام) کے نظریات کا گلا گھونٹ دیا۔ اگر اس نظریے کو مان لیا جائے تو پھر غریب مسلمانوں کو غریب ہندوؤں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے تھا اور امیر مسلمانوں کا امیر ہندوؤں سے اشتراکِ عمل زیادہ مفید رہتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ غریب اور امیر مسلمان یکساں طور پر پاکستان کی جدوجہد میں شامل رہے۔

اس بحث کی روشنی میں قیامِ پاکستان کے اصل وجوہ کا ادراک آسان ہو جاتا ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں قیامِ پاکستان کا اصل سبب یہ تھا کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان اس کو قائم کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ اس کے اجزائے ترکیبی کئی ہو سکتے ہیں لیکن سب کے سب ایک چیز میں مدغم ہو جاتے ہیں اور وہ اسلام ہے۔

اس نظریے کو کئی نام دیے جا سکتے ہیں لیکن اس کا سب سے مقبول نام "دو قومی نظریہ" ہے۔

مختصر یہ کہ دو قومی نظریہ ابتدا میں اس کوشش کا آغاز تھا کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اہم اقدار کا تحفظ کیا جائے۔ جب یہ کوشش بارآور نہ ہوئی تو مسلمانوں سے یہ توقع تو کی نہیں جا سکتی تھی کہ تا ابد ہندوؤں کی غلامی کا جوا گلے میں ڈال لیتے۔ اب ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن بنایا جائے۔ لہٰذا پاکستان اس لئے وجود میں آیا کہ مسلمانوں کی عزیز ترین متاع کا تحفظ کیا جائے۔

جدوجہد

اسلامی اقدار ان مسلمانوں کے ساتھ آئیں، جنہوں نے سب سے پہلے اس برصغیر میں قدم رکھا۔ مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان اہم اقدار کے تحفظ کا بندوبست کیا جائے۔ مسلمانوں نے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کی۔ کچھ عرصے تک اس قلمرو کی باگ ڈور دہلی کے سلاطین کے ہاتھ میں رہی۔ بعد ازاں مغل برسرِ اقتدار آ گئے۔ بتدریج انگریزوں کے ناجائز قبضے نے ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک باوقار مقام حاصل کرنے کے لیے از سرِ نو جدوجہد کرنی پڑی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریز مسلمانوں کو شبہے کی نظروں سے دیکھنے لگے، سر سید احمد خاں نے مسلمانوں میں نئی سیاسی بیداری کی روح پھونکی۔ یہ بیداری ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے لئے مخصوص محرک بنی۔ دوسرے مقاصد کے علاوہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا بیڑا بھی اٹھایا۔ بعد کے واقعات نے مسلمانوں کو گرد و پیش کے خطرات سے زیادہ باخبر کر دیا۔ انگریزوں نے ۱۹۰۵ء میں کی گئی تقسیمِ بنگال کو منسوخ کر دیا۔ تقسیم سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا تھا لہٰذا قدرتی طور پر انہوں نے انگریزوں کے اس عمل کی مذمت کی۔ اس واقعے نے

مسلم لیگ کے پروگرام میں ۱۹۱۳ء میں واضح تبدیلی پیدا کی۔ اس کا نیا پروگرام یہ طے ہوا کہ برطانیہ کے زیر سایہ سیلف گورنمنٹ حاصل کی جائے۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور لیگ کے درمیان سمجھوتا ہو گیا۔ کانگریس نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا اصول مان لیا لیکن بعد میں اس سے پھر گئی اور اس طرح مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک نئی خلیج پیدا ہو گئی۔ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت جو نظام قائم ہوا اس نے غصے کی لہر کو اور بھی بڑھا دیا کیونکہ ہندوؤں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے نئے حکمران ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۲۷ء کا سائمن کمیشن، قائداعظمؒ کے چودہ نکات اور ۱۹۲۸ء کی نہرو رپورٹ نے دونوں قوموں کے درمیان ناقابل عبور خلیج پیدا کر دی۔ تحریک خلافت کے رہنما بھی، جو گاندھی سے تعاون کر رہے تھے۔ ہندوؤں کی تنگ نظری سے متنفر ہو گئے۔

اس سے ایک نئے رجحان نے جنم لیا، جس کی ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبالؒ نے ترجمانی کی۔ انہوں نے ایک علیحدہ اسلامی مملکت کا نظریہ پیش کیا۔ اس کا نام ۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی نے تجویز کیا۔

گول میز کانفرنس اور ۱۹۳۵ء کا ایکٹ اس بات کے شاہد ہیں کہ مسلمان متحدہ ہندوستان میں انصاف حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس ایکٹ کے تحت صوبائی اسمبلیوں کے جو انتخابات ہوئے، انہوں نے بالکل فضا ہی بدل دی، شریف کمیٹی اور پیرپور رپورٹ نے واضح کر دیا کہ لیگ کے پرانے طریق کار میں مکمل تبدیلی لازمی ہے۔ یہ پس منظر قرارداد پاکستان کی تخلیق کا باعث ہوا جیسے کہ ابتدا میں قائداعظمؒ کے چودہ نکات کی نامنظوری الہ آباد میں علامہ اقبالؒ کے خطبے کا باعث بنی، اسی طرح ہندوؤں کی نئی وزارتوں نے قرارداد پاکستان کو جنم دیا۔

۱۹۳۰ء سے ۴۷ء تک حصول پاکستان کی جدوجہد بڑے نازک دور سے گزری۔ اسے بہت سی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ اگست ۱۹۴۰ء میں انگریزوں نے مسلمانوں کو صوبائی خودمختاری کا نشہ پلا کر پاکستان کو متحدہ ہندوستان میں ضم کرنے کا منصوبہ پیش کیا۔ ۱۹۴۲ء کے کرپس مشن کا سب سے بڑا عندیہ حسب سابق یہی تھا۔ الحاق قبول نہ کرنے والے صوبوں کے متعلق کہا گیا کہ برطانوی حکومت انہیں علیحدہ آزاد نوآبادیاتی درجہ دینے پر غور کرے گی۔ ۱۹۴۴ء میں راجگوپال اچاریہ اور گاندھی سے قائداعظمؒ کے مذاکرات بھی بے نتیجہ رہے۔ کمزور کنفیڈریشن کا تصور مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول تھا۔ ۴۶-۱۹۴۵ء کے انتخابات نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت دے دی۔ پارلیمانی وفد اور کیبنٹ مشن نے ہندوستان کو متحد رکھنے کی راہ دکھائی۔ برطانوی حکومت کا ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کا اعلان ابھی تک مبہم اور شبہات سے پُر تھا۔ آخری معرکہ شروع ہوا اور پنجاب میں عوام کی تائید و اعانت سے خضر وزارت کا تختہ الٹ کر مسلمانوں نے یہ واضح کر دیا کہ وہ پاکستان کے حصول کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ پاکستان قائم ہوا لیکن اس کا راستہ مجاہدین آزادی کے خون سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔

قربانیاں

یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے قیام پاکستان سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد عظیم قربانیاں ادا کیں۔ اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کے لیے قیام پاکستان کے حق میں رائے دینا بہت جرأت آزما اقدام تھا۔ انہیں ہمیشہ آزاد ہندوستان میں درجہ سوم کے شہریوں کے زمرے میں دھکیلا جا رہا تھا۔ اس اقدام کا صرف ایک مقصد تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کم

سے کم مسلمانوں کی اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کو اپنے معاملات اسلام کی روشنی میں طے کرنے کی قوت حاصل ہو جائے۔ جن لوگوں نے پاکستان کی طرف ہجرت اختیار کی، ان کے لیے بھی یہ اقدام خاصا مشکل تھا۔ بے شمار خاندانوں کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

جن لوگوں نے پاکستان کے قیام کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دیں، ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں کی جا سکی۔ ۱۹۴۷ء خاص طور پر ایک ناقابلِ فراموش سال ہے کیونکہ جب پاکستان کا پودا لگایا جا رہا تھا تو مسلمانوں نے اسے سدا بہار رکھنے کے لیے اپنے خون سے اس کی آبیاری کی۔

مسلمانوں کی طرف سے یہ کچھ کم قربانی نہ تھی کہ انہوں نے ایک بریدہ پاکستان پر اکتفا کیا۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم اور آسام سے سلہٹ کی علیحدگی کے فیصلے قبول کرنا مسلمانوں کے لیے چنداں آسان نہ تھے۔ یہ ایک بہت بڑی قربانی تھی کہ مسلمانوں نے ان صوبوں کی تقسیم گوارا کر لی۔

پاکستان کو زندہ رکھنے کے لیے ابتدا ہی سے قائداعظمؒ کو پیرانہ سالی کے باوجود دن رات محنت کرنی پڑی۔ درحقیقت ہم نے پاکستان کو بچانے کے لیے قائداعظمؒ کی جان کی قربانی دی۔ اگر بھارت دشمن کے بجائے دوست ہمسایہ ہوتا تو پاکستان کو کم عمری میں یہ صدمۂ عظیم برداشت نہ کرنا پڑتا۔

ہندو اور انگریز نئے نئے مسائل کھڑے کر کے پاکستان کی فتح کو شکست میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ قائداعظمؒ سے کہا گیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو دونوں نو آبادیات کا گورنر جنرل تسلیم کر لیں تاہم انہوں نے اپنی فراست سے اس مطالبے کے ہونے والے اثرات کو بھانپ لیا کیونکہ انگریز ابھی تک برسرِ اقتدار تھے اور انتقالِ اقتدار کے طریق کار کو ہندوستان کے حق میں موڑ سکتے تھے۔ انہوں نے اس تجویز کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے محض پاکستان کے مسلمانوں کے

وقار کو پیشِ نظر رکھا۔ انہوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا۔ موخرالذکر نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ نتیجۃً ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے ساتھ جو بھی تنازعہ پیدا ہوا اس میں بلا استثنیٰ ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا گویا لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی ذاتی انا کے مجروح ہونے پر یوں مسلمانوں سے بدلہ لیا۔

ہندو مسلمانوں پر تسلط کے سوا ہر چیز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پاکستان کے مسلمانوں کو چھوٹا سا خطۂ ارض نصیب ہوا اور اس کے برعکس مسلمانوں کی کثیر تعداد ہندوؤں کی فرمانروائی میں چھوڑنی پڑی۔ پاکستان کے قیام سے مسلمانوں کی قربانیوں کا خاتمہ نہیں ہوا پاکستان ایک چیلنج تھا اور مسلمانوں کو پاکستان کی اس روح کو زندہ رکھنے کے لیے مزید قربانیاں کرنی پڑیں۔

مشکلات

ہمیں بریدہ پاکستان کے سوا کیا ملا؛ اس پر ریڈکلف ایوارڈ نے دونوں ملکوں کے درمیان سرحد کے تعین کے سلسلے میں مزید ضرب کاری لگائی۔ اس سیاسی ایوارڈ کی بدولت پاکستان کو ضلع فیروزپور میں واقع نہر کے ہیڈ ورکس سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس ایوارڈ نے پاکستان کے لیے دو بڑے مسئلے کھڑے کر دیے، ایک کشمیر اور دوسرا نہری پانی کا مسئلہ ۱۹۶۰ء میں طے کیا گیا۔ کشمیر کے سلسلے میں ستمبر ۱۹۶۵ء میں ایک جنگ بھی لڑی گئی اور فی زمانہ یہ مسئلہ آتش فشاں کی طرح کھول رہا ہے۔

لاکھوں پناہ گزین پاکستان میں داخل ہوئے اور پاکستان کو بہت سی مشکلات سے دوچار کر دیا۔ اگر مشرقی پاکستان سے پناہ گزینوں کے ہندوستان کی طرف فرار کو مدِ نظر رکھا جائے تو ۱۹۴۷ء اور

کی ہجرت کا پلڑا بہت بھاری تھا۔ حکومتِ پاکستان نے پناہ گزینوں کے مسئلے کو نہ تو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور نہ ہی دولت مند ملکوں سے اقتصادی امداد کے لیے کشکول کے طور پر استعمال کیا۔ غیر منقسم ہندوستان میں ہمارے حصے کی املاک ہمارے حوالے کرنے سے انکار کر کے ہندوستان نے اس مسئلے کو سنگین تر کر دیا۔

مسلمانوں نے قوتِ ارادی کے بل پر حصارِ پاکستان کی حفاظت کی ——— ہندوؤں نے پاکستان کو اس کے فوجی ذخیرے اور اسلحے کا جائز حصہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس نئی مملکت کا دفاع ایک عظیم مسئلے کی صورت اختیار کر گیا۔ پاکستان نے اس بات کو اس وقت محسوس کیا، جب فیلڈ مارشل آکن لک کی مخالفت کے باوجود جائنٹ ڈیفنس کونسل کو اس کی معینہ میعاد سے پہلے ختم کر دیا گیا۔ پاکستان کو اس خلیج کو پُر کرنے کے لیے جلد ہی نئے دوستوں کی تلاش کرنی پڑی۔ دیگر وجوہات کے علاوہ پاکستان کو مغربی کیمپ میں اس کی معاہدات کی پالیسی کے ذریعے شامل ہو جانے پر مجبور کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

۱۹۴۷ء میں نہ کوئی مرکزی حکومتی نظام تھا اور نہ ہی پاکستان کا کوئی دارالحکومت تھا۔ ابتدائی مسائل بہت بڑا چیلنج تھے لیکن ان سے نمٹنے کا عزم بھی کچھ کم نہ تھا۔ اس سال کے واقعات نے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بڑی بڑی توقعات کو جنم دیا۔ بہت سے آڑے وقتوں میں ان توقعات کی کرشمہ سازیاں دیکھنے میں آئیں۔ خاص طور سے ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ کے دوران۔

ہندوؤں کا دعویٰ یہ تھا کہ پاکستان اقتصادی طور پر مستحکم ملک نہیں بن سکتا۔ ابتدائی مراحل میں صورتِ حال بے حد تاریک تھی۔ زندگی کی بنیادی ضروریات میسر نہ تھیں کیونکہ بیشتر صنعتی ادارے ہندوستان میں رہ گئے تھے اور صنعتی اعتبار سے پاکستان بے حد پسماندہ تھا۔

پاکستان ضروریات کی دھکم پیل سے صحیح سلامت بچ نکلا اور صنعتی ادارے جلد از جلد قائم ہو گئے۔

پاکستان نے جس خوش اسلوبی اور کامیابی سے ابتدائی ایام میں اپنے معاملات کا انصرام کیا، وہ ہندوؤں اور انگریزوں کے لیے بدستور حیرت کا باعث بنا رہا۔ ایسے حالات میں پاکستان کی بقا جیسا کہ بہت سے لوگوں کا عقیدہ ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی مرہونِ منت ہے۔

برِصغیر میں مُسلمانوں کی حکومت کے زوال کے اسباب

پروفیسر ایس، علی عباس

برِصغیر میں مسلمان حکومت کا زوال ہمارے قومی نظریۂ حیات کے نقطۂ نظر سے ایک دلچسپ، سبق آموز اور بہت ہی اہم موضوع ہے۔ اٹھارویں صدی، جو برِصغیر کے زوال کا زمانہ ہے، دراصل ایسا رشتہ فراہم کرتا ہے جس سے بالآخر مسلمانوں کی نظریاتی اساس اور سیاسی فکر کا تانا بانا تیار ہوا۔ یہی زمانہ تھا جس نے برِصغیر میں بسنے والی نسلوں کے ہجوم میں مسلمانوں کے علیحدہ وجود کو قائم رکھا۔ اس دور کی اہمیت کبھی بھی کم نہیں ہوئی خصوصاً آزادی کے بعد کی مسلم تاریخ نگاری میں اس کی اہمیت مُسلّم ہے۔ اس کے باوجود اس دور کے نظریۂ پاکستان سے مطابقت رکھنے والے نمایاں پہلو واضح کرنے کی آج تک بہت کم کوششیں ہوئی ہیں۔ اس موضوع پر اب تک جو تصانیف تیار کی گئی ہیں، ان کا تجزیہ تو شاید اس مقالے کے موضوع سے خارج ہے لیکن درسی کتب نوجوان ذہنوں کی تربیت اور قومی امنگوں کے متعلق رائے عامّہ کی تیاری میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پاکستانی فضلا کی لکھی ہوئی ان درسی کتب نے بھی اس دور سے انصاف نہیں کیا۔ اس مقالے کا مقصد یہ ہے کہ "زوال کے اسباب" کے متعلق درسی کتب کے موجودہ طریقِ کار پر بحث کی جائے اور پھر نظرثانی شدہ درسی کتب میں نظریۂ پاکستان کو شامل کرنے کے لیے چند

تجاویز پیش کی جائیں۔ شروع ہی میں یہ حقیقت بتا دینا مناسب ہے کہ ہمارے مؤرخین کے نزدیک ہندوستان میں مسلمان حکومت کا زوال اور مغل سلطنت کا زوال مترادف ہیں۔ پنجاب، سندھ، روہیل کھنڈ، بنگال، اودھ اور دکن اور دوسری آزاد و نیم آزاد مسلم ریاستیں، جنہوں نے مسلم معاشرے کے معاشی و معاشرتی نظم میں شاندار حصہ لیا، مغلیہ سلطنت کے انتشار سے علیحدہ مطالعے کی مستحق نہیں سمجھی جاتیں۔ درسی کتب میں مغل زوال کے جن اسباب کا تجزیہ کیا جاتا ہے، وہ بالعموم روایتی، بعض اوقات متضاد اور کبھی کبھی معذرت خواہانہ ہوتے ہیں: "اورنگ زیب عالمگیرؒ کے بعد کمزور اور نااہل بادشاہ، اکبر کی مذہبی پالیسی، مغل فوج میں غیرمسلموں کی عددی کثرت، غدار و خود غرض امراء، مرہٹہ، سکھ اور جاٹ حکومتوں کا قیام اور آخر میں نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملے" ایسے موضوعات ہیں، جن کے گرد مغل انحطاط کا مطالعہ گھومتا ہے۔ مغل زوال کے یہ اسباب ثانوی سطح کی درسی کتب میں مذکور ہیں۔ اعلیٰ ثانوی سطح پر ان میں دو چار مزید اسباب کا اضافہ کر دیا جاتا ہے مثلاً اسلام پر پختہ یقین کا فقدان اور قبائلی لڑائیاں، خصوصاً ایرانیوں اور تورانیوں کے درمیان۔

ان اسباب کا تجزیہ درسی کتب میں اس طرح منعکس کیا گیا ہے۔

"عالمگیر اوّل کی وفات پر اس کے بیٹوں میں تاج و تخت کے لیے جنگ شروع ہو گئی۔ فرزندِ اکبر شہزادہ محمد معظم کامیاب ہو کر تخت پر بیٹھا اور اس نے بہادر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ پہلے پہل اس نے جزیہ موقوف کر دیا۔ پھر جودھ پور اور اودے پور کے راجپوت حکمرانوں کو اپنی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں آزادی دے دی۔ ۱۷۰۷ء میں دکن کے صوبے دار ذوالفقار علی خان نے سیواجی کے پوتے ساہو کو رہا کر دیا۔ اس

کے عہد میں لاہور کے صوبے دار نے سکھوں کی بغاوت کو دبا دیا۔ بہادر شاہ ۱۷۱۲ء میں فوت ہوا۔

آئندہ نصف صدی میں دہلی کے تخت پر گیارہ بادشاہ یکے بعد دیگرے بیٹھے۔ ان میں سے محمد شاہ نے انتیس سال حکومت کی اور شاہ عالم نے چھیالیس سال۔ موخرالذکر کا عہد حکومت ان میں سب سے طویل تھا۔ یہ سب کے سب کمزور اور نااہل نکلے۔ ان کے ناتواں ہاتھوں سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر گیا۔ مرہٹوں نے دکن میں، سکھوں نے پنجاب میں اور صوبائی گورنروں نے اودھ اور بنگال میں خودمختاری کی داغ بیل ڈال لی۔"

اکبر کی مذہبی پالیسی کے حوالے سے یہ رائے پیش کی گئی ہے: "سلطنت کی بقا مسلم عوام کی وفاداری پر منحصر تھی، جہاں تک وہ اس سلطنت کو اپنی سلطنت سمجھتے تھے، اس کے لئے ہر ممکن قربانی دینے کے لئے تیار رہتے تھے لیکن اکبر نے مذہب کو ایک کھلونا بنا کر اس احساس کو کمزور کر دیا۔ وہ ان غیر مسلموں پر بھروسہ کرنے لگا، جن کو سلطنت کے ساتھ کوئی دلی لگاؤ نہ تھا، مسلمان بتدریج حکمرانی سے بے تعلق ہو گئے، سلطنت کی اسلامی روح زائل ہو گئی اور مذہبی جوش کے ٹھنڈا پڑنے سے سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں۔"

"جب مغل فوجوں میں زیادہ تر مسلمان سپاہی ہوتے تھے، یہ فوج ملک کی حفاظت بھی کرتی تھی اور مسلسل فتوحات بھی۔ اکبر نے فوج میں غیر مسلموں کی تعداد بڑھا دی۔ اس نے راجپوتوں کو سالاری کے عہدے دینے شروع کئے، غیر مسلم حکومت میں دخیل ہو گئے۔ اس سے مسلمانوں میں مایوسی اور بددلی پیدا ہو گئی، راجپوتوں نے کبھی اپنے ہم قوم ہندوؤں سے دل و جان سے جنگ نہ کی۔"

"حسین علی اور عبداللہ نے، جو عموماً سید بھائی کہلاتے ہیں، خصوصیت سے برصغیر میں

مسلمانوں کے سیاسی اقتدار پر ضرب کاری لگائی۔ وہ آٹھ سال تک برسر اقتدار رہے۔ اس مدت میں انہوں نے چار مختلف بادشاہوں کو اپنی مرضی سے تخت پر بٹھا دیا اور الگ کر دیا۔ اپنے مفاد کی خاطر انہوں نے مرہٹوں سے ساز باز کی اور شمالی ہند کے دروازے اُن کے لئے کھول دیئے۔ مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں نے مغلوں کی باقی ماندہ سلطنت پر قبضہ کر لیا اور ان کی قیمت پر پنجاب، بھرت پور اور دکن میں اپنے پاؤں جما لیے۔" اس مرحلے پر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے مغل سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا۔"

مغلوں کے زوال کے اسباب کا مذکورہ بالا تجزیہ بعض مقامات پر تاریخی اعتبار سے غلط ہونے کے علاوہ بعض متفرق حقائق میں بے ربطی کا شکار بھی ہے۔ یہ بالکل روایتی قسم کا تجزیہ ہے کیونکہ ہندو اور برطانوی مؤرخین نے اس تجزیے کو اسی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سے بالعموم اورنگ زیب کے جانشینوں اور ان کے عہدِ حکومت کے متعلق بڑا نامناسب تاثر قائم ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ عالم بہادر شاہ نے جزیہ منسوخ کر دیا اور راجپوتوں کو ان کی ریاستوں میں خودمختاری دے دی۔ تاریخ مغلیہ کے طالب علم جانتے ہیں کہ اکبر سے اورنگ زیب تک مغل شہنشاہوں نے راجپوت ریاستوں کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ جزیہ بھی شاہ عالم نے نہیں بلکہ جہاندار شاہ نے منسوخ کیا تھا۔ اسے پھر فرخ سیر کے زمانے میں نافذ کر دیا گیا، سید عبداللہ نے اسے واپس لے لیا اور محمد شاہ کے عہد میں محمد امین خاں نے اسے دوبارہ نافذ کر دیا۔

مزید براں اس تجزیے سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اورنگ زیب کے بعد نصف صدی میں گیارہ بادشاہوں کے دورانِ حکومت مغل سلطنت کو زوال آ گیا۔ دراصل یہ گیارہ بادشاہ جو اورنگ زیب کے بعد تخت نشین ہوئے، صرف نصف صدی تک حکمران نہیں رہے

بلکہ ڈیڑھ سو برس تک دہلی کے تخت پر متمکن رہے۔ دوم، مغل سلطنت پر تیزی سے زوال نہ آیا بلکہ یہ عمل بڑا سست تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے وقت مغل سلطنت سترہ سے زیادہ صوبوں پر مشتمل تھی: بنگال، بہار، اڑیسہ، اودھ، الہ آباد، آگرہ، دہلی، لاہور، ملتان، ٹھٹھہ، کشمیر، کابل، اجمیر، مالوہ، گجرات اور دکن کے چھ صوبے۔ ان میں سے سب سے پہلے کابل علیحدہ ہوا، جبکہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے اسے فتح کیا۔ اس کے بعد ماورائے سندھ اور چہار محل کے علاقے اس نے سلطنت ایران میں شامل کیے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ۱۷۳۹ء تک مغل سلطنت اسی طرح صحیح سالم رہی، جس طرح اورنگ زیب نے اسے چھوڑا تھا۔ اس دور کے مالگزاری دستور العمل پر مبنی ایک گوشوارہ منسلک ہے، جس سے بڑھتے ہوئے صوبائی محاصل کا پتا چلتا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ۱۷۳۹ء تک ان صوبوں کے محاصل پر کوئی زیادہ اثر نہ پڑا۔ محمد شاہ کے عہد کے دستور العمل غلام احمد میں ۱۷۴۰ء میں بنگال، بہار، مالوہ، اودھ، دہلی، آگرہ، الہ آباد، لاہور، ملتان اور گجرات کے محاصل دکھائے گئے ہیں۔ دستور العمل سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ محاصل باقاعدگی سے وصول ہوتے تھے یا نہیں تاہم اس سے پتا چلتا ہے کہ مغل سلطنت نادر شاہ کے حملے کے بعد بالکل ختم نہیں ہو گئی تھی بلکہ صوبوں کی اکثر تعداد اس کے اقتدار و تسلط میں تھی۔

ایک اور دلچسپ بحث، اکبر یا اورنگ زیب کی ذمہ داری کا مسئلہ ہے، جسے مختلف مکاتب فکر کے مؤرخین نے اکبر یا اورنگ زیب کی طرف منسوب کیا ہے۔ ہندو اور برطانوی مؤرخین نے ہمیشہ اورنگ زیب کو اس کے ہندوؤں پر نام نہاد ظلم پر مطعون کیا ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا انداز اورنگ زیب کے متعلق معذرت خواہانہ اور اکبر کی بے دینی اور حد سے بڑھی ہوئی رواداری کے متعلق ناقدانہ رہا ہے۔

جہاں تک اکبر کا تعلق ہے، میں اس کی مذہبی پالیسی کے متعلق کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ یہ تسلیم کردہ بے دین تھا، اس نے مذہب کو کھلونا بنا دیا، اس نے بعض غیر اسلامی طریقے رائج کیے لیکن اس بارے میں درسی کتب میں جو دلائل دیے جاتے ہیں، وہ اس موقف کو ثابت نہیں کرتے۔ دلیل دی جاتی ہے کہ اکبر بے دین تھا کیونکہ اس نے داڑھی منڈوانے کی حوصلہ افزائی کی اور بہت سے غیر مسلموں کو حکومت میں دخیل ہونے کی اجازت دی۔ یہ بیان خواہ کتنا ہی زوردار ہو، اس زمانے کے نوجوان ذہن کو متاثر نہیں کر سکتا۔

اکبر کے برخلاف اورنگ زیب اپنے ناقدوں اور مداحوں دونوں کا شکار رہا۔ اس پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ سلطنت سے غیر مسلموں کی دلچسپیاں ختم کرکے اور دکن کی طویل، بے فائدہ مہم کے ذریعے مغل انحطاط کا باعث بنا۔ یہاں یہ ذکر کرنا مفید ہوگا کہ دکن کے متعلق اورنگ زیب کی پالیسی کا کثرت سے تاریخ کی کتابوں میں ذکر آتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے شمالی ہند میں مرکز گریز رجحانات پروان چڑھتے رہے۔ لیکن زوال مغلیہ کے سبب کے طور پر ہندوؤں کے ستانے کا الفنسٹن، مسز بیورج، ایچ جی کین یا سڈنی اوون کی ان کتابوں، جو انیسویں صدی میں شائع ہوئیں کہیں ذکر نہیں۔ جادو ناتھ سرکار پہلا مؤرخ ہے، جس نے تعصب کی نظر سے اورنگ زیب کو دیکھا۔ دراصل یہ اورنگ زیب کی بدنصیبی ہے کہ اسے جادو ناتھ سرکار جیسا سوانح نگار ملا، جس نے اس کی واقعی کمزوریوں ہی کو جو ہر انسان میں ہو سکتی ہیں، ہوا نہیں دی بلکہ بہت سی ایسی برائیاں بھی اس کی طرف منسوب کر دیں، جن کا اس کے کردار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہندوؤں کو ستانا ایک ایسا ہی الزام ہے، جو سراسر سرکار کے تخیل کی پیداوار ہے۔

سرکار نے اورنگ زیب پر قانونِ شریعت نافذ کرنے کا الزام لگایا اور کہا ہے کہ اس نے جزیہ نافذ کیا اور مندروں کو منہدم کرایا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس کے نتیجے میں جاٹوں، ست نامیوں اور راجپوتوں نے اس کے خلاف بغاوت کردی۔

جب مسلمان مؤرخ شبلی نعمانی نے سرکار کے دلائل کی تاریخی غلطی ثابت کرنے کے بجائے معذرت خواہانہ انداز میں جزیہ اور مندروں کے انہدام کے متعلق اورنگ زیب کے فعل کا قرآن و سنت کی بنیاد پر جواز ثابت کرنے کی کوشش کی تو سرکار کو اورنگ زیب کی شخصیت مسخ کرنے کے مقصد میں اور بھی کامیابی ہوئی۔ سڈنی اوون پہلا مغربی مستشرق ہے، جس نے اپنی کتاب "زوالِ سلطنتِ مغلیہ" میں سرکار کا نقطۂ نظر اختیار کیا اور یوں اورنگ زیب کے متعلق نیا نظریہ ہندو اور برطانوی مؤرخین میں مسلسل مقبولیت حاصل کرتا گیا۔

یہاں مسلمانوں کے خلاف ہندو برطانوی سازش کی تفصیل پر بحث غیر متعلق ہوگی۔ اورنگ زیب خود اس پھندے میں نہ پھنسا۔ ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگال کے بعد متشدد ہندو قوم پرستوں کی مسلمانوں کے خلاف سیاسی ہنگامہ آرائی میں خواہ مخواہ گھسیٹ لیا گیا۔ کلکتے کا نابغۂ روزگار سرکار فرقہ وارانہ کشیدگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اورنگ زیب پر اس کی کتب جو ۱۹۱۱ء کے بعد منظرِ عام پر آنے لگیں، اس کے مشتعل ذہن کی عکاسی کرتی ہیں۔ دوسری طرف مغربی مستشرقین انگریزوں کی فتح ہند کا جواز ثابت کرنے کے لئے ہمیشہ مسلمان حکمرانوں کی عیب جوئی کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ان کی تاریخ نویسی کا مقصد یہ تھا کہ اپنے آپ کو ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں اور شہزادوں کے ہاتھوں ستائے گئے عوام کا خیرخواہ ثابت کریں۔ ایچ۔ جی کین کی کتب THE GREAT ANARCHY اور THE DARKNESS BEFORE DAWN جو ۱۸۹۶ء اور ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئیں،

متعصب برطانوی ذہن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ سرکار نے انہیں مزید مواد فراہم کردیا ہے لہٰذا اس کے بے بنیاد نظریے کی عام پذیرائی کی گئی۔

مختصر یہ کہ فی الحقیقت مغل سلطنت اس لئے زوال پذیر نہیں ہوئی کہ اکبر نے یہ کیا یا اورنگ زیب نے وہ کیا۔ افراد خواہ کتنے ہی اہم ہوں، ہمیشہ نظامِ حکومت کے خواہ وہ شہنشاہیت ہی ہو، آلۂ کار ہوتے ہیں۔ بادشاہ قوانین و اختیارات کا سرچشمہ ہو سکتا ہے لیکن اس کے منشا کو عمل میں لانے والے بہر حال اس کے سوا دوسرے افراد ہوتے تھے۔ وہ انتہائی اہل، جری اور صاحبِ عزم و ارادہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن بدعنوان، خودغرض اور غیر مخلص بھی تو ہو سکتے ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے اصل قصور افراد کا نہیں بلکہ حکومت کے ان اداروں کا ہے، جو کسی زمانے میں سلطنت کے استحکام و سالمیت کا ذریعہ تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں بدعنوانی نفوذ کرتی گئی اور نظم و نسق پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اگر انتظامی اداروں کی اصلاح کی بروقت کوشش کی جاتی تو غالب ہے کہ بعد میں اورنگ زیب اور شاہ عالم کے زمانے کی کوششیں مؤثر طور سے نافذ ہو سکتیں۔ یہ لغزش مہلک ثابت ہوئی اور آخر کار پورا سیاسی ڈھانچہ سر کے بل گر پڑا۔

وہ ادارے جن پر مغل سلطنت کی قوت کا تمام تر انحصار تھا اور جن کی کمزوری مغل سلطنت کے زوال کا باعث بنی، حسبِ ذیل تھے:۔

۱۔ زرعی نظام

۲۔ منصب داری اور جاگیرداری

۳۔ مغل فوج

۴۔ مغل دربار

زرعی نظام کو دورِ مغلیہ کے ہندوستان میں مثل معیشت کی ریڑھ کی ہڈی کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ اکبر کے زمانے میں خوب چلتا رہا لیکن اس کا کوئی دیرپا اثر نہ ہوا۔ اکبری عہد کے گیارھویں سال رقبہ کاشت کی پیمائش پر مالیہ تجویز ہوا۔ بقول ابوالفضل اسی سال وزارتِ مالیات نے پیمائش کے بغیر وصولی کی رقوم میں اضافہ شروع کردیا اور اس طرح بدعنوانی کا دروازہ کھول دیا (دیکھیں آئینِ اکبری از ابوالفضل، جلد سوم صفحہ ۱۱) ابوالفضل کہتا ہے کہ آئندہ سالوں میں صورتِ حال بد سے بدتر ہو گئی۔ اکبر نے اپنی تخت نشینی کے اٹھارویں سال اس صورت کا سختی سے جائزہ لیا اس نے اپنے منصب داروں کی ایک بہت بڑی تعداد کے لئے نقد مشاہرہ مقرر کردیا اور جاگیرداری نظام کو بالکل ختم کردیا (ایضاً) لیکن تدریج یہ نظام بھی ترک کرنا پڑا اور محکمہ مالیات کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ ابوالفضل محکمہ مالیات کی غفلت شعاری پر آنسو بہاتا ہے۔ اس کی رائے ہے کہ مقامی اہل کار مالیے کی منظور شدہ شرح کو تبدیل کر دیتے تھے اور کسانوں سے زیادہ سے زیادہ رقم بٹور لیتے تھے۔ گاؤں کے چودھری ککڑ کے کلرکوں سے مل کر سالانہ پیمائش کے سلسلے میں کسانوں پر بڑا ستم ڈھاتے تھے۔ سالانہ محاصل کی پڑتال لیکن کبھی کبھی ہوتی تھی۔ منصب دار کے حساب کی صرف اس کے تبادلے یا وفات پر پڑتال کی جاسکتی تھی۔ (ایضاً صفحہ ۱۰۰، ۱۰۳) اکبر کی تخت نشینی کے پچیسویں سال نئے زرعی نظام کو کسی قدر استحکام حاصل ہوا لیکن ابوالفضل کہتا ہے کہ وزارتِ مالیات کی حالت اب بھی تسلی بخش نہ تھی (ایضاً صفحہ ۱۰۲) سترھویں صدی کے آغاز میں اکبر کا طریقۂ مالگزاری زوال پذیر ہونے لگا اور ۱۶۶۵ء میں اورنگ زیب کے عہد میں یہ بالکل ناکارہ ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پیمائش بڑی دقت طلب اور مہنگی پڑتی تھی۔ یہ طریقہ صرف مضبوط انتظامیہ کے تحت مؤثر ہو سکتا تھا۔ وزارتِ مالیات کی کمزوری کی صورت میں یہ ناقابلِ عمل اور تقریباً ظالمانہ صورت

اختیار کر جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں گروپ اسسمنٹ سستی اور سادہ تھی۔ اکبر نے اس کی سخت ممانعت کر رکھی تھی لیکن وزارتِ مالیات اس نظام سے بخوبی واقف تھی اور کبھی کبھی شہنشاہ کے علم کے بغیر اسے عمل میں بھی لاتی تھی۔

جہانگیر کے وقت صورتِ حال اور بھی ابتر ہو گئی۔ اس کا التمغہ (مہر شدہ عطیہ ملکیتِ زمین) سے زیادہ قریب تھا۔ اس سکیم کے تحت منصب دار اپنی جاگیروں میں اپنے تقرر کا دعویٰ کر سکتا تھا اور یہ مزید بدعنوانی اور نااہلیت پر منتج ہوتا تھا۔ ہاکنز، ٹیری اور ڈلا اسکارٹ جہانگیر کے زمانے میں مختلف موقعوں پر منصب داروں کے بکثرت تبادلوں کا ذکر کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب کے عہد کے آغاز تک کسانوں کے طبقے میں سخت قلت رونما ہو گئی۔

اورنگ زیب کے ابتدائے عہد کی زرعی حالت کے متعلق محمد کاظم اور خود اورنگ زیب کا بیان محفوظ ہے (نگار نامۂ منشی از ملک زادہ میں شامل راسک داس کروڑی کے نام اورنگ زیب کا فرمان Ms. F. 129-31) دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ مقامی سرداروں (جنہوں نے سلطنت کے بگڑے ہوئے حالات سے فائدہ اٹھایا) کی بدعنوانیوں کی وجہ سے سلطنت کی پیداوار کو بڑا نقصان پہنچا۔ اورنگ زیب کی رائے ہے کہ یہ زمیندار حکام حتیٰ کہ بادشاہ کی نافرمانی تک سے گریز نہیں کرتے تھے اور صاف بچ نکلتے تھے۔ اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کے اٹھارویں سال زرعی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد اس نے راسک داس کروڑی کے نام اپنا مشہور فرمان جاری کیا۔ فرمان میں خالصہ زمینوں کے جائزے کی وضاحت کی گئی تھی اور مروجہ نظام کے نقائص بیان کرتے ہوئے آئندہ کے لیے خالصہ زمینوں اور جاگیری زمینوں کے متعلق طریقِ کار کی نشان دہی کی گئی تھی۔

فرمان میں واضح کردہ زمینوں کی تشخیص کا نیا طریقہ نسخ فرہنگ کاروانی اور خلاصۃ السیاق

میں شامل طریقے کے مطابق تھا۔ ان کی رائے ہے کہ اکثر دیہات اور پرگنوں کے محاصل کی تشخیص شروع سال میں گذشتہ برسوں کے زیادہ سے زیادہ محاصل کی اساس پر کی جاتی تھی۔ یہ گویا اورنگ زیب کی طرف سے ایک بدعنوان نظام کی سرکاری منظوری تھی جس نے سلطنت کے معاشی استحکام پر بڑے دور رس اثرات مرتب کئے۔ نئی تبدیلی کے بعض فوری نتائج حسب ذیل تھے:۔

ا۔ کسانوں اور سرکاری اہلکاروں کے مابین جو رابطہ موجود تھا، وہ ختم ہو گیا۔

ب۔ اب حکومت کسانوں کی حالت کے متعلق اصل حقائق سے محروم ہو گئی بلکہ کسانوں نے سرکاری مشینری کی کمزوری کو بھانپ لیا۔

ج۔ یہ سمجھا جانے لگا کہ سیاسی اور انتظامی حالات کی مدد سے درمیانی افراد بڑی طاقتور اور مستحکم حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔

د۔ کاشت کار نئے زمینداروں کے تحت علاقوں کو زیادہ محفوظ سمجھنے لگے اور سرکاری انتظام کے تحت علاقوں میں کاشت کے بجائے ان علاقوں میں آبادکاری کو ترجیح دینے لگے۔ اس طرح سرکاری اہلکاروں کے پاس مقدموں کے ساتھ ساز باز کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

نئی تبدیلی اور خصوصاً نئے نظام کی بدعنوانیوں کا سب سے زیادہ مہلک اور تباہ کن اثر ریونیو فارمنگ یا اجارہ داری کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس نظام کے تحت زمین کئی سال کے لئے ٹھیکے پر دے دی جاتی تھی اور حکومت مالیہ پیشگی وصول کر لیتی تھی۔ اورنگ زیب کے آخری عہد میں یہ نظام دور دراز علاقوں میں زیر عمل تھا لیکن اٹھارویں صدی میں تقریباً مستقل حیثیت اختیار کر گیا اور اس نے مغل سلطنت کی جڑیں تک ہلا کے رکھ دیں۔

منصب داری نظام بھی مغل سلطنت کے استحکام کا اہم عنصر تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ

امرا کو جن پر مغل سلطنت کے وجود کا انحصار تھا، منظم کیا جائے۔ یہ ادارہ سول اور فوجی دونوں طرح کے فرائض حکومت کا جامع تھا اور یوں مرضیٔ شاہ کا آلۂ کار تھا۔ منصب دار دربار شاہی کی زینت، تخت کی شمشیر محافظ اور مملکت کے ستون ہوتے تھے۔ اپنے مذہبی، نسلی اور علاقائی اختلافات کے باوجود وہ حکمران خاندان سے وفاداری کے جذبے سے سرشار ہوتے تھے۔ شہنشاہ عام طور پر امرا کے ایک طبقے کو دوسرے کے خلاف استعمال کیا کرتا تھا اور ان کے اتحاد یا آزادی سے چوکنا رہتا تھا تاہم انفرادی طور سے چھوٹی چھوٹی انتظامی وحدتوں کے نگران کی حیثیت سے جب یہ لوگ باہم متحد ہوتے تھے تو شاہی مطلق العنانیت کا مظہر بن جاتے تھے۔

اکبر کے تحت منصب داری نظام خوب منظم تھا۔ عبدالعزیز کے قول کے مطابق ۱۶۰۶ء میں دہ یا دس سواروں کا سردار سے لے کر پنج ہزاری تک ۱۸۰۳ منصب دار تھے۔ اکبر کی وفات کے وقت پنج ہزاری منصب کے صرف آٹھ امرا تھے۔ شہزادوں کے مراتب اس سے بلند ہوتے تھے۔ سلیم دس یا بارہ ہزاری تھا، مراد اور دانیال بالترتیب نو ہزاری اور سات ہزاری اور خسرو دس ہزاری۔ جہانگیر کے عہد میں ہر ایرے غیرے پر اندھا دھند منصبوں کی بارش ہونے لگی۔ پانچ ہزاری یا زیادہ کا منصب رکھنے والوں کی تعداد ۶۲ سے بھی زیادہ ہو گئی جبکہ اکبر کے زمانے میں آٹھ تھی۔ شہزادوں میں سے پرویز کا منصب ۴۰/۳۰ ہزاری تھا، خرم کا ۳۰ ہزاری، شہریار اور دانیال کا بالترتیب ۱۲/۸ ہزاری اور ۴/۲ ہزاری۔ شاہجہان کے عہد میں منصب داروں کی تعداد اور منصب بدرجہا بڑھ گئے۔ دارا شکوہ سب سے بڑے منصب ۶۰،۰۰۰/۶۰،۰۰۰ کا حامل تھا اور امرا میں سے یمین الدولہ آصف خاں ۹،۰۰۰/۹،۰۰۰ کا۔ منصب داروں کی کل تعداد اب اکبری دور سے تقریباً دس گنا ہو چکی تھی۔ اورنگ زیب نے شہزادوں کے لئے زیادہ سے زیادہ منصب ساٹھ ہزار سے گھٹا کر چالیس ہزار اور امرا کے لئے نو ہزار کے

بجائے آٹھ ہزار کر دیا۔ لیکن اس عہد میں منصب داروں کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ منصب داروں کو ان کی تنخواہ کے عوض جو زمینیں دی گئی تھیں ضبط کر لی گئیں۔ اکبر کے زمانے سے کچھ زیادہ علاقے فتح کر کے سلطنت میں شامل نہیں کئے گئے تھے اور کم از کم وہ منصب داروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے تناسب سے قطعی ناکافی تھے لہٰذا جاگیرداری نظام کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بقول خافی خاں اورنگ زیب کے آخر عہد میں یہ حالت ہو گئی کہ میر بخشی کے پاس منصب داروں کا اندراج تو موجود تھا لیکن پائی باقی نہ تھی، جو انہیں جاگیر کے طور سے دی جاتی رکے۔ کے جلد دوم صفحہ ۳۹۶، ۳۹۷) منصب دار بددل ہو گئے اور بہت حد تک معیشت و افلاس کا شکار ہو گئے۔ یہ نظام اب منصب داروں کی کثیر تعداد کا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا تاہم شماریاتِ جمع میں ہیر پھیر سے ان کے مطالبات و ضروریات کا غذوں میں پورے کئے جاتے رہے۔ شماریاتِ جمع اور اصل آمدنی کے وسیع تفاوت سے ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ خصوصاً اورنگ زیب کے بعد زمینوں پر کوشی اور مقامی اثر و رسوخ اور قوت پر مبنی دعووں پر زور دیا جانے لگا۔ اورنگ زیب کے بعد منصب داروں کی تعداد میں مزید اضافے نے اس بحران کو شدید تر کر دیا اور محکمہ بجایات پر مالی بوجھ کا یہ نتیجہ نکلا کہ خالصہ زمینیں تقسیم کرنی پڑیں۔ جونہی یہ سلسلہ شروع ہوا پوری کی پوری شاہی زمین طاقتور امرائے دولت نے ہتھیا لیں۔ شاہی خزانہ خالی ہونے کی وجہ سے تخت و تاج کا اقتدار رفتہ رفتہ انحطاط پذیر ہوتا گیا اور بادشاہ ایک کٹھ پتلی یا امرا کے تحفوں اور نذروں کا محتاج بن کر رہ گیا۔

منصب داری نظام کا ایک اور نقص اس کی دوہری حیثیت تھی۔ یعنی منصب دار مغل فوج کے سردار ہوتے تھے اور سول انتظامیہ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ دوسری

حیثیت میں وہ کم ضرر رساں تھے لیکن فوجی افسر کی حیثیت سے کسی خاص بادشاہ کے لئے ان کی وفاداریوں کی کوئی ضمانت نہ تھی۔ دوسرے لفظوں میں ان کی وفاداریاں مملکت کے ساتھ نہیں، اپنے آقا کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ان کے ماتحت فوجوں کی وفاداریاں بھی خود شاہی خاندان کے لئے اسی طرح مشکوک تھیں۔ اسی طرح ان کی حیثیت ایسے مفت خوروں کی تھی، جنہیں طالع آزما لوگ اپنے ذاتی مفادات حاصل کرنے کے لئے ملازم رکھ لیتے تھے اور کبھی کبھی سپاہیوں کو بھی اس مفاد کا حصہ رسدی پہنچ جاتا تھا۔

ان سب خامیوں کے باوجود مغل فوج اس وقت تک متحد رہی، جب تک کہ جانشینی کا مسئلہ نازک صورت اختیار نہیں کر گیا۔ شاہجہان کے زمانے میں مغل فوج دارا شکوہ، شجاع، اورنگ زیب اور مراد کے تحت منقسم ہو کر خانہ جنگی میں الجھ گئی اور یہ ایسی صورت تھی جس سے ہر عہد کے آغاز میں شہزادوں کی نظر میں فوجی سرداروں کی قدر و قیمت بڑھ جاتی تھی۔ بڑے بڑے منصب دار مغلوں کی اس کمزوری سے باخبر تھے اور اس کے آخر عہد میں شہزادوں کے ساتھ ان کی کثرت سودے بازی ان کے اثر و رسوخ اور قوت و طاقت کی کافی علامت ہے لیکن تخت نشینی کی جنگوں کا سب سے مہلک اثر یہ ہوا کہ خصوصاً اورنگ زیب کے بعد نئے اور پرانے امرا میں تصادم ہوا اور امرا میں باہم خانہ جنگی شروع ہو گئی جس کا مقصد بظاہر شہزادوں کی حمایت اور دراصل اپنے مفادات کا حصول ہوتا تھا۔ یہ ایک المناک امر ہے اور اس کا بڑا دور رس اثر ہوا۔ اس کا فوری نتیجہ بادشاہ کی مرکزی حیثیت کے خاتمے اور مغل دربار کے انتشار کی شکل میں رونما ہوا۔ جہاں دار شاہ کے زیر حکومت ذوالفقار خاں کا فردِ واحد کی حکومت کا نظریہ اور بعد میں سید بھائیوں کا طرزِ عمل اس ادارے کی ناکامی کا نتیجہ تھا۔ فرخ سیر اور سید برادران میں کشمکش بادشاہ کی پرانی حیثیت بحال کرنے کی ایک کوشش تھی، جبکہ اس کا رو بہ زوال اقتدار دم توڑ رہا

تھا۔ اس کے باوجود ۱۷۰۷ء تک مغل سلطنت زوال کا شکار نہ ہوئی اور یہ عمل نادر شاہ کے حملے کے بعد شروع ہوا۔

لیکن کیا مغلوں کا یہ زوال برصغیر میں مسلمان حکومت کے زوال کے مترادف ہے؟ شاید ایسا نہیں ہے۔ اس سے کئی مسلمان حکومتیں ظہور پذیر ہوئیں، جنہوں نے مسلمان معاشرے کی ثقافتی، معاشرتی اور معاشی بہبود کے لئے زیادہ مثبت کام کیا۔ زوال مغلیہ بھی ان سیاسی و مذہبی تحریکوں پر اثر انداز نہ ہو سکا، جو زوال کی قوت کے ساتھ ہی منظرِ عام پر آئی تھیں۔ گو مسلمان زوال آمادہ قوتوں سے وقتی طور پر تو ضرور متاثر ہوئے لیکن جونہی انہیں موزوں قیادت میسر آئی، ان کے دل و دماغ کی پوشیدہ صلاحیتیں پورے دباؤ کے ساتھ پھوٹ کر سامنے آ گئیں۔ نظام الملک، نجیب الدولہ، مرزا نجف خان اور بعد میں سید احمد شہید کی جزوی کامرانیوں کا راز یہی تھا۔ یہ تمام جدوجہد مسلمانوں کی ان روایات کو زندہ رکھنے کے لئے تھی، جس پر ان کی گزشتہ نسلیں پھولتی پھلتی رہی ہیں۔

ایک گمنام مصنف کی کتاب "ضوابطِ عالمگیری"، امین الدین خان کی "معلومات الآفاق" اور شاکر خان کی "تاریخ شاکر خانی" میں دیئے گئے اورنگ زیب، شاہ عالم اور محمد شاہ کے عہد کے صوبائی محاصل کا جدول:

صوبہ	اورنگ زیب	شاہ عالم	محمد شاہ
بنگال	۵۲۴۶۳۲۴۰ دام	۵۲۳۷۳۹۱۱۰ دام	۴۶۲۹۱۰۵۱۵ دام
اڑیسہ	۱۶۲۸۴۱۰۰۰ 〃	۱۹۲۰۰۰۰۰۰ 〃	۱۸۹۷۷۰۵۹۰ 〃
بہار	۴۱۷۱۸۱۰۰۰ 〃	۴۲۱۷۹۷۰۱۹ 〃	۳۷۱۷۳۰۰۰۰ 〃

اودھ	۳۲۱۳۱۷۱۱۹ دام	۳۲۲۰۰۷۲۱۹۳ دام	۲۷۹۵۷۹۶۱۹ دام
الہ آباد	۶۸۸۱۶۸۱۰ 〃	۴۳۶۶۸۸۰۷۲ 〃	۳۰۷۵۲۰۰۰۰ 〃
آگرہ	۱۱۰۱۷۰۰۱۵۷ 〃	۱۰۵۱۷۰۹۲۸۳ 〃	۹۷۵۶۹۳۰۰۰ 〃
برار	۹۲۶۵۴۵۰۰۰ 〃	۹۵۰۰۰۰۰۰۰۰ 〃	۹۵۰۰۰۰۰۰۰ 〃
مالوہ	۴۲۵۴۸۶۶۷۰ 〃	۴۰۳۹۸۰۶۵۸ 〃	۳۳۹۰۱۰۰۰۰ 〃
گجرات	۳۵۴۷۴۲۱۳۵ 〃	۴۵۴۷۴۳۱۳۵ 〃	۳۴۸۳۸۳۰۹۶ 〃
اجمیر	۸۵۲۶۴۵۷۰۲ 〃	۶۳۴۸۹۴۰۰۰ 〃	
کابل	۱۶۱۰۴۹۳۵۴ 〃	۱۵۷۶۲۵۳۸۰ 〃	۱۲۶۲۸۵۰۰۰ 〃
کشمیر	۲۲۴۹۱۱۹۸۷ 〃	۲۱۳۰۷۴۸۴۶ 〃	۱۲۶۲۸۵۰۰۰ 〃
ٹھٹھہ	۵۸۸۱۶۸۱۰ 〃	۹۴۹۴۶۹۰۰ 〃	۴۵۱۹۵۰۰۰ 〃
ملتان	۲۱۴۴۴۹۸۹۶ 〃	۲۴۴۵۳۱۸۵۷۵ 〃	۲۳۹۵۰۰۰۰۰ 〃
لاہور	۸۹۸۹۴۳۲۱۷۰ 〃	۹۰۷۰۱۶۱۲۵ 〃	۹۵۶۵۷۰۰۰۰ 〃
دہلی	۱۲۲۲۹۵۰۱۷۷ 〃	۱۱۶۸۳۹۴۲۶۳ 〃	۹۳۹۳۴۵۰۰۰ 〃

دستور العمل غلام احمد میں دیئے گئے ۱۷۴۸ء عہد محمد شاہ کے مختلف صوبوں کے محاصل کا جدول:

مالوہ	۴۰۸۴۴۶۸۱۸
گجرات	۵۳۶۵۲۵۰۰
ملتان	۲۱۹۸۰۲۴۱۸
لاہور	۹۶۳۰۳۹۳۱۹

دہلی	۱۲۲۲۹۵۰۱۳۷
آگرہ	۹۶۱۲۶۸۱۸۵
الہ آباد	۴۲۲۳۳۶۶۲۷
بہار	۳۹۳۳۴۴۵۳۲
بنگال	۴۹۲۹۱۰۵۱۵

اسلام کا تصورِ حیات معاشی مُعاملات کے لیے

ڈاکٹر انور اقبال قریشی

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں " میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا"۔ اسلام کا دعوےٰ ہے کہ وُہ زندگی کے ہر شعبے میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ رہنمائی اللہ کی طرف سے کی گئی ہے لہٰذا یہ ہر رنگ میں افضل و اعلیٰ ہے۔ اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں اور یہ رہنمائی انسان کو مکمل زندگی بسر کرنے کے لیے مدد پہنچاتی ہے یہ ہر مسلمان کا جزوِ ایمان ہے۔

لیکن یہاں ایک غلط فہمی کا شروع میں ہی ازالہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مسلمان رہنما بلکہ بعض علما تک اکثر افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں اور قرآن کو مکمل کتاب کہہ کر ہر دنیوی مشکل کا اس میں تفصیلی حل ڈھونڈتے پر اصرار کرتے ہیں۔

قرآن پاک کی تعلیم اور رُشد و ہدایت ابدی ہے اور وقت اور مقام کی قیود سے آزاد ہے۔ لہٰذا کوئی ایسی کتاب ایسی تفاصیل اور جزئیات میں نہیں جا سکتی، جن کا تعلق کسی خاص وقت یا کسی خاص مقام سے ہو۔ اس میں تو صرف اصُولوں اور کُلیوں کی طرف ہی اشارہ ہو سکتا ہے۔ تفصیلات پر بحث نہیں ہو سکتی۔

لہٰذا معاشی معاملات کے متعلق قرآنی تعلیمات کا جائزہ لیتے وقت متذکرہ اصُولوں کو ہمیں پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ قرآن معاشیات کی کوئی نصابی کتاب نہیں ہے اور نہ

ہی معاشی اصولوں پر بحث کرتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ تمام اہم بنیادی اصول جن سے معتدل، انصاف پسند اور ترقی پذیر معاشرے کی معاشی بنیادیں قائم کی جا سکیں اور جس میں بنیادی انسانی حقوق کا معاشی تحفظ کیا جا سکے، وہ تمام تعلیمات قرآن پاک سے نہایت واضح اور جامع الفاظ میں ملتی ہیں اور ان پر عمل کرنے سے ہم ایک اعلیٰ و ارفع معاشرہ اور معاشرتی نظام قائم کر سکتے ہیں اور جو بات قرآن پاک میں نہیں ہے وہ رسولِ اکرمؐ کی زندگی اور معتبر احادیث سے مل جاتی ہے۔

آج کل دُنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں اصل دارانہ نظام (CAPITALISTIC SYSTEM) رائج ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف اقسام کی اشتراکیت جس میں سوشلزم اور کمیونزم کی مختلف اقسام شامل ہیں اُن کا بھی کئی ممالک میں دَور دورہ ہے۔

"یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ یورپ کے موجودہ تمدن کی ظاہری چمک دمک اور رنگ و نسل نے لوگوں کے دلوں کو ایسا اپنی طرف لبھایا ہے کہ دلائل کی بجائے یورپ کا طرزِ عمل ہی مسائل کے خطا و صواب اور اعمال کے خیر و شر کا معیار قرار پا گیا ہے۔ کسی رائے کے صواب اور اعمال کے خیر و شر کے لئے یہ دیکھنا کافی ہے کہ یورپ نے اس کا کیا فیصلہ کیا ہے اور اس بات میں اس کا طریق کار کیا ہے۔ اب وُہ ہر مسئلہ جو اس کے مطابق نہیں وُہ خطا اور ہر وُہ عمل جو اس کے موافق نہیں وُہ شر ہے۔ چنانچہ آج کل کے اکثر مدعیان کے نزدیک عقل کی یہی صحیح راہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں اس کی بدولت اپنے بہت سے مسائل میں اصول چھوڑنے پڑے۔ بہت سے عقائد میں مذہبی احکام کی غلطی محسوس کرنے لگے اور ہمارے بہت سے نوجوانوں کو اپنے مذہبی مسائل میں تبدیلی کا خیال پیدا ہونے لگا اور بہت سے متکلمینِ جدید نے اسلام کی مدافعت میں

معذرت اور اپالوجی کا رنگ اختیار کیا۔" متذکرہ الفاظ سید سلیمان ندوی مرحوم کے ہیں جو انہوں نے راقم الحروف کی کتاب "اسلام اور سُود" کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

یہاں ان الفاظ کا اعادہ اس لیے ضروری ہے کہ موجودہ نسل کے نوجوان اور کئی ایک لیڈر اور دانشور بھی سوشلزم یا اشتراکیت سے بہت مرعوب نظر آتے ہیں اور اس کی تاویلیں اسلام میں ڈھونڈتے ہیں۔

یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہم اصل اور خالص چیز کو چھوڑ کر بدل اور نقل کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں۔ اگر یہ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے تو پھر ضابطوں سے راہ نجات ڈھونڈنا کیا معنی!

آج کل دُنیا میں تین قسم کے معاشی نظام رائج ہیں۔ کیپٹل ازم (اصل دارانہ نظام) سوشلزم اور کمیونزم۔ ہم ان تینوں نظاموں کا مختصر تذکرہ اور ان کے بنیادی اصول ذیل میں درج کرتے ہیں۔ نیز یہ بھی بتائیں گے کہ ان نظاموں میں کیا کیا بنیادی خرابیاں ہیں اور اسلام کو ان میں سے کسی ایک سے ملایا نہیں جا سکتا۔ آخر میں ہم معاشی و معاشرتی میدان میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کا ذکر کریں گے، جس سے پتہ چلے گا کہ اسلام باقی نظاموں کی خرابیاں کس طرح دُور کرتا ہے اور کس طرح ان سب سے اعلیٰ و ارفع ہے۔

کیپٹل ازم:۔ اس نظام کو کاروباری آزادی کا نظام بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بنیادی اصول آدم اسمتھ کی مشہور کتاب "دولتِ اقوام" میں درج ہیں جو ۱۷۷۶ء میں شائع ہوئی۔ ان اصولوں میں کچھ اضافہ مالتھس، ریکارڈو اور مارشل نے کیا۔ یہ نظام اس وقت دُنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں رائج ہے۔ اگرچہ کسی جگہ بھی اس کے

بنیادی اصولوں پر پُوری طرح عمل نہیں کیا جاتا۔ اس نظام کا سب سے بڑا حامی امریکہ ہے۔

اس نظام میں فرد کو ہر قسم کی آزادی دی گئی ہے اور کاروباری نظام میں باہمی مقابلہ اس کی رُوح رواں ہے اور معاشی قوتوں کی آزادی سے طلب و رسد کا توازن ہوتا ہے۔ اور معاشرے کو مجموعی طور پر فائدہ ہوتا ہے۔

اس نظام کے تحت حکومت معاشی زندگی میں کم سے کم اور ناگزیر حد تک ہی مداخلت کرتی ہے اور معاشی قوتوں اور عوامل کو ہر طرح آزاد چھوڑ دیتی ہے۔ اصل دارانہ نظام کے تین بنیادی اصول ہیں۔

اصل داروں کو ہر طرح کی آزادی ہونی چاہیے کہ جس صنعت اور جس کاروبار کو پسند کریں اس میں اصل لگائیں۔ آزادیٔ شغل اصل مقام کی قید سے بھی آزاد ہونی چاہیے۔ کسی ملک کو یہ اختیار نہیں ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے ممالک کی اصل اپنے ہاں کاروبار پر لگانے میں کسی طرح کی تحدید کریں یا پابندی لگائیں۔

اصل دارانہ نظام کا زرّیں دَور ۱۸۷۰ء سے لے کر پہلی جنگ عظیم تک یعنی تقریباً نصف صدی تک رہا۔ یہ وہی زمانہ تھا، جب برطانوی سلطنت اپنے پُورے جاہ و جلال اور عرُوج پر تھی اور ان کی مملکت میں سُورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ برطانیہ میں صنعتی انقلاب سب سے پہلے آیا تھا اور اس ملک نے سب سے پہلے اس کی انتہائی منازل بامِ عروج تک پہنچا دی تھیں۔ برطانیہ کی آبادی کم تھی لیکن وہاں اصل کی انتہائی فراوانی تھی۔ برطانوی لوگ بنیے کی ذہنیت رکھتے ہیں اور یہ دُنیا بھر میں "دکانداروں کی قوم" کے نام سے مشہور ہیں۔ لہٰذا انھوں نے دُنیا بھر میں اپنا سرمایہ لگایا اور اسی طرح اکثر و بیشتر حصّوں میں سیاسی تسلط بھی حاصل کر لیا۔

اس نظام کا دوسرا بنیادی اصول تجارت کی آزادی ہے۔ آزاد تجارت کا پرچار سب سے پہلے نہایت شد و مد سے برطانیہ کے معاشیین نے کلاسیکل سکول (اسنادی سکول) سے کیا جس کے اہم اراکین آدم سمتھ، ریکارڈو اور مارشل تھے۔ اس میں انہیں اس وقت بہت کامیابی ہوئی۔ یہ ڈھونگ اس وقت رچایا گیا تھا جب برطانیہ صنعتی انقلاب کی آخری منازل خیر و خوبی سے طے کر چکا تھا اور اکثر دوسرے ممالک ابھی تک اس کی دہلیز تک ہی پہنچے تھے۔ اس حکمت عمل سے برطانوی کارخانوں کا مال دھڑا دھڑ آزادانہ دوسرے ممالک میں بکنے لگا۔

اس اصول کے تحت تجارت آزاد ہونی چاہیے تھی اور اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ نوخیز صنعتوں کو تامین دینے کا اصول جواب اس نظام میں پورے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے، شروع شروع میں اس کی بھی شدید مخالفت کی گئی۔ چنانچہ جب انیسویں صدی کے چوتھے دَور میں ہندوستان میں سُوتی کپڑے کے کارخانے قائم کئے گئے، اس وقت سُوتی کپڑے کی درآمد پر حکومت کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پانچ فیصد معمولی کسٹم عائد تھا۔ لنکاشائر کے کارخانہ داروں نے جن کا برطانوی حکومت پر بہت اثر تھا اعتراض کیا کہ اس محصُول سے ہندوستانی کارخانہ داروں کو تامین مل جاتی ہے جو آزادیٔ تجارت کے منافی ہے۔ برطانوی کارخانہ داروں کے ساتھ یہ ناسلوکی ہے۔ لہٰذا کچھ عرصہ تک ہندوستانی کارخانوں پر درآمدی کسٹم کے محصُول کے بدل کے طور پر ایکسائز (EXCISE) کا محصُول عائد کر دیا گیا۔ لیکن بیرُونی تسلط میں کمی اور آزادی کی روح جوں جوں اکثر غلام ممالک یا نیم آزاد ممالک میں ترقی کرتی گئی، تامین کا اصول نوخیز صنعتوں کے تحفظ کے لئے رائج ہوتا گیا۔ یہ اصل دارانہ نظام کے تابوت میں پہلی میخ تھی

جگا ڈھی گئی۔ اسی نظام کا دوسرا اصول یہ تھا کہ شغل اصل کی ہر طرح کی آزادی ہو اس پر کسی قسم کی پابندی نہ ہو اور اصل دار جس میں ملک میں چاہیں جا کر اپنا اصل لگا سکتے تھے۔

چونکہ اس وقت اکثر ممالک میں اصل کی کمی تھی خود امریکہ ایسا ملک انیسویں صدی تو کیا پہلی جنگ عظیم تک اصل کا بھوکا اور دوسرے ممالک کا مقروض تھا لہٰذا اس کی چنداں مخالفت نہ ہوئی۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد اس میں بھی شگاف پڑنے لگے اور جب ۱۹۲۹ء میں عظیم کساد بازاری کا دور شروع ہوا تو یہ کام بھی کافی حد تک ٹھیک ہو گیا۔

اس نظام کا تیسرا بنیادی اصول محنت کی آزادی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مزدور جس طرح کا کام جہاں چاہے اختیار کرے۔ اس کا یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ اگر انگلستان میں مزدوری کم ملتی ہے اور امریکہ یا کینیڈا میں زیادہ ملتی ہے تو مزدور کو یہ آزادی حاصل ہو کر وہ ترک وطن کر کے کسی دوسرے ملک کا آزاد شہری بن سکے۔ یہ آزادی بھی پہلی جنگ عظیم سے قبل اکثر و بیشتر ممالک میں رائج تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ جہاں اب سخت قسم کی پابندیاں بیرونی ممالک کے مزدوروں پر عائد ہیں اسی طرح آباد ہوا۔ وہاں نقل مکانی کی کلیتہً آزادی تھی۔

اس اصل دارانہ نظام کے تینوں بنیادی اصول بہت سی پابندیوں میں جکڑ دیئے گئے ہیں۔ اس نظام کا روشن پہلو یہ ہے کہ دُنیا کے اکثر ممالک نے اس نظام کے تحت بہت ترقی کی ہے۔ لیکن اس نظام میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس نے استحصال کے ابواب ایک دم کھول دیئے ہیں۔ اخلاقی بندھنوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور بے راہ روی عام ہو گئی ہے ایک اصل دار کو اس نظام میں اس امر کی کھلی اجازت ہے کہ وہ جس کاروبار کو اپنے لیے منافع بخش سمجھے اسے اختیار کرے۔ معاشرے یا اخلاق پر اس کے کیا اثر ہوتے

ہیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ مشہور ڈرامہ نویس برنارڈ شا نے اس نظام پر اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر ملک میں مزدوروں کے لیے مکانوں کی سخت ضرورت ہو مگر اس میں منافع زیادہ نہ ہو لیکن اس کے برعکس اگر قحبہ خانے تعمیر کرنے میں زیادہ منافع ہو تو اصل دارانہ نظام میں مزدوروں کے مکان تعمیر نہیں ہوں گے بلکہ قحبہ خانے بنائے جائیں گے اور اصل دار کی اس آزادی کو محدود کرنے کا کسی فرد یا حکومت کو حق نہ ہو گا۔

اس نظام کی سب سے بڑی لعنت سودی کاروبار کی کھلی آزادی ہے اور مزدوروں کی بیروزگاری کا کوئی انتظام نہیں۔ شخصی آزادی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔

بڑی وجہ اس نظام کے خلاف بڑھتی ہوئی تنقید کی یہ ہے کہ اس میں عوام کے استحصال کے دروازے کھلے ہیں۔ بیروزگاری کو روکنے کے لیے کوئی انتظام نہیں۔ اس سلسلے میں دوسری جنگ عظیم کے بعد کئی اقدامات کئے گئے ہیں جو اس اصول کی روح کے منافی ہیں۔ اور سب سے بڑی لعنت اس نظام میں یہ ہے کہ اس میں دولت کا بےحد ارتکاز ہوتا ہے۔ اور دولت محدود ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ جس سے بہت سی سیاسی، معاشی اور معاشرتی خرابیوں کے ابواب کھل جاتے ہیں۔ جواء، سٹہ بازی، شراب نوشی اور جنسی بے راہ روی اس نظام میں خوب پھلتے پھولتے ہیں۔

سوشلزم یا اشتراکیت:۔ اصل دارانہ نظام نے سب سے پہلے برطانیہ میں ترقی کی اور یہاں ہی سب سے پہلے اس کے خلاف احتجاج شروع ہوا۔ برطانیہ ہی پہلا ملک تھا، جہاں مزدوروں کی مضبوط جماعت قائم ہوئی۔ جس کا مقصد آئینی طریق سے سیاسی غلبہ حاصل کر کے ملک میں سوشلزم کا نظام قائم کرنا تھا۔ اہل برطانیہ چونکہ مجھوتہ بازی اور میانہ روی

کے لیے مشہور ہیں۔ لہٰذا جو سوشلزم کی قسم یہاں رائج ہوئی وہ بھی معتدل کی قسم کی تھی جسے FABIAN سوشلزم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سوشلزم کی مختلف اقسام پر یہاں بحث کا موقع نہیں لہٰذا مختصراً اہم FABIAN سوشلزم کے چند اصول یہاں درج کرتے ہیں۔

۱۔ صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینا۔

۲۔ بھاری ٹیکس لگا کر نجی ملکیت کی تحدید کرنا۔

۳۔ مزدوروں کی حالت بہتر بنانا، ان کے لیے روزگار، طبی اور تعلیمی سہولتیں مہیا کرنا اور سستے کرائے کے مکان مہیا کرنا۔

اس تحریک سے برطانیہ میں مزدوروں، بالخصوص شہری مزدوروں کو (کیونکہ برطانیہ ایک صنعتی ملک ہے جس کی آبادی زیادہ تر قصبات میں رہتی ہے) بہت فائدہ پہنچا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں دُنیا میں پہلی مرتبہ مزدوروں کی جماعت پارلیمنٹ میں کثرت سے منتخب ہوئی اور مزدور جماعت یعنی لیبر پارٹی کی حکومت برطانیہ میں قائم ہوئی۔ ابھی دو سال پہلے پھر لیبر پارٹی کی حکومت تھی۔ اب پھر قدامت پسند جماعت نے غلبہ حاصل کر لیا ہے لیکن لیبر پارٹی حزبِ اختلاف کی حیثیت سے سب سے طاقتور جماعت ہے اور کسی وقت بھی دوبارہ اکثریت حاصل کر سکتی ہے۔ سوشلسٹ نظام میں بھی اخلاق کے بندھن اسی طرح کمزور ہیں اور بے راہ روی تو اور بھی زیادہ ہے۔ سُود خوری پر بھی کوئی تحدید نہیں۔

کمیونزم (COMMUNISM) یہ اشتراکیت کی انتہائی قسم ہے۔ اس کا پرچار انیسویں صدی کے وسط میں کارل مارکس نے کیا اور جسے ۱۹۱۷ء کے رُوسی انقلاب میں لینن نے عملی جامہ پہنایا۔ اس میں نہ صرف ذرائع پیدائش پر حکومت کا پورا پورا تسلط ہے بلکہ ذرائع صرف پر بھی۔ روس اور چین اشتراکی ممالک میں سرفہرست ہیں۔

ایسے نظام میں شخصی آزادی کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ صرف ایک سیاسی جماعت ہوتی ہے جو ملک کے ہر قسم کے وسائل پر پورا اقتدار رکھتی ہے۔ یہاں نہ پریس کی آزادی ہے نہ تحریر و تقریر کی حتیٰ کہ پیشوں کے انتخاب کی بھی کوئی آزادی نہیں اور مذہب کا کلیتہً خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

مزدوروں کا پیٹ بھرنے کا تو انتظام ہے لیکن ان کی رُوح خالی رکھی جاتی ہے۔ امیر و غریب کا فرق کاغذی طور پر تو مٹا دیا گیا ہے لیکن حکمران پارٹی کے افراد کو غیر معمولی مراعات حاصل ہیں۔ عوام کو زبان کھولنے کی اجازت نہیں۔ سٹالن کے زمانے میں تو کان کے کچے حکمرانوں نے معمولی سی کانا پھوسی کی بنا پر ہزاروں افراد کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔

یہ تھا مختصر تذکرہ دُنیا میں مروّجہ تین اہم نظاموں کا۔ اسلام کا ان میں سے کسی نظام سے تعلق نہیں اور اس کا کسی سے کوئی تعلق قائم کرنا اسلام کے ساتھ سراسر ناانصافی کرنا ہے۔

اسلام کا معاشی نظام

آئیے اب ہم دیکھیں گے کہ متذکرہ معاشی نظاموں میں جو خرابیاں ہیں اسلام ان کا کیسے تدارک کرتا ہے اور اس کا اپنا نظام کس طرح دوسرے سب نظاموں سے اعلیٰ و ارفع ہے۔

تینوں نظاموں کا مختصر خاکہ جو ہم نے پیش کیا ہے ان سب میں اخلاقی بندھن موجود نہیں، حلال و حرام کا تصور موجود نہیں بلکہ سیاسی میدان میں تو ان سب میں میکاولی کا مقولہ مروّج ہے کہ حصولِ مقصد کے لیے سبھی ذرائع جائز ہیں (THE END JUSTIFIES THE MEANS)

اسلام اس کی نہایت سختی سے ممانعت کرتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ذرائع بھی نیک و پاک ہونے چاہئیں۔ محض مقصد حاصل کرنا کوئی چیز نہیں۔ زندگی کے باقی شعبوں میں حلال و حرام کا تصور پیش کرکے اسلام نے بہت سی بنیادی خرابیوں کو دور کر دیا ہے اور انسانیت کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔

اسلامی قوانین کی رُوح یہ ہے کہ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ یوم سزا و جزا پر کامل ایمان رکھے اور اُسے اس بات کا یقین کامل ہو کہ اس موت کے بعد زندگی ہے اور قیامت کے دن اُسے اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے اعمال کا حساب پیش کرنا ہوگا۔ اگر دُنیا میں کوئی اس کے جرائم یا بداعمالیوں کو نہیں دیکھتا اور یہاں اس کی پکڑ دھکڑ نہیں ہو سکتی تو مسلمان کا ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کی کوئی بات چھپی ہُوئی نہیں ہے۔ وُہ ہر چیز کو دیکھتا اور جانتا ہے۔ لہٰذا اگر دُنیا کی نگاہ اور سزا سے بچ بھی جائے تو اللہ تعالیٰ کی نگاہ اور سزا سے بچ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی رحیم اور کریم ہے وُہ بہت مہربان اور بخشش کرنے والا ہے غلطیوں کو معاف کرنے والا ہے اور توبہ کے دروازے اس کے حضور میں ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ بلکہ قرآن پاک میں تو اللہ تعالیٰ نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس کی ذات سے ہرگز مایوس نہیں ہونا چاہیئے یہی وجہ ہے کہ اسلام میں خودکشی حرام ہے۔

لیکن یہیں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ قرآن پاک نے حقوق العباد پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ جہاں تک ان گناہوں کا تعلق ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی پر مبنی ہیں۔ مثلاً نماز نہ پڑھنا، روزہ نہ رکھنا، حج اگر فرض ہو تو اُسے ادا نہ کرنا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا۔ لیکن جہاں تک بندوں کا قصور ہوگا وُہ تو بندوں سے ہی معاف کروائے جائیں گے اور اس کا معاوضہ ان نیکیوں کی صُورت میں ہوگا جو حقوق العباد کے سلسلے میں بڑھ

چڑھ کر کی گئی ہوں۔ اسی لئے زکوٰۃ کی ادائیگی کے متعلق قرآن میں بار بار تاکید کی گئی ہے۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ تم جس قدر ہو سکے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ لہٰذا صدقات پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔

اسی طرح خوش معاملگی پر زور دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ قرآن میں اس کی تائید کی گئی ہے کہ تمام معاملات و معاہدات کو ضبطِ تحریر میں لایا کرو۔ بیشمار معتبر احادیث موجود ہیں جن کی رُو سے رسُول اکرم صلعم نے ہمسایہ کے حقوق اور ان کی نگہداشت پر بہت زور دیا ہے بھوکے کو کھانا کھلانا، غرض مند کی حاجت پوری کرنا، قرضداروں کو قرض کے بندھن سے چھڑانا، (جبکہ وُہ ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں) ان سب امور پر بہت زور دیا گیا ہے۔

زکوٰۃ تو صرف ایک لازمی صدقہ ہے باقی اللہ کی راہ میں جس قدر خرچ کیا جائے اسی قدر اس کا ثواب حاصل ہوگا۔ اسلام نے نہ صرف اخلاقی بندھن مضبوط کرنے پر زور دیا ہے بلکہ تقویٰ اور متقی کا تصور بھی پہلی بار پیش کیا گیا ہے۔ شراب نوشی جو دُنیاوی لعنتوں اور بدکرداری کی جڑ ہے اس کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ جوئے بازی سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ سچ بولنے، پورا تولنے اور اپنے وعدوں کو پُورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ غرضیکہ ایک صحت مند معاشرے کے لئے بہت سے احکام قرآن پاک میں موجود ہیں۔ یتیموں کی اعانت اور خبرگیری کا بار بار تذکرہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی بتا دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ وُہ گناہ تو معاف کر دیں گے، جو اس کے احکام کے خلاف ہوں گے۔ لیکن حقوق العباد کی معافی تو جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے صرف ان نیکیوں سے ہی مل سکے گی جو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کی گئی ہیں۔ لہٰذا ایک خدا ترس اور اسلام پسند معاشرے میں مسلمان حقوق العباد کا پورا پورا خیال خود بخود رکھنے پر مجبور ہوں گے۔

موجودہ اصل دارانہ نظام جو دُنیا کے اکثر و بیشتر حصّوں میں رائج ہے، اس کی سب سے بڑی لعنت ارتکاز ہے۔ دولت کے چند ہاتھوں میں سمٹ جانے سے نہ صرف طرح طرح کی معاشی و معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، بلکہ اس سے سیاسی بدعنوانیوں کے دروازے بھی بہت فراخ ہو جاتے ہیں۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ ہے کہ اکثر و بیشتر ممالک میں بیجوڑی اپنی دولت کے بل بوتے پر دُنیا کی اکثر حکومتوں پر بالواسطہ اتنا اثر و رسوخ رکھتے ہیں کہ حکومتیں ان کی ہر قسم کی ناجائز خواہشات اور اقتدار کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتیں۔ بیجوڑیوں کی قوت کا بڑا سبب موجودہ سُود خوری کا نظام ہے۔ اسلام سُود خوری کی سختی سے مخالفت کرتا ہے۔ ارتکاز دولت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ سُود پر قرضہ لے کر بڑی تعداد میں ذخیرہ اندوزی کی جاتی ہے اور اس طرح بازاروں کی رسد کو اپنے قابو میں لا کر مال کو من مانی قیمتوں پر فروخت کیا جاتا ہے۔ ذخیرہ اندوزی کے علاوہ ارتکاز دولت کا ایک بڑا سبب حاضر کی بجائے وعدے کے سودے ہیں جسے سٹہ یا تخمین کہا جاتا ہے۔

اسلام نے ذخیرہ اندوزی اور تخمین کے کاروبار کو سختی سے منع کیا ہے اور صرف حاضر معلوم خریدنے پر زور دیا ہے۔ اگر ان اصُولوں پر عمل کیا جائے تو ارتکاز دولت کے بنیادی اسباب ختم ہو جائیں گے۔ دولت کا چند ہاتھوں میں جمع ہونے کا ایک دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ اکثر مذاہب اور معاشروں میں زمینداروں کا حق صرف بڑے بیٹے کو دیا گیا ہے، باقی بیٹے زمین کی ملکیت سے محروم رہتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں جاگیرداری نظام کو فروغ حاصل ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اکثر و بیشتر ممالک میں یہ قانون رائج تھا جسے کہا جاتا ہے۔ عورتوں کو وراثت سے تو حال تک اکثر ملکوں میں محروم رکھا گیا ہے۔ لہٰذا دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ تاریخ عالم

LAW OF PRIMOGENITURE

میں اسلام کا یہ زریں کارنامہ ہے کہ اس نے انتقالِ املاک اور وراثت میں نہ صرف سب بیٹوں کو یکساں حق دیا بلکہ بیٹیوں اور بیویوں کو بھی حصّہ میں حقدار قرار دیا جس سے ارتکاز دولت کے ذرائع انتہائی محدود ہو گئے۔

امرا کی دولت میں غریبوں کا حصّہ زکوٰۃ سے دلوایا گیا ہے اور اس کو مزید پھیلانے میں صدقات پر زور دیا گیا ہے۔ بلکہ قرآن نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں وُہ گویا اللہ کو قرض دیتے ہیں۔

غیر اسلامی معاشرہ کی ایک بڑی لعنت مختلف قسم کی جوا بازی ہے جس میں لوگ اپنی عورتیں تک ہار دیتے ہیں۔ گھوڑ دوڑ سے جو تباہی کے دروازے کھلتے ہیں وہ سب پر ظاہر ہیں۔ اسلام ان سب بدعتوں اور بداعمالیوں کا سختی سے سدِباب کرتا ہے۔

اصل دارانہ نظام میں پیدائشِ دولت اور تقسیم دولت میں تضاد

اصل دارانہ معاشرے میں یہ تضاد شدت سے پایا جاتا ہے۔ اگرچہ مزدوروں کی اتحادی تنظیموں کی ترقی تعلیم کے عام رواج سے اور دیگر عوام کی وجہ سے نچلے طبقے کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے لیکن یہ تضاد اپنی جگہ پر قائم ہے۔ کیونکہ اس نظام میں پیدائش کا مقصد دولت کمانا ہے۔ اس کی نہ تو منصفانہ تقسیم ہے اور نہ اس امر پر تحدید ہے کہ دولت کمانے کے لیے جو ذرائع استعمال کئے جائیں وہ حلال ہوں۔

اسلام اس تضاد کو حلال و حرام کے واضح تصوّر سے دُور کرتا ہے۔ اگر اس طرف سے بھی کچھ کسر باقی رہ جائے تو اُسے تقوے اور متقی کے تصوّرات سے پُورا کیا گیا ہے۔ ایک خدا ترس اور متقی تاجر یا آجر نہ تو بددیانتی کرتا ہے اور نہ ہی ناجائز ذرائع استعمال

کرتا ہے۔ چیزوں میں ملاوٹ اور کم تولنا جو آج کل کی عام لعنتیں ہیں اسلام انہیں بنیادی طور پر دُور کرتا ہے۔

خلافتِ راشدہ کے دَور کی عملی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ قرآن میں بار بار فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں وہ اللہ کے محبوب بندے ہیں۔ لہٰذا ان بیّن اور واضح احکامات کی روشنی میں استحصال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام ہر قسم کے لہو و لعب سے بھی منع کرتا ہے اور میانہ روی پر زور دیتا ہے۔

اسلام میں اخوت اور مساوات کی جو رُوح قائم ہے، اس کے پیشِ نظر اس بات پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے کہ اسلامی معاشرے میں حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ بیت المال سے معاشرے کے ہر فرد کی بنیادی ضروریات کو پُورا کرنے کی ذمّہ داری لے۔

مزدُور کے متعلق کہا گیا ہے کہ پیشتر اس کے کہ اس کا پسینہ خشک ہو اس کی مزدُوری ادا کر دی جائے اور آجر و مزدور میں .... اسلامی مساوات کا اصُول برتا جائے بہتری اور کہتری کا نہیں۔

غرضیکہ اسلامی نظام کی رُوح یہ ہے کہ ایک عدل پسند معاشرہ قائم کیا جائے جس میں سب کے بنیادی حقوق مساوی ہوں۔ امیر و غریب کا فرق اور آمدنیوں کی عدم مساوات اسلام میں قائم رہے گی لیکن اس کے بُعد کو کم کرنے کی بیشمار عملی تدابیر اسلامی نظام میں موجود ہیں اور یہی حقیقت پسندی اسلام کی رُوحِ رواں ہے اور اسی نظام کو جو ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، باقی نظاموں سے ممیز کرتی ہے۔

نظریۂ پاکستان اقتصادی پہلو سے

مولانا جعفر شاہ پھلواروی

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسُولہِ الکریم

صدرِ عالی قدر اور سامعین با تمکین!

اس وقت ہم جس مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ اس میں نظریۂ پاکستان ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ جیسے اسلامی سوشلزم سمجھ میں نہیں آیا، اسی طرح نظریۂ پاکستان بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخاب کی پیداوار ہے یہ لفظ۔ پاکستان ہو نہ ہو، اس کا وجود ہو، نہ ہو، اسلام باقی رہے گا۔ نظریۂ پاکستان کیا ہوتا ہے؟

اگر نظریۂ پاکستان اسلام ہی ہے تو آؤ ہم معانقہ کر لیں گے اس کے ساتھ اور اگر اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے تو اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ ہم اس سے بحث نہیں کریں گے۔ ہم تو صرف اسلام سے بحث کریں گے۔ ہم جس مرحلے سے گزر رہے ہیں، اس میں ہمارے دماغوں میں کچھ تحریکیں پیدا ہوئی ہیں لیکن ابھی کچھ دماغ ہل گئے ہیں اور اس کے بعد کچھ زبان پر آنے لگا ہے۔ اب عمل کی باری ہے۔ لیکن بقول اکبر الٰہ آبادی

ریزولیوشن کی شورش تو بہت ہے اور عمل غائب
پلیٹوں کی صدا آتی ہے اور کھانا نہیں آتا

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حیا ان کو نہیں آتی، انہیں غصہ نہیں آتا

عمل سے ہم بھی ویسے ہی خالی ہیں جیسے آپ خالی ہیں۔ آپ تو کچھ نہ کچھ ہوں گے عامل میں تو بہت ہی کورا ہوں اور نہایت شرمندگی کے ساتھ یہ اعتراف، اقرار اور اعلان کرتا ہوں کہ جو کچھ میرے دماغ میں ہے، جو کچھ میری زبان پر ہے اس میں عمل کا حصہ بہت ہی کم ہے، صفر کے برابر ہے۔

جناب والا میری ایک ضروری گزارش یہ ہے کہ میری کوئی فکر، میری کوئی سوچ یا میری کوئی تقریر حرفِ آخر نہیں ہے۔ میری غرض صرف اتنی ہے کہ میں یہاں تک پہنچا ہوں آگے آپ پہنچائیں۔ اس لئے اس کو حرفِ آخر اور ایک حتمی فیصلہ نہ سمجھئے اس لئے کہ میں کتاب و سنت پر غور کرتا ہوں اور اس سے جو نتیجہ اخذ کرتا ہوں، آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ جو غلطی نکالے اس کا سب سے زیادہ شکر گزار ہوتا ہوں میں۔ وہ زیادہ محسن ہے ہمارا، جو ہماری غلطیاں ہم پر واضح کر دے مگر طنز کے طور پر نہیں۔ تعمیری نکتہ چینی بہت اچھی بات ہے۔

میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بنی آدم میں یہاں سے وہاں تک عرصۂ دراز سے کش مکش چلی آتی ہے۔ جب دیکھو، ایک دوسرے کو قتل کر رہا ہے، مار رہا ہے، لوٹ رہا ہے، ذبح کر رہا ہے۔ آخر یہ کش مکش ہے کیسی؟ میں نے سوچا، زمانہ قبل از تاریخ کو چھوڑ دو۔ محمدی اسلام کے وقت سے لیجئے، آخر یہ کش مکش کا ہے کی تھی؟ ہمارا خیال ہے کہ شاید نماز روزے کی کش مکش ہو گی؟ یہ نہیں کہ نہیں، تھی۔ لیکن نماز روزے سے کافروں، مشرکوں کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اب میں یہی عرض کروں، کوئی بڑی داڑھیاں رکھنے کی ضرورت نہیں، کوئی لمبی تسبیح لے کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں قلندر بن کر کسی مسجد کے گوشے میں بیٹھ جائیے اور "لا الٰہ الا اللہ" "لا الٰہ الا اللہ" کی ضربیں لگائیے۔ تیسرے دن

محلے کے لوگ آپ کے معتقد اور مرید ہونے شروع ہو جائیں گے اور چوتھے دن سے نذریں آنی شروع ہوں گی۔ روپے برسنے لگیں گے کہ اللہ! بڑا پہنچا ہوا آدمی ہے۔ رب رب کرتا ہے، اللہ اللہ کرتا ہے۔ جب دیکھو لا الٰہ الا اللہ کر رہا ہے۔ اب بھی "لا الٰہ الا اللہ" میں، نماز روزے میں اتنا اثر ہے۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی "لا الٰہ الا اللہ" کہا تھا، صحابۂ کرام بھی تو لا الٰہ الا اللہ کہتے تھے۔ یہ کوئی تبرا نہیں ہے، چند حروف ہیں "لا الٰہ الا اللہ" لیکن وہاں دشمن ہو رہے ہیں لوگ، پتھر مار رہے ہیں، گالیوں اور تالیوں سے استقبال کر رہے ہیں۔ وجہ کیا ہے اس کی؟ ہم لا الٰہ الا اللہ کی ضربیں لگائیں تو ہم پر روپے برسیں اور وہ "لا الٰہ الا اللہ" کہیں تو ان پر پتھر برسیں۔

اب مجھے صرف ایک بات بتا دیجیے صاف صاف، کلمہ پڑھنا ان کو نہیں آتا تھا یا ہم کو نہیں آتا، اس کا فیصلہ کر لیجئے۔ اگر ان کو نہیں آتا تھا، تو ہمیں آتا ہے (نعوذ باللہ) اگر ان کو آتا تھا تو ہمیں نہیں آتا۔ معلوم ہوا، نماز روزے کا جھگڑا نہیں تھا۔ اب بھی اگر آپ نماز روزہ کریں تو بہت سے غیر مسلم بھی آپ کے معتقد ہو جائیں گے۔ ایک دور ہم پر کپور تھلے میں امامت و خطابت کا گزرا ہے۔ مسلمانوں سے زیادہ ہندو اور سکھ میرے پاس تعویذ گنڈے لینے کے لئے آتے تھے، جھاڑ پھونک کرانے کے لئے آتے تھے۔ یہ نماز روزے کی لڑائی نہ تھی، پھر کا ہے کی لڑائی تھی؟ بتوں کی لڑائی نہ تھی، بت ہوتا ہی کیا ہے؟ بے جان چیز:

بت کے آگے سجدہ کرنا چھوڑ دے اے برہمن
جس کو بندے نے بنایا وہ خدا کیونکر ہوا؟

وہ جانتے تھے، ان کے ہاتھوں کا تراشا خراشا اور کیا ہوگا۔ کعبے میں ۳۶۰ بت

رکھے ہوئے تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کو بھی نہیں توڑا، وہیں طواف کرتے رہے، وہیں نماز بھی پڑھتے رہے۔ بتوں سے کوئی لڑائی نہیں تھی۔ اچھا قرآن مجید تو آپ کے سامنے ہے، مکی آیات میں ایک آیت بھی بتا دیں، جس میں یہ کہا گیا ہو کہ اے ظالمو! تم بت کو پوجنا چھوڑ دو، اس کو سجدہ کرنا چھوڑ دو، ورنہ جہنم میں جاؤ گے۔ تیسویں پارے میں ایک سورت کے سوا باقی سب مکی آیتیں ہیں۔ مکی آیات میں صرف دو جگہ بتوں کا ذکر ہے۔ ایک بر سبیل تذکرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بت توڑنے کا ذکر ہے اور ایک حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بتوں کا ذکر ہے۔

وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۔

جب جنگ ہو رہی ہو، مسلم اور غیر مسلم میں، ہم کہتے ہیں کہ وہاں بتوں سے ان کی لڑائی تھی۔ قرآن تو اتنی فراخدلی دکھاتا ہے کہ یہ تمہارے ذمی ہیں۔ ان کے بتوں کی، ان کے مندروں کی، ان کی صلیبوں کی، ان کے کلیساؤں کی حفاظت تمہارے ذمے ہے۔ لڑائی اس کی نہیں ہے، لڑائی کچھ اور ہے۔ لیکن یہی نہیں، مجھے صرف ایک پہلو پر گفتگو کرنی ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ مجھے دوسرے پہلو سے انکار ہے، دنیا میں ہر جگہ ایک ہی کش مکش رہی ہے، سب سے بڑی، دوسری کشمکشیں ہیں، ہمیں اس سے انکار نہیں، سب سے بڑی کشمکش رہی ہے دنیا میں HAVE اور HAVE NOT کی۔ سرمایہ داری اور بے مائیگی کی۔ مسلمان مسلمان کا خون چوستا ہے، کافر کافر کو مارتا ہے، عیسائی عیسائی کا دشمن ہے، یہودی یہودی کو کھا جاتا ہے۔ صرف بے مائیگی اور سرمایہ داری کی، اصل میں جنگ اسی کی رہی ہے اور اس کے اندر ہر شخص نے، ایک نے نہیں، دونوں نے کوشش کی ہے کہ مذہب کو، دین کو یا آجکل کی اصطلاح میں لیجیے، اسلام کو اپنی حمایت کے لئے ایک ذریعہ، ایک آلہ اور

دلیل بنایا ہے۔ یہی سب سے بڑی کش مکش ہے۔ ورنہ دوسری کش مکشیں، اس سے انکار نہیں اور بڑی بڑی ہیں لیکن سب سے بڑی کشمکش ہے دنیا میں سرمایہ داری اور بے مائیگی کی جنگ ہے۔

اب میں بجائے اس کے کہ خود کچھ کہوں چاہتا ہوں کہ مصورِ پاکستان اور ترجمان اسلام حضرت علامہ اقبالؒ کی زبان سے آپ کچھ سن لیجئے کہ وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ لیکن ایک اور بات اس سے پہلے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہمارے لئے حجت صرف دو ہی چیزیں ہیں، کتاب اور سنت۔ کتاب اللہ کیا کہتی ہے وہ بھی آپ سن لیں گے اور سنتِ رسول اللہ کیا ہے؟ مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا کہ تقسیم ملک سے پہلے امرتسر میں ایک جگہ ہے، وہاں ہمارے ایک محترم عزیز دوست نے جلسہ کیا۔ مجھے بھی بلایا۔ وہاں بڑے بڑے قد آور قسم کے علمائے کرام موجود تھے جن کی داڑھیاں ہمارے اسلام سے بھی زیادہ لمبی تھیں۔ وہ سب وہاں تشریف لائے تقریریں ہوئیں گرما گرم۔ اس کے بعد دستر خوان بچھا۔ دستر خوان پر میرے سامنے میرا ایک شاگرد مؤدب دو زانو ہو کر بیٹھا تھا۔ ایک مولانا نے غیظ و غضب کی نگاہ سے دیکھا اور کہا، تم خلافِ سنت بیٹھے ہوئے ہو، اس طرح بیٹھو، جس طرح میں بیٹھا ہوں۔ وہ بیچارا اس سے ڈر کر اسی طرح بیٹھ گیا۔ میں نے کہا، مولانا! اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔ وہ کہنے لگے ہاں! فرمائیے۔ میں نے کہا کہ دو زانو بیٹھ کر کھانے کی روایت بھی ہماری نظر سے گذری ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں آتا، دو زانو بیٹھ کر کھائیے۔ چار زانو بیٹھ کر کھائیے یا کھڑے ہو کر بوفے سسٹم کے تحت کھائیے، اسلام میں کوئی فرق نہیں آتا۔ افسوس اس کا ہے کہ بعض وہ سنتیں ہیں، جو متفق علیہ ہیں اور جن سے کسی کافر کو بھی انکار نہیں ہے، ان پر کوئی مولوی عمل نہیں کرتا۔ کہا، کون سی سنت؟ میں نے کہا تھوڑا کھانا سب سے بڑی سنت ہے۔ کوئی مولوی اس پر عمل نہیں

کرتا ہے۔ اصل چیز تو ہے سُنّت۔ وہی مزید ار سُنّتیں مثلاً شہد چاٹنا سُنّت ہے، تعدّدِ ازدواج سُنّت ہے، مسواک کرنا سُنّت ہے، پنیر کھانا سُنّت ہے، قیلولہ کرنا سُنّت ہے۔ افطار میں جلدی کرنا سُنّت ہے اور جتنی مزید ار سُنّتیں ہیں سب یہی ہیں اور جو اصل سُنّت ہے، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی ہے۔ اس سُنّت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ مگر ایک بات سُن لیجئے کہ اقبالؒ خود ہیں کیا؟ ہم لوگوں کو اس معاملے میں بڑی غلط فہمی ہو گئی ہے۔

یہ تو حاشیۂ خیال میں بھی لانا چاہئے کہ علامہ اقبالؒ انسانی زندگی اور اس کے کسی گوشے کے لئے اسلام کو ناکافی سمجھتے تھے اور اس کے کسی خلا کو پر کرنے کے لئے کسی کافرانہ نظام سے کوئی چیز مستعار لینا ضروری خیال کرتے تھے۔ وہ اسلام کو پوری انسانی زندگی کے لئے اور ہر بدلتے ہوئے دور کے لئے آخری ہدایت نامہ یقین کرتے تھے۔ انہوں نے تمام نو ایجاد "ازموں" کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ہر ایک ازم کے عیب و صواب پر ان کی عقابی نگاہ بھی رہتی تھی۔ وہ بڑے متصلّب مسلمان تھے مگر متعصب مسلمان نہ تھے۔ انہیں جہاں کوئی عیب نظر آیا اسے عیب ہی بتایا، خواہ وہ مسلمانوں میں مقبول ہی کیوں نہ ہو اور جہاں کوئی خوبی دکھائی دی اسے خوبی ہی بتا کر پیش کیا خواہ اہل کفر ہی میں پائی جاتی ہو۔ اسلام میں انہیں کوئی خامی، کوئی کمی اور کوئی عیب نظر نہ آسکا لیکن اسلام کو وہ تنگدلانہ نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ اس بارے میں ان کی نگاہ بڑی وسعت کی حامل تھی۔ وہ اسلام کو ایک متحرک دین سمجھتے تھے اور اسے ہدایہ و شرح وقایہ میں محدود نہیں جانتے تھے۔ دنیا کی ہر گزشتہ، موجودہ اور آئندہ صداقتوں کو وہ اسلام ہی کہتے تھے۔ اگر کسی غیر مسلم قوم میں کوئی صداقت ہوتی تو وہ اسے کفر نہیں بتاتے تھے بلکہ اسے اسلام ہی کا صدقہ کہتے تھے۔

حضرت اقبالؒ ان جامد و راکد مذاہب کو اسلام نہیں کہتے جو مسلمانوں کے بے شمار

فرقوں نے اپنے اپنے لئے مخصوص کر رکھے ہیں۔ ان کا تصور یہ تھا کہ ہم تک جو اسلام پہنچا ہے، وہ ملوکیت، سرمایہ داری اور عجمی تصوف و رہبانیت کے زیر سایہ پہنچا ہے اور اصل اسلام پر اتنے دبیز پردے پڑتے رہے ہیں کہ آج اسے پہچاننا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان تینوں پردوں کو انہوں نے بار بار ہٹا کر اصل اسلام کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انہوں نے ملوکیت کے پردے بھی چاک کئے، عجمی تصوف کو بھی بے نقاب کیا اور سرمایہ داری کی بھی دھجیاں بکھیریں۔ ملوکیت اور رہبانیت اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس وقت ہمارا موضوع صرف سرمایہ داری ہے جس میں یہ دکھانا ہے کہ اقبال اسے کس نظر سے دیکھتے تھے۔

لیکن اس سے پہلے ایک بات سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال سرمایہ داری کو اسلام کی ضد سمجھتے تھے۔ لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ اقبال "مارکسی" تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے کارل مارکس کی کتاب   پڑھی تھی اور وہ اس سے متاثر بھی تھے۔ بعض جگہ انہوں نے سرمایہ داری کا تحفظ کرنے والے مذاہب کے لئے وہی اصطلاح استعمال کی ہے، جو مارکس نے استعمال کی یعنی افیون کی گولی۔ مثلاً وہ جاوید نامے میں کہتے ہیں:

رنج بے گنج است تقدیر این چنیں   گنج بے رنج است تقدیر این چنیں

(کیا اسی چیز کا نام تقدیر پر ایمان لانا ہے کہ ایک کے حصے میں کسی تکلیف کے بغیر خزانہ آئے اور دوسرے کے پاس خزانے کے بغیر صرف تکلیف ہو)

اصل دیں این است اگر اے بے خبر   می شود محتاج از و محتاج تر

(اے بے خبر! اگر دین کی اصل یہی ہے تو اس سے محتاج تو اور زیادہ محتاج ہوتا

چلا جائے گا۔

وائے آں دینے کہ خواب آرد ترا
باز در خواب گراں دارد ترا

(ایسے دین پر تو افسوس ہے جو تجھے سُلا دے اور اس کے بعد تیری نیند میں اور زیادہ غفلت پیدا کردے)

سحر و افسون است یا دین است ایں
حبِ افیون است یا دین است ایں

(یہ جادوگری ہے یا دین؟ اور یہ افیون کی گولی ہے یا دین؟)

صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کارل مارکس سے متاثر تھے۔ اس کے باوجود وہ مارکسی نہ تھے۔ وہ خود کہتے ہیں:

رنگ و بو از تن نہ گیرد جانِ پاک
جز بہ تن کارے ندارد اشتراک

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

(روح کی بالیدگی محض مادیت سے حاصل نہیں ہوتی۔ اشتراکیت تو صرف مادیت ہی سے سروکار رکھتی ہے۔ حق کو نہ پہچان سکنے والے کارل مارکس کا دین بس شکمی مساوات کی بنیاد پر قائم ہے)

یہ دو شعر کہنے والا اقبال کبھی مارکسی تو نہیں ہو سکتا لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے اقبال کا نقطۂ نظر تنگدلانہ نہیں تھا۔ وہ نہ اس کے قائل تھے کہ مسلمان جو کچھ بھی کہیں وہ صحیح ہے اور نہ اس کے قائل تھے کہ غیر مسلم جو کچھ کہیں وہ غلط ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتے تھے کہ کس کی بات عقل انسانی اور نقل قرآنی کے مطابق ہے۔ انہیں مارکس کی یہ بات عین روح اسلام کے مطابق نظر آئی کہ تمام فتنہ و فساد کی جڑ سرمایہ داری کا وجود ہے اور کارل مارکس نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے صحیح کہا ہے اور قرآنی روح کے مطابق ہے۔ اقبال کو تو اس بات کا افسوس تھا

کہ یہ بات ایک مسلمان کی زبان سے کیوں نہیں نکلی۔

سرِّ ازل کہ عارف کامل بہ کس نگفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید (حافظ)

بہر حال اقبال یہ خوب سمجھ گئے تھے کہ سرمایہ داری کے بارے میں مارکس نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے اور اسلام اس سے بھی کہیں آگے ہے۔ وہ یہ بھی بھانپ چکے تھے کہ اس پیغام میں اتنا اندرونی زور و قوت ہے کہ یہ پھیل کر رہے گا، سرمایہ داری مٹ کر رہے گی اور دنیا آخرکار اسی معاشی نظام کو قبول کرے گی، جسے قرآن نے ایک لفظ "انفاق عفو" میں سمو لیا ہے۔ وہ بانگِ درا میں کہتے ہیں۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرف قُلِ العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

اقبال کی دُوررس نگاہوں کی داد دینی چاہیے کہ کم و بیش پینتیس[۳۵] چالیس سال پہلے انہوں نے کس طرح بھانپ لیا کہ تقریباً پورن ارب اقیم خور چینی باشندے سرمایہ داری کا خاتمہ کرکے ایک نئی زبردست طاقت بن کر ابھریں گے۔ جس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں۔

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
دکھا کر تماشہ مداری گیا

بہر کیف اقبال نے یہ اچھی طرح یقین کر لیا تھا کہ جب خود مسلمان قوم نے قرآن کے معاشی نظام کو نہیں اپنایا تو قرآن بھیجنے والے نے وہی صداقت ایک پیغمبرِ حق ناشناس کی زبان سے ایک دوسرے انداز سے ظاہر کرا دی۔ اس نے خدا کو الگ کرکے یہ بات بھی اور مسلمانوں نے قل العفو کی عینک اتار کر اسے چالیسویں حصے میں محدود کر دیا اور اسے بھی چھوڑ دیا

نہیں کیا۔

اقبال نے پوری طرح یہ سمجھ لیا تھا کہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کی ساری بنیاد تصورِ ملکیت پر قائم ہے حالانکہ اسلام میں انسانی ملکیت کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں۔ اسلام میں صرف تصورِ امانت ہے۔ اس لئے اقبال نے پہلے اس تصورِ ملکیت ہی پر بھرپور وار شروع کر دیا۔ وہ جاوید نامے میں کہتے ہیں:

باطنِ الارض للہ ظاہر است — ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

(فرمانِ خداوندی الارض للہ (زمین اللہ کی ہے) کا مطلب بالکل واضح ہے جو شخص اس عیاں حقیقت کو نہیں دیکھتا وہ مسلمان نہیں کافر ہے)

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

(اللہ نے زمین کو صرف متاع کہا ہے (ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین) یہ متاع بھی اس نے مفت ہی دے رکھی ہے (جس چیز سے کوئی فائدہ حاصل کیا جائے اسے متاع کہتے ہیں، فائدہ اٹھانے سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی)

دہ خدایا نکتۂ از من پذیر — رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

(اے جاگیردار! مجھ سے یہ نکتہ قبول کر، زمین سے اپنا رزق اور قبر حاصل کر، زمین کو اپنی ملکیت نہ بنا)

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست — ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست

(زمین سے اپنی روزی حاصل کرنا تو ٹھیک ہے لیکن زمین انسان کی صرف متاع ہے اور یہ ملکیت خدا کی ہے)

بندۂ مومن امین او مالک است — غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

(مومن تو صرف امین ہے اور مالک اللہ ہے۔ کیونکہ اس کے سوا جو کچھ دیکھتے ہو وہ سب فانی ہے)

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست — مردِ ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست

(اے بے وقوف انسان جو اپنی متاع کو اپنی ملک کہتا ہے یعنی کہ یہ سب کا سب خدا کی ملکیت ہے)

ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو — چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا

(تو خدا کی زمین کو اپنی زمین سمجھتا ہے؟ بتا کہ لا تفسدوا فی الارض کے اور کیا معنی ہیں؟)

ابنِ آدم دل بہ ابلیسی نہاد — من ز ابلیسی نمی بینم بجز فساد

(انسان نے اپنا دل ابلیسیت میں اٹکا رکھا ہے ابلیسیت میں بجز فساد کے اور کچھ نظر نہیں آتا)

کس امانت را بکارِ خود نبرد — اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد

(امانت کو کوئی اپنے قبضے میں نہیں رکھتا۔ کیا کہنے ہیں اس کے جو اللہ کی ملکیت کو اللہ ہی کے سپرد کر دیتا ہے)

بر وہ چیزے کہ از آنِ تو نیست — ماتمِ افکارے کہ شایانِ تو نیست

(تو اس چیز پر قبضہ جماتا ہے جو تیری نہیں۔ مجھے اس کام پر افسوس ہے جو تجھے زیب نہیں دیتا)

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ — تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ

(اللہ کی ملکیت اللہ ہی کے حوالے کر دے تاکہ تیرے اپنے مقصد کی بھی گرہ کشائی ہو جائے)

زیرِ گردوں فقر و مسکینی چراست　　آں چہ از مولاست می گوئی زماست

(آسمان کے نیچے یہ غربت و افلاس کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ جو چیز مولیٰ کی ہے، اسے تو کہتا ہے کہ میری ہے)

الارض للہ کا صحیح مفہوم وہ بانگ درا میں یوں بتاتے ہیں۔

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز　　دونوں یہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمیں

کہتا تھا وہ کرے جو زراعت اسی کا کھیت　　کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں

پوچھا زمیں سے میں نے کہ کس کا ہے مال تو　　بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں

مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے　　جو زیرِ آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے

اور خود دھرتی کیا ہے؟ خدا کی بے شرکت غیرے ملکیت الارض للہ۔ انسان کی جتنی بھی ضروریات ہیں — غذا، دوا، لباس، مکان، ساری مشینیں، سامانِ نوشت و خواند، سامان تفریح وغیرہ — وہ سب کی سب اسی زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ آسمان سے کوئی چیز نازل نہیں ہوتی۔ پس جب زمین اللہ کی ملکیت ہے تو زمین کی ساری پیداوار بھی خواہ کسی شکل میں ہو اسی اللہ کی ملکیت ہوگی [1]۔ انسان تو خود اپنے جسم و جان کا بھی مالک نہیں۔ جو خالق ہے وہی مالک بھی ہے۔ اگر کسی غیر اللہ کو رب، خالق، رازق وغیرہ ماننا شرک ہے تو غیر اللہ کو مالک تسلیم کرنا کیوں نہ شرک ہوگا؟ ہر شے کا واحد اور بلا شرکت غیرے وہی مالک ہے۔ یہ ایک سچی حقیقت ہے جسے تسلیم نہ کرنے والا کافر و غاصب ہوتا ہے اور اسے تسلیم کرنے والا اس آیت کا مصداق ہوتا ہے: ان اللہ اشترٰی من المؤمنین

---

[1] یہ مضمون اقبال نے یوں بھی ادا کیا ہے ؎

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں میری نہیں　　تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں

انفسہم و اموالہم بان لہم الجنۃ؁

(اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے) اگر یہ سودا نہیں ہوا تو ایمان ہی نہیں رہا اور اگر ہو گیا ہے تو ملکیت کا تصور ہی نہیں باقی رہا۔ جب جان اپنی ملکیت نہیں تو مال کہاں سے ملکیت ہو سکتی ہے؟ اور جب ہر چیز کی ملکیت کا تصور ہی ختم ہو گیا تو زمین اور زمین کی ساری پیداواریں بھی امانت ہی ہوں گی۔ جاگیر دارانہ اور سرمائے دارانہ ملکیت نہیں ہوں گی۔

اقبال نے امانت کا اور تصورِ ملکیت کی کامل نفی کا جو تصور دیا اس سے جاگیرداری اور سرمائے داری کا خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے ان دونوں۔ سرمائے داری اور جاگیرداری — پر بھی بھرپور ضرب لگائی ہے۔ پیامِ مشرق میں وہ کہتے ہیں۔

رازدانِ جزو و کل از خویش نامحرم شداست　　آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شداست

(یہ انسان جو جزئیات و کلیات کا رازداں بنا پھرتا ہے، اپنی حیثیت و مقام سے بے خبر ہے اور محض سرمائے داری کی وجہ سے ایک دوسرے کا قاتل بن جاتا ہے)

واقعہ یہ ہے کہ تاریخ عالم میں ہر طبقاتی کشمکش کی تہہ میں ایک ہی چیز کارفرما رہی ہے۔ یہ کشمکش ہمیشہ سرمایہ داری اور بے مائگی کے درمیان رہی ہے۔ جسے آج کل کی اصطلاح میں　　　اور　　　کی کشمکش کہتے ہیں۔ انبیا علیہم السلام اسی میں اعتدال و نظم پیدا کرنے کے لئے آتے رہے۔ صرف نماز اور روزے سے منکروں کو کیا تکلیف تھی، جو وہ ہر اسلامی تحریک کو دبانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ تو اسی وقت الجھتے ہیں جب انہیں قوم شعیبؑ کی طرح علم ہوتا ہے کہ یہ نماز براہ راست ہمارے اموال پر حملہ آور ہو رہی ہے۔

قالوا یٰشعیب اَصلٰوتک تامُرک ان نترک مایعبد اٰباؤنا او ان نفعل

فی اموالنا ما نشٰؤا۔ (قوم کہنے لگی کہ اے شعیبؑ! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق کوئی تصرف نہ کریں؟) گویا سیدنا شعیب علیہ السلام کی نماز صرف پتھر کے معبودوں ہی سے نہیں روک رہی تھی بلکہ جس سونے چاندی کی لوگ پوجا کرتے تھے اس سے بھی روک رہی تھی۔ پتھر کی مورتیوں سے دستبردار ہونا ان کے لئے اتنا مشکل نہ تھا جتنا سونے چاندی کی ملکیت سے دستبردار ہونا ان کے لئے مشکل ترین کام تھا۔ یہی وہ اصل بت ہے جو انسان کو انسان کے ہاتھوں قتل کراتا ہے اور اسی کو اقبال نے مذکورہ بالا شعر میں واضح کیا ہے۔

ارمغان حجاز میں اقبال بزبان ابلیس کہتے ہیں:

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا ۔۔۔ میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد ۔۔۔ جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں

جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند ۔۔۔ کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں

ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

آج بھی ایسے بندگانِ مومن کی کمی نہیں جو دین کا نام لے لے کر لامحدود ملکیت کو عین اسلام ثابت کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔

اقبال بانگِ درا میں کہتے ہیں:

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر ۔۔۔ شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ ۔۔۔ خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار ۔۔۔ انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اسی کتاب میں آگے چل کر کہتے ہیں:

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا ۔۔۔ جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

پھر آگے چل کر کہتے ہیں:

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار ۔۔۔ عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے ناسازگار

حکمِ حق ہے لیس للانسان الا ما سعیٰ ۔۔۔ کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

یہاں اقبال نے قرآن کے اس حکم کی ترجمانی کی ہے کہ ہر انسان کو اس کی محنت کا پھل ملنا چاہیے۔ یہ کوئی منصفانہ نظام نہیں کہ محنت تو کوئی کرے اور پھل کوئی اور لے جائے۔ یہاں انہوں نے کارخانے کا ذکر کیا ہے لیکن جاگیرداری کی بھی بالکل یہی شکل ہے۔ کارخانے دار اور جاگیردار دونوں ہی مفت خور استحصالی ہوتے ہیں۔ دوسروں کی محنت کا ثمرہ کھینچ کر خود عیش کرتے ہیں اور محنت کش طبقے کو ایسی زندگی میں گرفتار رکھتے ہیں کہ وہ نہ مرتے ہی بنے اور نہ لا یموت فیہا ولا یحییٰ کی سی کیفیت میں مبتلا ہے۔ اس سلسلے میں فرمانِ نبویؐ بھی یہی ہے۔ من کانت لہ ارض فلیزرعھا او لیمنحھا اخاہ۔ یعنی جس کے پاس کوئی قطعۂ زمین ہو وہ یا تو خود کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کے حوالے کر دے۔ حضورؐ نے یہ نہ فرمایا کہ اسے کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا بٹائی پر دے دے۔ یہ دونوں باتیں مفت خوری کی ہیں، اور بٹائی کو تو حضورؐ نے بالکل ربا (سود) قرار دیا ہے[1]۔

اقبال کی نظروں سے یہ احکام پوشیدہ نہ تھے۔ انہوں نے ارمغانِ حجاز میں اسی استحصال کو یوں بیان کیا ہے:

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب

---

[1] دیکھئے رسالہ "سین" جیم شائع کردہ موتمر عالم اسلامی۔ کراچی

از جفائے دِہ خدایاں کشت دہقاناں خراب

انقلاب ! اے انقلاب !! اے انقلاب !!!

یعنی سرمائے دار مزدور کے خون سے اپنے لئے لعلِ ناب تیار کرتا ہے اور جاگیرداروں کے ظلم سے کاشتکاروں کی اپنی محنت کی کھیتی برباد ہوتی ہے۔ اس کا علاج صرف بنیادی انقلاب ہے۔

یہی صدائے بازگشت دوسرے انداز سے جاوید نامے میں یوں ہے۔

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد　　آبروئے دخترِ مزدور بُرد

(جاگیردار، کارخانے دار محنت کش کے حصے کی روٹی بھی چھین کر کھا جاتا ہے اور اس کی بہو بیٹیوں کی عصمت بھی لوٹ لیتا ہے)

چیست قرآں خواجہ را پیغام مرگ　　دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

(اسی استحصال کو ختم کرنے کے قرآن آیا ہے جو ان سرمائے داروں کے لئے موت کا پیغام ہے اور بے کس محنت کش طبقے کی دستگیری کرتا ہے)

اس استحصال کا اصل علاج تو یہ ہے کہ لوگ اپنی خوش دلی کے ساتھ اپنی تمام فاضل اور زائد از ضرورت دولت کو ان کے لئے پیش کر دیں جن کے پاس ضرورت سے کم ہے۔ اسی کو قرآن "انفاقِ عفو" کہتا ہے۔ اقبال اسے یوں ادا کرتے ہیں۔

با مسلماں گفت جاں برکف بنہ　　آنچہ از حاجت فزوں داری بدہ

(قرآن مسلمان سے یہ کہتا ہے کہ اپنی جان ہتھیلی پر لئے رہو اور جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو اسے دوسرے ضرورتمندوں کے لئے پیش کر دو)

پھر کہتے ہیں :

یہچ خیر از مردکِ زرکش مجو　　لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا

(بخیل صفت انسان سے کسی خیر کی توقع نہ رکھو۔ "تم نیکی اس وقت تک حاصل ہی نہیں کر سکتے جب تک اپنا محبوب مال نہ خرچ کر دو)

مطلب یہ ہے کہ ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جو زرکش ہوتا ہے۔ روپے پر روپیہ کھینچتا جاتا ہے اور اس کی ہوس میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے اور کہیں اس کی ہوس میں ٹھہراؤ نہیں پیدا ہوتا۔ ایسے کنجوس سے کسی خیر کی امید ہی نہیں کی جا سکتی۔ اس کی روش ہے جمع کرتے چلے جانا اور قرآن کی تعلیم اس کی بالکل نقیض ہے۔ وہ جمع کرنے کی شدید مذمت کرتا ہے اور اس کا سارا نظام انفاق پر قائم ہے۔ جس کی آخری منزل "انفاق عفو" ہے۔ اس نظامِ انفاق کو قائم کرنے کے لئے نظام جمع کو توڑنا ضروری ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ نظامِ سود بھی قائم رہے اور نظام صدقات بھی۔ اسی طرح نظام جمع اور نظام انفاق دونوں ایک ساتھ نہیں قائم رہ سکتے۔ نظامِ انفاق کے قیام کے لئے نظام سرمایہ داری کو ختم کرنا ضروری ہے۔ مسلمان وہی ہے جو خوش دلی اور رضاکاری کے ساتھ اپنے سرمائے کو انفاق عفو کی قرآنی ہدایت کے مطابق ختم کر دے۔ انفاق عفو کا مطلب یہ نہیں کہ اسی آن اپنی فاضل دولت کو دے ڈالے۔ اس کا مطلب ہے انفاق کے لئے مخصوص کر دینا یا اس مد میں رکھ دینا۔ ایک دن گزرنے سے پہلے اسے حقداروں میں تقسیم کر دے تو یہ بھی بعض صحابہؓ ۔ مثلاً سیدنا ابوذر غفاریؓ ۔ کا عمل رہا ہے۔ اگر اپنے پاس امانتِ مستحقین سمجھ کر رکھ چھوڑتا ہے تو یہ بھی بعض صحابہؓ ۔ مثلاً سیدنا عثمانؓ کے عمل کے مطابق ہوگا۔ یہ تو گویا ایسا ہی ہوگا جیسے بیت المال میں رکھوا دیا گیا ہو۔ سیدنا عثمانؓ بن عفان کو عثمان غنیؓ کہا جاتا ہے لیکن عام لوگوں کو اس سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ آپ بڑے امیر تھے، اس لئے غنی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ آپ غنی صرف اس لئے تھے کہ اپنی دولت سے "بے نیاز" تھے اور اس کی ناقابل تردید

اور واضح دلیل آپ کی وہ سادی اور فقیرانہ زندگی ہے جو اپنے معیار میں رسولؐ اور شیخینؓ کی زندگی کے عین مطابق تھی اور ساری دولت کار خیر کے لئے ہمیشہ وقف رہی بلکہ خلیفہ ہونے کے بعد تو آپ کا یہ اعلان تھا کہ: کنت اکثر العرب بعیراً و شاۃً والیوم ما لی ثاغیۃ ولا راغیۃ غیر راحلتین لحجاتی (جبری) میں عرب میں سب سے زیادہ اونٹوں، بکریوں والا تھا لیکن آج میرے پاس ایک اونٹ اور ایک بکری بھی موجود نہیں۔ صرف یہ دو اونٹ ہیں، وہ بھی سفر حج کے لیے۔

آپ کو سرمایہ دار سمجھنا یا کہنا اتنی بڑی غلطی ہے جس سے بڑی اور کسی غلطی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ سارے مالدار صحابہ کا یہی حال سمجھنا چاہیے۔

بہر حال اقبال کے نزدیک سرمایہ داری کی ہر قسم کو یکسر ختم کرنا اسلامی نظام معاش قائم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ نظام اتفاق عنصری کی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے جو اگر خوش دلانہ امن کے ساتھ قائم ہو تو ٹھیک ورنہ اسی کوشش و جہاد کے لئے قرآن ہے۔

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ — آنچہ از حاجت فزوں داری بدہ

اور اسی جذبے سے سرشار ہو کر اقبال کو بزبان لینن یہ بھی کہنا پڑا کہ:

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ہر دور میں خوشحالی و بدحالی کی کشمکش جاری رہی ہے اور ہر پیغمبر نے اس کشمکش کو دور کرنے کی سعی بلیغ کی اور خاتم النبیینؐ نے اس نظام کو مکمل طور پر عملی شکل دے کر پیش کیا۔ اس شخص سے بڑا کافر و مشرک اور کوئی نہیں ہو سکتا جو حضورؐ پر سرمایہ دارانہ نظام قائم کرنے

کا غلط ترین الزام رکھ کر پورے دین کی روح کی تحریف کرتا ہے۔ مسلمان جب اس تعلیم کو چھوڑ کر سرمایہ داری کو دین بنا بیٹھے یعنی بقول اقبالؒ بزبان ابلیس ؎

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

تو قدرت نے ان سے مایوس ہو کر اپنے منشا کی تکمیل کے لئے اور مسلمانوں کی غیرت پر تازیانہ لگانے کے ایک ایسے "پیغمبرِ حق ناشناس" سے کام لیا کہ

قلب او مومن دماغش کافر است

پانی اپنے بہاؤ کے لئے راستہ نکال ہی لیتا ہے یہ اسلام ہی کی دی ہوئی بھیک تھی، جو اس پیغمبر حق ناشناس کی جھولی میں پڑ گئی مگر "بے خدا" ہو کر۔ وہ بے خدا صرف اس لئے ہوا کہ اس نے جہاں بھی خدا والے دیکھے بے عدل دیکھے۔ فاقہ کش اور سرمایہ دار کے دو متضاد طبقوں میں بٹے ہوئے دیکھے، دین حق کی بجائے "افیونِ مذہب" کے مدہوش دیکھے اور بقول میلا رام وفا ؎

خدا کے نام پر دستگیریاں ہیں خدا والے — بہت کچھ ہے جہاں ذکرِ خدا خوفِ خدا کم ہے

اس مومن قلب و کافر دماغ پیغمبرِ حق ناشناس کے انکارِ خدا کے ذمہ دار ایسے ہی خدا والے ہوئے جنہوں نے خدا اور مذہب کا نام لے کر سرمایہ داری اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والے ہر استحصال کا جواز اس بے گناہ قرآن اور اس قرآن لانے والے کے اندر تلاش کر لیا جس کی آمد کا واحد مقصد ہی ہر قسم کی بے عدلی و نا انصافی کو ختم کرنا تھا۔

اب ہم اپنی دی ہوئی بھیک کو واپس لینا چاہتے ہیں۔ یہ بجائے خود بڑی شرم کی بات ہوگی کہ اپنی چیز حاصل کریں اور بھیک کے طور پر۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی نعمت واپس لیں مگر اسے "بے خدا" بنا کر۔

ہم نے اقبال کے جو چند اشعار درج کئے ہیں ان کے علاوہ بھی بہت سے اشعار ہیں جن میں سرمایہ دارانہ رجحان پر بھرپور حملے کئے ہیں۔ ہم نے سب کو نقل کرنا ضروری نہیں خیال کیا ہے۔

اسلام کا معاشی نظام

راجا رشید احمد

جب ہم اسلام کے نظام معیشت کا ذکر کرتے ہیں تو اس کو دیگر شعبوں میں دی گئی اسلامی ہدایات سے الگ نہیں کر سکتے کیونکہ یہاں ہر شعبہ دوسرے شعبے سے پوری طرح منسلک ہے۔ آپ اسلام کے تفویض کردہ حقوق و فرائض کو سمجھنے کے لئے مکمل اسلام کو سامنے رکھنے پر مجبور ہیں اور جہاں کوئی شخص کسی ایک شعبے کو دوسرے شعبوں سے الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اسلام کو سمجھنے میں غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔

اسلام کا معاشی نظام جہاں قانونی ضوابط رکھتا ہے، وہاں اس کا تعلق انسانی اخلاقیات سے بہت گہرا ہے بلکہ اس کا زیادہ تر دار و مدار ہی اخلاقیات پر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کوئی معاشی نظام اخلاقی نظام کے علی الرغم جنم لیتا ہے، معاشرے کے اندر انسانیت اور حیوانیت میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ معاشی تقاضوں کا عنصر تو انسان اور حیوان میں مشترک ہے اور یہ اخلاقی قدریں ہی ہیں، جن کی بنا پر قائم ہونے والا نظام معاش انسان کو "اشرف المخلوقات" کے بلند ترین منصب اور اعلیٰ ترین مقام پر فائز کرتا ہے۔ جان کی حفاظت، بھوک پیاس کے ازالے کے لئے پیٹ بھرنا، سردی گرمی کے موسمی اثرات سے محفوظ رہنے کے جذبات، جنسی تقاضوں کی تکمیل یہ سب باتیں تو حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل میں دوسروں کا خیال

رکھنا اور عدل، احسان اور ایثار کی روایات قائم کرنا شرفِ انسانیت کی معراج ہے۔

اسلام کی حقانیت اور ابدیت پر ایمان رکھنے والے کی تین حیثیتیں قرار دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔ دوسری یہ کہ وہ بنی نوعِ انسان اور انسانی معاشرے کا ایک فرد ہے اور تیسری یہ کہ خود اس کی اپنی ذات کے کچھ تقاضے ہیں۔ مسلمان کی شخصیت ان تینوں حیثیتوں کے امتزاج کا نام ہے اور اسے حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوقِ نفس کو پیشِ نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اسلام کا نظامِ معاش بھی حقوق کی ان تینوں قسموں کو ادا کرنے سے عمل میں آتا ہے۔ ایک مسلمان کی زندگی کے ہر عمل میں حقوق اللہ کو بہرحال ترجیح ہوتی ہے اور حقوق العباد کی اہمیت صحیح مسلم کی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے: "بے شک میری امت کا مفلس وہ ہوگا، جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے ساتھ آئے لیکن حال یہ ہو کہ اس نے کسی کو گالی دی ہو، کسی پر تہمت لگائی ہو، کسی کا مال کھالیا ہو، کسی کا خون بہایا ہو یا کسی کو مارا ہو تو اس کے نیک اعمال میں سے کچھ اس کو دے دیا جائے گا اور کچھ اس کو۔ تو اگر اس کی حسنات ختم ہو جائیں گی، قبل اس کے کہ اس پر جو کچھ ہو ادا کر دیا جائے تو دوسروں کے گناہ اس کے اعمال میں لکھ دیئے جائیں گے۔ پھر وہ جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔" اپنے نفس کے بارے میں بھی اسلام کی واضح ہدایات موجود ہیں۔ اسلام انسانی نفس کی تمام ضروریات و مقتضیات کو پورا کرنے کی نہ صرف آزادی دیتا ہے بلکہ اس پر اصرار کرتا ہے بشرطیکہ اس طرح اللہ کی حدود پامال نہ ہوں۔

اسلامی معاشی زندگی میں فرد کو حلال اور جائز ذرائع سے روزی پیدا کرنے کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ اسے اپنی جائز کمائی پر ملکیت کا اور اس ملکیت کے انتقال کا حق ہوتا

ہے۔ اسلام معاشی جد و جہد کے لئے ترغیب دیتا ہے اور مسلمانوں کو یاد دلاتا ہے کہ کائنات کے تمام وسائل خداوند کریم نے انسان کے استفادے کے لئے پیدا کئے ہیں: "وہ اللہ ہی ہے، جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمہارے لئے بنایا ہے۔" (البقرہ، ۲۹) "ہم نے تمہیں زمین پر اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لئے سامانِ زیست مہیا کیا" (اعراف، ۱۰) "جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل سے رزق تلاش کرو" (جمعہ، ۱۰) حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا: "وسیع مکان، نیک پڑوسی اور عمدہ سواری آدمی کی بہبود میں داخل ہیں" (صحیح بخاری) "حلال روزی تلاش کرنا جہاد ہے" (کنز العمال) "رزق کو زمین کے پوشیدہ خزانوں میں تلاش کرو" (کنز العمال) حضرت رسولِ کریم نے کاریگر کو اللہ کا دوست قرار دیا ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ "وہ صنعت و حرفت جس میں پرہیزگاری کو ملحوظ رکھا جائے، فسق و فجور والے سرمائے سے بہتر ہے۔"

غرض اسلام نے ہر فرد کو معاشی جد و جہد پر اکسایا ہے اور کمائی کے طریقوں پر سوائے اس کے کوئی قدغن عائد نہیں کی کہ اللہ کی حدود پامال نہ ہوں، حلال ذرائع سے کمایا جائے۔

اسلامی معاشی نظام کے خد و خال

اسلام کے معاشی نظام کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ دولت خواہ کسی شکل میں ہو، اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اور اصلاً اسی کی ملکیت ہے۔ انسان کی ملکیت اللہ کی عطا سے ہے۔ دولت پر انسان کا تصرف احکامِ خداوندی کے تابع ہونا چاہئے۔

اسلام کمائی کے ذرائع میں جائز و ناجائز کی حدود متعین کرتا ہے اور سختی سے ان

کی حفاظت کرتا ہے۔ پھر احتکار (HOARDING) کی ممانعت کرتا ہے اور ناجائز طریقوں پر خرچ کی روک تھام کرتا ہے۔ عیاشی، قمار بازی، شراب نوشی، بے جا اسراف اور قومی دولت کے ضیاع کے تمام دروازے بند کر دیتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسلام تقسیم دولت کا اہتمام کرتا ہے اور گردشِ زر کا نہایت مؤثر نظام دیتا ہے۔
بڑی بڑی جاگیرداریاں اسلامی معاشی نظام میں ممکن ہی نہیں۔ اسلام معاشی توازن کی صورتیں پیدا کرتا ہے۔ اس نظام میں اجرتوں کا معیار بھی شخصی کفالت کے اصول پر قائم اور مرتب کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی طبقہ دوسرے طبقے کا استحصال نہیں کر سکتا، وہ اس قابل ہی نہیں ہو سکتا۔ اسلام طبقاتی تقسیم اور طبقاتی منافرت میں یقین نہیں رکھتا بلکہ معاشرے کو محبت، ایثار، خلوص، اخوت اور مساوات کی بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔

مساواتِ اسلامی کی بحث میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ رزق و مال، علم و جہل اور بعض دوسرے خصائص کے لحاظ سے اسلام نے فطری حد تک امتیاز جائز رکھا ہے اور بعض کو بعض پر رفعت اور تفضیل دی ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ اسلام کی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ سب امیر ہوں گے یا سب غریب ہوں گے۔ درجوں اور طبقوں کے بغیر کوئی معاشرہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ حضورؐ نے فرمایا ہے "زکوٰۃ مسلمانوں کے دولت مندوں سے لی جائے گی اور ان کے غریبوں میں تقسیم کی جائے گی"۔ اسلامی معیشت کا اصول دولت کی مساوی تقسیم نہیں بلکہ دولت کی منصفانہ تقسیم ہے اور تقسیم دولت کے تمام طریقے زکوٰۃ، صدقات، عشر وغیرہ غریب اور امیر دونوں طبقوں کی موجودگی کی دلیل ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسلام امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بننے

سے روک کر دونوں طبقوں کے درمیانی فاصلے کو کم سے کم کر دیتا ہے اور تھوڑے بہت تفاوت کے ساتھ تمام افراد کی خوشحالی اور معاشی کفالت کا اہتمام کرتا ہے۔ اسلامی معاشی نظام کے قانونی اور اخلاقی تقاضے پورے کرنے کے بعد دولت کے چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا اور معاشرے میں نادار و مفلس طبقے کا وجود ممکن ہی نہیں ہے۔

انفرادی ملکیت

اصلاً خدا تعالیٰ کی حاکمیت و ملکیت کو تسلیم کرنے کے بعد اور اس کی قائم کردہ حدود کے اندر اسلام شخصی و انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن یہ ملکیت وسائل پیداوار سے لے کر اشیائے صرف تک ہر قدم پر خدا کے احکام کی تابع اور پابند ہے۔ "ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ۔ الا یہ کہ تمہارے درمیان تجارت ہو آپس کی رضامندی سے" (النساء: ۲۹) "کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم نے اُن کے لیے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے مویشی پیدا کیے اور یہ ان کے مالک ہیں" (یٰسٓ: ۷۱) "اے نبیؐ! ان کے اموال میں سے زکوٰۃ وصول کرو" (التوبہ: ۱۰۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ اس مالدار بندے کو محبوب رکھتا ہے، جو متقی ہو اور پوشیدہ طور پر خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے والا ہو" (مسلم، منقول از مشکوٰۃ شریف)

ناجائز ذرائع آمدن پر قدغن

اسلام فرد کو معاشی جدوجہد کی ترغیب بھی دیتا ہے اور اس کی نجی ملکیت کو بھی

تسلیم کرتا ہے، مگر اس کے ساتھ وہ کمائی کے ذرائع کے جائز اور حلال ہونے پر زور دیتا ہے اور حصولِ معاش کی آزادانہ سعی میں حلال و حرام کی حدیں متعین کرتا ہے۔ حرام اور ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت کا وہ جائز مالک نہیں ہے۔

اسلام نے کمائی کے ایسے تمام ذرائع کو ناجائز قرار دیا ہے، جن سے خدا کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہو، دوسرے افراد کو یا اجتماعی طور پر پوری ملت یا ملک یا معاشرے کو اخلاقی یا مادی نقصان پہنچ سکتا ہو یا ایسے تجارتی طریقے، جن میں کسی ایک فریق کا یقینی طور پر فائدہ ہو اور دوسرے فریق کا فائدہ مشتبہ اور مشکوک ہو۔ اتفاق سے راتوں رات امیر بن جانے کے طریقوں سٹہ، لاٹری، معمے وغیرہ سے دولت حاصل کرنا اور دھوکے جھگڑے اور قیاس کے سودے اور انصاف اور مفادِ عامہ کے خلاف ذرائع حرام قرار دیئے گئے ہیں، چنانچہ سود، رشوت، جوا، چوری، سٹہ، خیانت، غصب، غبن، ناپ تول میں کمی، قحبہ گری، شراب اور دوسری منشیات و مسکرات کی صنعت و تجارت، ناجائز منافع خوری، لوٹ مار، مفت خوری، پیشہ ورانہ گداگری اور ظلم و استحصال کے ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت کو اسلام ناجائز اور حرام قرار دیتا ہے۔ نیز احتکار (HOARDING) اور ایسی اجارہ داریوں سے منع کرتا ہے، جن کی وجہ سے عام لوگوں کے لئے مواقع نہ رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ایسے تمام ذرائع سے پیدا ہونے والی دولت کے راستے ہی بند کر دیئے جائیں تو معاشرے میں کوئی ایسا طبقہ جنم ہی نہیں لے سکتا، جو کسی کا استحصال کر سکے، اور اگر کوئی شخص کسی طرح سے ان ناجائز اور حرام ذرائع سے دولت اکٹھی کر ہی لے تو اسلامی ریاست کو اختیار ہے کہ وہ اس کا محاسبہ کرے، جیسا کہ

خلفائے راشدین کے زمانے میں ہوا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں جس وقت کوئی عامل مقرر ہوتا تھا، اس کے پاس جس قدر مال و اسباب ہوتا تھا، اس کی مفصل فہرست تیار کرا کے محفوظ رکھی جاتی تھی۔ اور عامل کی معمولی حالت سے اگر غیر معمولی ترقی ہوتی تھی تو اس سے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ اکثر عمّال اس بلا میں مبتلا ہوئے۔ خالد بن صعق نے اشعار کے ذریعے سے حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی۔ حضرت عمرؓ نے سب کی موجودات کا جائزہ لے کر آدھا آدھا مال بٹا لیا اور بیت المال میں داخل کر دیا (الفاروق۔ شبلی نعمانی) اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست ناجائز طور پر جمع کی ہوئی دولت کو اپنے قبضے میں لے کر مستحقین میں تقسیم کرنے کی مجاز و ذمے دار ہے۔

اکتنازِ زر کی ممانعت

جہاں اسلامی نظام کی رو سے آمدنی کے ذرائع کا حلال اور جائز ہونا ضروری ہے، وہاں اسلام نے ان جائز طور پر دولت کمانے والوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے، "مال کی محبت" کو مذموم قرار دیا ہے اور بخل و امساک، زر پرستی، دولتِ دنیا کی حرص و ہوس اور خوشحالی پر فخر و ناز کی مذمت کی ہے۔ "تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی فکر نے مستغرق کر رکھا ہے۔ قبر میں جانے تک تم اسی فکر میں منہمک رہتے ہو۔ یہ ہرگز تمہارے لئے نفع مند نہیں ہے۔ جلد ہی تمہیں اس کا انجام معلوم ہو جائے گا۔" (التکاثر ۱-۳) "اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک سزا کی خبر دے دیجئے" (التوبہ ۳۴)
" وہ لوگ قیامت کے دن طوق پہنائے جائیں گے اس کا، جس میں انہوں نے بخل

کیا" (آلِ عمران ۱۸۰)

یاد رہے کہ ارتکاز و اکتناز زر سرمایہ دارانہ نظام کی جان ہے اور اس کے متعلق قرآنِ مقدس نے اتنا سخت لہجہ اختیار کیا ہے، گویا یہ عمل بھی کفر کی طرح نہایت گھناؤنا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں "قرآن و سنت کی تعلیمات اور صحابہ کرامؓ کی عملی زندگی کے مطالعے کے بعد مجھے اس حقیقت کا پورا پورا اذعان ہوگیا ہے کہ اسلام کے بنائے ہوئے اجتماعی نقشے میں دولت اور وسائل دولت کے احتکار و اکتناز کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ احتکار یہ کہ دولت کا کسی ایک طبقے میں محصور ہو جانا۔ اکتناز یہ کہ دولت کے بڑے بڑے خزانوں کا افراد کے پاس جمع ہو جانا۔ اسلام نے سوسائٹی کا جو نقشہ بنایا ہے، اگر ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے اور صرف چند خانے ہی نہیں بلکہ تمام خانے اپنی اپنی جگہ بن جائیں تو ایک ایسا اجتماعی نظام بن جائے گا، جس میں نہ تو بڑے بڑے کروڑپتی ہوں گے نہ مفلس و محتاج طبقہ۔ ایک طرح کی درمیانی حالت غالب افراد پر طاری ہو جائے گی۔ بلاشبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہوں گے کیونکہ سعی و کسب کے بغیر کوئی مومن زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا، اتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور ہوگا اور اس سے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی، اتنی ہی زیادہ جماعت بہ حیثیت جماعت کے خوشحال ہو جائے گی۔ قابل و مستعد افراد زیادہ سے زیادہ کمائیں گے لیکن صرف اپنے ہی لئے نہیں کمائیں گے، تمام افرادِ قوم کے لئے کمائیں گے۔ یہ صورت نہ پیدا ہو سکے گی کہ ایک طبقے کی کمائی دوسرے طبقوں کے لئے محتاجی و مفلسی کا پیام ہو جائے جیسا کہ اب عام طور پر ہو رہا ہے۔ اگر مسلمان آج اور کچھ نہ کریں، صرف زکوٰۃ کا معاملہ ہی احکامِ قرآنی کے مطابق درست کر لیں تو بغیر کسی تامل

کے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تمام اجتماعی مشکلات و مصائب کا حل خود بخود پیدا ہو جائے گا لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے یا تو احکامِ قرآنی کی تعمیل یک قلم ترک کر دی ہے یا پھر عمل بھی کر رہے ہیں، تو اس طرح کہ فی الحقیقت عمل نہیں کر رہے ہیں" (ترجمان القرآن۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۳۱)

خرچ پر تحدید

اسلام نے کسب و عمل کے اصولوں کی طرح صَرف و خرچ کے بھی اصول مقرر کر دیئے ہیں۔ وہ مسلمان کو پابند کرتا ہے کہ اپنی حلال کمائی کا خرچ بھی حلال اور جائز راستوں پر ہی کرے۔ اسلام نے بے جا خرچ سے منع کیا ہے "خرچ میں حد سے نہ گزرو۔ اللہ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتا" (الانعام، ۱۴۱) "فضول خرچی مت کرو۔ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے" (الاعراف: ۲۱)

اسلام نہ تو بخل کو پسند کرتا ہے اور نہ فضول خرچی کو۔ اسلام دینِ اعتدال ہے اور اسراف و تبذیر دونوں کی مذمت کرتا ہے اور ان سے منع کرتا ہے۔ غرور تبذیر اور شان و شکوہ کے اظہار کے لئے خرچ کرنا، عیاشی اور دوسرے منہیات پر خرچ کرنا اور احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی میں خرچ کرنا منع ہے۔ اپنی ذات پر، اہل و عیال پر، قبیلے کنبے والوں، پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، قرضداروں (غرض ہر انفرادی اور اجتماعی جائز ضرورت) پر خرچ کرنا صحیح اور جائز ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان کو حساس، فراخ دل، فیاض اور خدا خوفی کے احساس سے مملو ہونا چاہیئے۔ بے جا خرچ کی باقاعدہ قانون کے ذریعے بھی ممانعت ہے اور اسلام کا نظامِ اخلاق بھی ایسے راستوں

پر چلنے سے روکتا ہے اور نیکی پر، خدا کی راہ میں خرچ کرنے پر اکساتا ہے۔

جب آدمی صرف صحیح، جائز اور حلال طریقوں سے ہی روزی کمائے اور اکتناز کی بھی ممانعت ہو اور خرچ کے سلسلے میں جوئے بازی ممنوع ہو، شراب حرام کر دی گئی ہو، عیاشی کی کوئی خلافِ اخلاق صورت ممکن نہ ہو، سونے چاندی کے برتن اور دکھاوے اور شان و شوکت کے اہتمام و اظہار پر بھی پابندی ہو، اس کے ساتھ ساتھ اسلام کا نظامِ عبادات اور نظامِ اخلاق اسے انفاق فی سبیل اللہ کی روشنی دکھا رہا ہو تو دولت چند ہاتھوں میں کس طرح سمٹ سکتی ہے اور معاشرے کا کوئی فرد بھوکا ننگا یا ضروریاتِ زندگی سے محروم کیسے رہ سکتا ہے!

یہاں ایک سوال رہ جاتا ہے کہ خرچ کتنا کیا جائے؟ اس پر قرآن کا حکم یہ ہے "یہ لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں۔ فرمائیے کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو" (البقرہ: ۲۱۹) یعنی ایسا نہ ہو کہ تم بغیر سوچے سمجھے سب کچھ خدا کی راہ میں دے دو اور خود عسرت و نکبت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاؤ اور اس طرح حقوقِ نفس کے ساتھ اقربا و اعزہ اور پڑوسیوں اور کنبے برادری والوں اور دوسروں کے حقوق کے بھی غاصب بن جاؤ۔ اور ایسا بھی نہ ہو کہ مال جمع کیا جائے اور گنا جائے اور ضرورت سے زیادہ دولت کو خرچ نہ کیا جائے۔

تقسیمِ دولت کا مثالی نظام

اسلام نے گردشِ دولت کا ہر طرح سے مکمل اور مثالی نظام مرتب کیا ہے۔ جب کوئی شخص صرف اور خرچ کے ضمن میں موانعات سے پہلو بچا لیتا ہے اور قرابت داروں،

عزیزوں اور محتاجوں کی مدد کرنے پر اپنی حلال کی کمائی ہوئی دولت کو صرف کرتا ہے تو ان اوّلین حقداروں کے بعد دولت کے ثانوی مستحقین کی امداد کا ایک طویل اور منظم پروگرام بھی اسلام میں موجود ہے۔ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر خدا نے قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر نماز کے ساتھ کیا ہے اور ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر اسے فرض قرار دیا ہے۔ اگر پاکستان کی قومی آمدنی کا چالیسواں حصہ جمع کیا جائے تو چالیس کروڑ کے قریب رقم بنتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہر سال باقاعدگی سے زکوٰۃ کا نظام ہمارے ملک میں جاری ہو جائے تو صرف اس ایک اقدام سے چند برسوں میں کوئی شخص یہاں غریب اور مفلوک الحال نہیں رہ سکتا۔

زمینی پیداوار کا دسواں حصہ "عشر" کے طور پر لینے کا طریقہ اسلام میں موجود ہے۔ اس کی شرح زکوٰۃ سے چار گنی ہے اور اس کا مقصد بھی مفلس و نادار افراد میں وسیع پیمانے پر تقسیمِ دولت ہے۔

اسلام نے بعض گناہوں یا کوتاہیوں کی تلافی کے لئے مالی کفارے بھی مقرر کئے ہیں۔ سورہ البقرہ، المائدہ، المجادلہ وغیرہ میں کئی مقامات پر ان کفاروں کا ذکر ہے۔ بعض صورتوں میں یہ کفارے لازمی ہیں، بعض حالات میں اختیاری۔ کفارہ نقد رقم کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے اور کھانے کپڑے کے طور پر بھی۔

صدقات کا شعبہ اپنی جگہ پر بہت وسیع ہے۔ صاحبِ نصاب لوگوں کے لئے صدقۃ الفطر واجب کیا گیا ہے اور چونکہ اس کے نصاب پر پورا سال گزرنا بھی ضروری نہیں، اس لئے اس کا دائرہ زکوٰۃ سے بھی وسیع ہے۔ مقصد یہ ہے کہ عید کے موقع پر زیادہ سے زیادہ مساوات پیدا کی جا سکے۔

اسلام نے ہر انسان پر اپنے خاص خاص رشتے داروں (جن کی فہرست خاصی طویل ہے) کی معاشی کفالت کی ذمے داری عائد کر دی ہے۔ اجتماعی طور پر اپاہج، کمزور اور معذور افراد کی معاشی کفالت کا انتظام موجود ہے۔

جنگ سے حاصل شدہ اموالِ غنیمت کا پانچواں حصہ، جسے "خمس" کہتے ہیں، عام لوگوں کی معاشی بہبود اور خوشحالی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر جنگ کے ختم ہو جانے اور محاذِ جنگ کے دار الاسلام بن جانے کے بعد کفار سے حاصل ہونے والے مال کو شرعاً "مالِ فئ" کہا جاتا ہے۔ یہ سارے کا سارا مسلمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

اور ان سب اخراجات کے بعد بھی کسی شخص کے پاس اس کی حلال کمائی سے کچھ دولت بچ جاتی ہے، تو وہ اسلام قانونِ وراثت کے تحت تقسیم کر دیتا ہے۔ تقسیمِ میراث کے قانون کا مقصد ہی یہ ہے کہ جو مال ایک شخص کی زندگی میں یکجا ہو گیا ہو، وہ اس کے مرنے کے بعد اسی صورت میں اکٹھا نہ رہنے دیا جائے۔ بلکہ اس کے رشتے داروں میں پھیلا دیا جائے چنانچہ دو ایک پشتوں کے بعد امرا کی اولاد دولت سے محروم ہو کر عام لوگوں کی سطح پر آجاتی ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا نظامِ عدل دولت تقسیم کرتا رہتا ہے۔ انتشارِ دولت کے اس پروگرام کے تحت تمام جائداد اور دولت ورثا میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ قریبی ورثا نہ ملیں، تو دور کے ورثا اور اگر کوئی لاوارث ہو تو اس کی وراثت ریاست کی معرفت غربا میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اسلامی اقتصادیات کی اساس ہی تقسیمِ دولت اور گردشِ زر پر ہے اور اسلام کا قانونِ وراثت اس سلسلے کا آخری حل ہے اور اس طرح شرعِ مبین کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

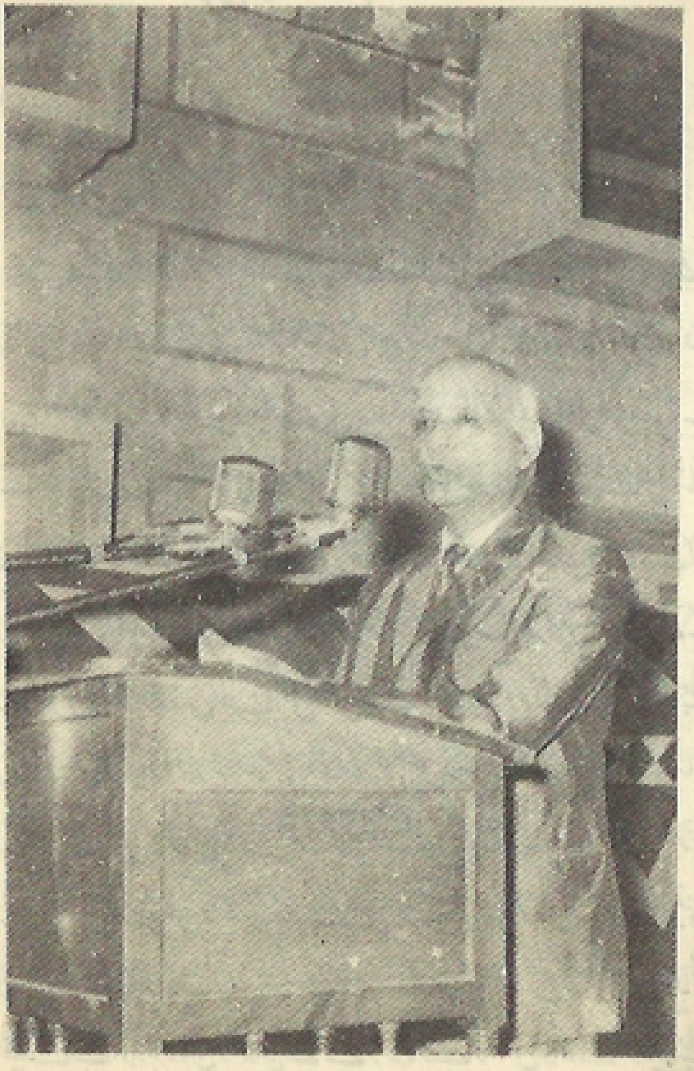

جسٹس ایس اے رحمان پہلی نشست کی صدارت کر رہے ہیں

خطبۂ صدارت

جسٹس ایس اے رحمٰن

معزز خواتین و حضرات!

مجھ سے پہلے بڑے پُرمغز مقالے آپ کے سامنے پیش کئے جا چکے ہیں، اس لئے میرا کام کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب نے نہایت بصیرت افروز تجزیہ ان عوامل کا کیا ہے جو تحریک پاکستان کی بنیاد ہیں اور ڈاکٹر انور اقبال صاحب نے اسلام کے معاشی پہلو پر روشنی ڈالی ہے جس کے بعد مولانا جعفر شاہ پھلواروی نے بھی ارشادات فرمائے۔ پاکستان کا نظریہ کیا ہے؟ مجھے اس میں ذرا مولانا جعفر سے باادب درخواست کرنا ہے کہ پاکستان کا بھی ایک نظریہ ضرور ہے کیونکہ ہم نے ایک خطۂ زمین اس نظریے کے ماتحت حاصل کیا تھا تاکہ اس نظریے کو عملی شکل دے سکیں اور وہ نظریہ کیا ہے؟ جیسے انہوں نے خود ہی فرمایا وہ نظریہ اسلام کی اقدار کو عملی شکل دینا ہے تاکہ یہاں ایک مثالی حکومت قائم کر کے دین کا بول بالا کریں کہ اسلام اب تک ایک زندہ قوت کی طرح موجود ہے اور اس کی اقدار ہر زمان و مکان کے لئے مکتفی ہو سکتی ہیں۔ یہ گویا ایک تجربہ گاہ بنی تھی اسلام کی اقدار کی تاکہ ایک مثالی حکومت قائم کر کے ہم دنیا پر واضح کر سکیں کہ اسلام زندہ حقیقت ہے اور ہر زمان و مکان کے لئے زندہ رہے گا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو میں آپ کی اجازت سے ایک دو اقتباسات آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے یہ ظاہر ہو گا کہ غیر مسلموں کا بھی یہ اعتراف تھا کہ مسلمانوں کی آمد برِ اعظم میں ایک منفرد

چیز تھی اور ہندو سماج میں اس کا امتزاج ناممکن تھا۔ کے۔ ایم۔ پنیکر صاحب ایک معروف ہندو مورخ ہیں۔ انہوں نے A SURVEY OF INDIAN HISTORY میں یہ لکھا ہے۔

"دسویں صدی سے پہلے ہندو معاشرہ افقی طور پر منقسم تھا اور نہ بدھ مت نے اس تقسیم پر کوئی اثر ڈالا نہ جین مت نے۔ وہ ناقابل جذب عناصر نہ تھے اور موجودہ تقسیم میں بآسانی ان کی کھپت ہو گئی۔ اس کے برعکس اسلام نے ہندی معاشرے کو اوپر سے نیچے تک دو طبقات میں تقسیم کر دیا، جسے آج کل کی اصطلاح میں یہ کہا جاتا ہے کہ پہلے ہی روز سے دو علیحدہ علیحدہ قومیں وجود میں آگئیں۔ وہ ہر مرحلے پر مختلف تھیں اور ان کے مابین کسی قسم کا معاشرتی رابطہ یا اختلاط موجود نہ تھا۔"

تو یہ گویا اعتراف ہے ان کے ایک مفکر کی طرف سے کہ اسلامی انفرادیت جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ایک ایسی چیز تھی جو مسلمانوں کو یہاں آ کر عزیز ٹھہری اور انہوں نے اس قدر کو کبھی بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ یہی اسلامی انفرادیت پاکستان کے نظریے کی بنیاد ہے۔ اب اگر یہ صورت ہے کہ نظریۂ پاکستان درحقیقت اسلامی اقدار کی دیکھ بھال اور ان کو اپنانے کا نام ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسلام ہمارے سامنے کس قسم کا معاشرہ پیش کرتا ہے، کس قسم کے اقتصادی نظریات پیش کرتا ہے۔ اس کے متعلق ہمارے محترم دوستوں نے بہت کچھ کہا ہے لیکن میں صرف علامہ اقبالؒ کا ایک اقتباس آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں کیونکہ وہ تصور پاکستان کے بھی خالق ہیں اور ان کا کہا ہوا مستند سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد (دسمبر ۱۹۳۰ء) کے اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں فرمایا۔

"یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست

کے اس آخری لفظ سے میرا مطلب ایک ایسی جماعت ہے، جس کا نظم و انضباط کسی نظام قانون کے تحت عمل میں آتا ہو لیکن جس کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح سرگرم کار ہو، اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزو ترکیبی تھا جس سے مسلمانان ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی۔ اس لئے قومی بنیادوں پر نظام سیاست ایسی تنظیم جس کا مقصد استحکام کے اسلامی اصولوں سے انحراف ہو مسلمانوں کے لئے سراسر ناقابل تصور ہے۔ ۔ ۔ ۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے، جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا، جو عقد اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے، جس کا یہ مفہوم ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے، جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔"

پھر انہوں نے "اسلام اینڈ نیشنلزم" میں اظہار خیال کرتے ہوئے ۱۹۳۰ء میں فرمایا۔

"اگر انسانی معاشرے کا مقصد بین الاقوامی امن و سلامتی کا حصول اور موجودہ معاشرتی نظام کی ایک معاشرتی وحدت میں تبدیلی ہے تو انسان اسلام کے سوا کسی اور معاشرتی نظام کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ اس لئے کہ میرے مطالعہ قرآن کے مطابق اسلام صرف فرد کی اخلاقی اصلاح ہی کو پیش نظر نہیں رکھتا بلکہ انسانیت کی معاشرتی زندگی میں ایک ایسے تدریجی لیکن بنیادی انقلاب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے، جو قوم پرستانہ اور نسلی نقطۂ نظر کو سراسر بدل دے اور اس کے بجائے خالص انسانی شعور پیدا کرے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اسلام اور فقط اسلام ہی تھا، جس نے پہلی بار انسانیت کو یہ پیغام دیا کہ مذہب قوم پرستانہ اور نسلی یا انفرادی معاملہ نہیں بلکہ خالص انسانی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا مقصد انسانوں کے فطری امتیازات

کے باوجود انہیں باہم متحد اور منظم کرنا ہے۔"

پھر ۱۹۳۲ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے ارشاد فرمایا۔

"جس مذہب کی آپ نمائندگی کرتے ہیں، وہ فرد واحد کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی تربیت کرتا ہے تاکہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور انسان کی خدمت میں دے ڈالے۔ اس کے امکانات ابھی تک ختم نہیں ہوئے۔ وہ اب بھی ایک ایسی نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے، جہاں انسان کا معاشرتی درجہ اس کی ذات، رنگ اور اس کے کمائے ہوئے منافع کی مقدار سے متعین نہ ہوتا ہو بلکہ اس کی زندگی کے مطابق کیا جاتا ہو، جسے وہ بسر کرتا ہے۔ جہاں غربا مالداروں پر ٹیکس عائد کرتے ہوں، جہاں انسانی سوسائٹی مساوات شکم پر قائم نہ ہو بلکہ روحوں کی مساوات پر، جہاں ایک اچھوت بادشاہ کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہو، جہاں نجی ملکیت ایک امانت کی شکل رکھتی ہو اور جہاں سرمایہ جمع کرنے کی اس طرح اجازت نہ دی جائے کہ وہ اصلی دولت پیدا کرنے والے پر غلبہ حاصل کرے۔"

تو یہ گویا مختصراً اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت تھی جو علامہ اقبالؒ نے فرمائی، یہ میرے خیال میں کافی ہے۔ لیکن ایک بات عرض کر دوں کہ اگر ہم مخصوص مسائل کے متعلق بحث میں الجھ گئے تو تعلیمی نقطۂ نظر سے شائد کچھ خطرہ باقی ہو گا مثلاً یہ سود کا مسئلہ ہی لے لیجئے۔ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے کہ سود کس چیز کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ مولانا جعفر نے خود فرمایا قرآن مجید میں لفظ ربا ہے سود نہیں۔ تو ربا کی کیا شکلیں ہیں، جن کو اسلام نے مردود قرار دیا ہے، اس پر بحث اور اختلاف ہو سکتا ہے۔ چند بڑے مخلص مسلمانوں نے بعد میں اس پر اختلاف کیا ہے اور صارفی قرضوں کو تو انہوں نے سود میں شمار کیا ہے جو منع ہے۔ لیکن تجارتی سود کو وہ ایک حد کے اندر جائز قرار دیتے ہیں۔ مثلاً مفتی محمد عبدہ نے بھی ایک موقع پر اس قسم کا فتویٰ دیا تھا اور خود مولانا جعفر نے کمرشل انٹرسٹ

پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے دلائل پیش فرمائے ہیں کہ کمرشل انٹرسٹ بھی کسی حد تک جائز ہو سکتا ہے۔ تو اس لئے میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ افراط و تفریط سے ہمیں بچنا چاہیئے کیونکہ اسلام ایک اعتدال کی زندگی پسند کرتا ہے۔ وہ نہ تو سرمایہ داری کی انتہا کو چاہتا ہے اور نہ اشتراکیت کی انتہا پسند کرتا ہے۔ وہ انفرادی حقوق کو بھی قائم کرتا ہے لیکن اجتماعی مفادات کو ان پر فوقیت عطا کرتا ہے۔ اسی لئے ملکیت کا تصور جیسا کہ مولانا نے فرمایا اسلام میں امانت کا تصور ہے، نہ محض ملکیت کا اور ضرورت سے جو زائد چیز ہو اس کا خرچ کرنا گویا اسلامی نقطۂ نظر سے ایک بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا کہ یہ گویا خدا کو قرض دینا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ترغیب ہو سکتی ہے اس بات کی کہ جو کچھ ضرورت سے زائد آپ رکھتے ہیں اس کو فی سبیل اللہ خرچ کر دیا جائے اور پھر یہ بھی کہ اشتراکیت میں جو طبقاتی جنگ کا تصور ہے اور جسے آج کل ہمارے سامنے ایک نصب العین کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ طبقاتی جنگ کے بغیر معاشرتی عدل قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی اسلام کے منافی چیز ہے کیونکہ وہ تو ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے، جس میں صاحب ثروت لوگ جیسا کہ میں نے عرض کیا اپنی دولت کے امین ہیں اجتماعی مفاد کے لئے۔ اور ان کے درمیان رشتہ اخوت کا ہے، تمام امت کے افراد کے درمیان، خواہ وہ امیر ہیں، خواہ غریب، وہ سب خدا کی نظر میں برابر ہیں اور آپس میں رشتہ اخوت و محبت کا ہے، مروّت کا ہے، ایک دوسرے کی مدد کا ہے، ایک دوسرے کی خوشیوں اور دکھوں میں شریک ہونے کا ہے۔ اشداء علی الکفار رحماء بینہم۔

دوسری بات مولانا نے یہ فرمائی کہ بٹائی کا جو نظام ہے وہ بھی خلاف اسلام ہے۔ یہ بھی کچھ اختلافی مسئلہ ہے۔ میں ادب کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے حجۃ اللہ البالغہ

میں شاہ ولی اللہ کا یہ خیال دیکھا کہ بٹائی جائز ہے۔ انہوں نے زید سے ایک روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے اس کو جائز قرار دیا تھا۔ تو گویا حدیث سے بھی بعض دفعہ اختلافی مسائل نکل آتے ہیں۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ اختلافی مسائل میں الجھنے کی بجائے ہم اگر تعلیمی اغراض کے لئے اقدار اسلامی اور ان کے موٹے موٹے اصولوں کی طرف دھیان رکھیں تو زیادہ مناسب اور بہتر ہوگا۔ دوسری بات میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ٹیکسٹ بک بورڈ نے جو اقدام کیا ہے وہ بڑا ہی مبارک ہے اور آئندہ کے لئے نیک فال ہے۔ خدا کرے ان کو کامیابی حاصل ہو کیونکہ یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے کہ ہم نئی پود کو کس قسم کی تعلیم دے رہے ہیں، ان کی اٹھان کس طرح سے ہو رہی ہے۔ ان کے خیالات کس طرف پلٹ رہے ہیں اور کس سمت کی طرف وہ سفر کرنے کو تیار ہیں۔ اس بارے میں میں سمجھتا ہوں استاد کا درجہ ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے اور جب تک استاد خود اسلامی اقدار کے رنگ میں نہ رنگے ہوئے ہوں، ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ آپ محض درسی کتاب لکھ کر طالب علم کے سامنے رکھ دیں تو اس کا کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوگا۔ مجھے معاف کیا جائے، بہت سے استاد حضرات یہاں تشریف فرما ہیں اور ان میں سے کئی ایک تو ایسے ہیں جو اسلامی اقدار میں رنگے ہوئے ہیں۔ لیکن بعض ایسے بھی میرے علم میں ہیں جو خود اسلامی اقدار سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ تو پہلے ان کو بھی تعلیم اسلام سے آشنا کرنا ہوگا تاکہ وہ آگے اپنی نئی پود کو وہ باتیں بتا سکیں جو ایک حقیقی ترقی پذیر دین کا حصہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ گورنمنٹ یہ بھی اہتمام کرے کہ استادوں کے لئے ریفریشر کورس ہوں تاکہ ان کو ان مبادیات اور اصولوں سے آشنا کیا جا سکے جو ہماری تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں، جو ہماری ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں، دین سے تعلق رکھتے ہیں

اور پھر ان سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ جو بھی مضمون پڑھائیں اس رنگ میں چونکہ وہ رنگے ہوئے ہوں گے، اس لئے اپنے خیالات میں ان کا پر تو طالب علموں کے سامنے پیش کریں گے اور یہ ایک بالواسطہ سی چیز ہو جائے گی، بلاواسطہ نہیں۔ بلاواسطہ اگر ہم محض وعظ و نصیحت پر اتر آئے تو ان مضامین کو بھی شاید دھکا لگنے کا اندیشہ ہے اور اس طرح سے بالواسطہ آخر اسی روح کو اپناتے ہوئے جو اسلام پیش کرتا ہے اگر ہم ہر ایک مضمون کو اس کی روح کے مطابق پیش کرنے کی اہلیت پیدا کرسکیں تو پھر اس سے بہتر اور کوئی چیز نہیں۔ میں ان چند گزارشات کے ساتھ اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

سیمینار کے شرکاء

گروہی بحث کی رپورٹیں

(۲۷- ستمبر ۱۹۷۱ء)

سوالات

۱- (الف) نظریۂ پاکستان کی تعریف آپ کے نزدیک کیا ہے؟

(ب) گزشتہ ۲۴ برس کی تاریخ سے نظریۂ پاکستان کے متعلق ہم کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں؟

۲- (الف) اسلام کے معاشی نظام کے اہم اصول کیا ہیں؟

(ب) اسلام، سرمایہ داری نظام اور اشتمالیت میں کیا بنیادی فرق ہے؟

(ج) کیا اسلامی معاشی نظام بتدریج نافذ کیا جانا چاہیئے؟ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو اس سلسلے میں کون سے اقدامات کس ترتیب سے کیے جائیں۔

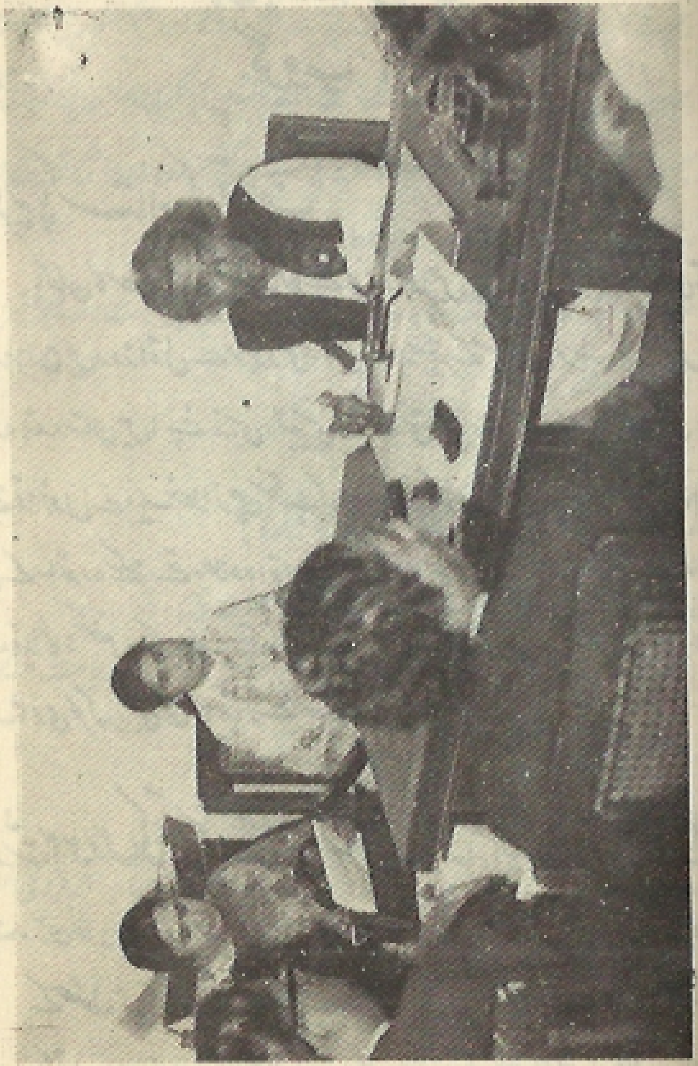

۲۷- ستمبر ۱۹۷۱ء کی گروہی بحث - ڈاکٹر نذیر احمد صدارت کر رہے ہیں

گروہی بحث کی رپورٹ

گروپ الف

نظریۂ پاکستان کی تعریف

پاکستان کا مطالبہ ایک مثبت نظریے کا نتیجہ تھا جس کی بنیاد دراصل مسلمانوں کی تاریخ اور مزاج میں روزِ اوّل سے موجود تھی۔ اس لئے برصغیر کے مسلمانوں کو جب یہ احساس ہوا کہ وہ ہندوستان میں اپنے مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی نظریات کے مطابق زندہ نہیں رہ سکتے تو انہوں نے ایک خطۂ زمین منتخب کیا، جہاں وہ اکثریت میں تھے اور جہاں وُہ اقتدارِ کُل کے ساتھ رہ سکتے تھے۔ علاوہ ازیں چونکہ کوئی قوم بغیر وطن کے نہیں رہ سکتی اور مسلمان چونکہ ایک جُداگانہ تشخص کے مالک تھے اس لئے پاکستان کے حصُول کی یہ کوشش کی گئی۔ اس کا ایک ثانوی محرک یہ بھی تھا کہ اغیار سے تحفظ ہو۔

گزشتہ ۲۴ برس کی تاریخ سے نظریۂ پاکستان کے متعلق ہم کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں؟

الف۔ جن نظریات و توقعات کے تحت پاکستان حاصل کیا گیا تھا، تخلیقِ پاکستان کے بعد ان کے حصُول میں ہم بُری طرح ناکام ہُوئے ہیں۔ ان کی وجُوہ یہ ہیں۔

۱۔ پاکستانی سیاسی قیادت سے عوام کی بے دخلی اور اقتدار کا خود غرض اور عاقبت نا اندیش افراد کے ہاتھوں میں چلا جانا۔

۲۔ ہم نے شعوری طور پر کوئی ایسی کوشش نہیں کی جس سے پاکستان کی نظریاتی، فکری، تہذیبی اور ثقافتی سرحدوں کی حفاظت ہو۔

۳۔ ہم نے اپنے درمیان فکری خلا کو پیدا ہونے سے نہیں روکا اور نتیجتاً خارجی نظریات ہمارے ذہنوں میں سرایت کرنے لگے، جس سے پاکستان کی فکری اساس پر زد پڑتی تھی۔

(ب) ہم نے یہ سبق حاصل کیا ہے کہ اگر ہم نے نظریۂ پاکستان کی شعوری اور واضح ترویج و اشاعت نہ کی تو پاکستان کا وجود معرضِ خطر میں پڑ سکتا ہے۔

(ج) موجودہ وقت کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ فی الفور اس سلسلے میں مثبت اور نتیجہ خیز اقدامات کئے جائیں۔

اسلام کے معاشی نظام کے اصُول کیا ہیں؟

(الف) ہمارے نزدیک اسلام کے معاشی نظام کے اصُول یہ ہیں۔

۱۔ اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی، جس میں افراد کی بنیادی ضروریات ریاست کے ذمے ہوتی ہیں۔

۲۔ کسبِ زر اور انفاق میں اخلاقیات کے اصُولوں کی کارفرمائی۔

۳۔ زکوٰۃ کا نظام، جس کی عملداری ریاست کے ذمے اور عفو و احسان، جو فرد کی اخلاقی تربیت کے تحت اختیاری ہو۔

اسلام، سرمایہ داری نظام اور اشتمالیت میں بُنیادی فرق کیا ہے؟

۱۔ اسلام میں تمام ملکیت اللہ تعالیٰ کی فرض کی گئی ہے اور انسان اس کا ایک امین ہے۔ آمدنی

کی عادلانہ تقسیم، استحصال کی مخالفت، ارتکاز زر کی نفی اور ایک فلاحی ریاست کا تصور اسلامی معاشیات کے اہم پہلو ہیں اور یہ سب خدا کے دیئے ہوئے نظامِ اخلاقیات کے تابع ہیں۔

۲- سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں استحصال کا پہلو غالب ہے۔ فرد کی معاشی کارکردگی بعض اوقات ریاست سے بغاوت کی حد تک چل جاتی ہے اور اخلاقی اقدار کو وقتی حالات کے مطابق بدلا جا سکتا ہے۔

۳- اشتمالیت میں تمام ملکیت کا ریاست کے قبضے میں ہونا، فرد کی آزادی کی نفی اور ریاست کے بنائے ہوئے اخلاقی اصولوں کا نفاذ بنیادی اصول ہیں۔

کیا اسلامی معاشی نظام بتدریج نافذ کیا جانا چاہیئے؟

ہماری رائے اثبات میں ہے۔

اقدامات:-

پہلی ترجیح ان اصولوں کے نفاذ میں ہو گی جو قرآن حکیم میں واضح طور پر بتائے گئے ہیں۔

۱- نظامِ زکوٰۃ اور بیت المال کا قیام اور تقسیم زکوٰۃ کا شرعی قوانین کے مطابق بندوبست۔

۲- تمام ذرائع آمدنی اور اخراجات کی مدات کی نفی جو رزق حرام کے تحت آتی ہیں۔

۳- تعلیم و تدریس کے ذریعے ایک اخلاقی ماحول کی تشکیل، جس میں اسلامی معاشی نظام کا نفاذ اور انطباق آسانی سے ہو سکے۔

۴- سودی نظام کو اولاً اندرونِ ملک اور آہستہ آہستہ باہمی معاہدات کے تحت خارج ممالک سے ختم کیا جائے۔

گروہ کے صدر:- ڈاکٹر نذیر احمد

گروہ کی سیکرٹری:- مس شکیلہ شریف

گروہی بحث کی رپورٹ

گروپ ب

نظریۂ پاکستان کی تعریف

ایک الگ خطۂ زمین کا حصول، جس میں مسلمانانِ برصغیر کتاب و سنت کی روشنی میں اسلامی اقدار و نظریات کا تحفظ و فروغ کر سکیں۔ ایک رکن نے اس رائے کا اظہار بھی کیا کہ اسلام کے انقلابی اصولوں کی ایسی تعبیر و تشریح کی بھی ضرورت ہے جو عصرِ حاضر کے چیلنج کا جواب دے سکے بشرطیکہ یہ تعبیر و تشریح اسلام کی بنیادی تعلیمات کو مجروح نہ کرے۔

گزشتہ ۴۲ برس کی تاریخ میں نظریۂ پاکستان سے متعلق ہم کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں

۱- ہمارے قول و فعل میں اختلاف، بہت سی ناکامیوں اور نامرادیوں کا باعث ثابت ہوا ہے۔

۲- اجتماعی مسائل کو اسلام کی روشنی میں سمجھنے کی کوئی منظم کوشش نہیں کی گئی۔

۳- عوام کی نظریۂ پاکستان سے کومٹمنٹ COMMITMENT کا اہتمام نہ کیا گیا۔

۴- قوم میں منافقانہ مزاج اس لئے پیدا ہوا کہ بعض غیر ملکی نظریات کی یلغار کو روکنے کا بروقت توڑ نہ سوچا گیا۔ نتیجتاً بے یقینی اور تذبذب کی فضا پیدا ہوئی۔

۵- ایک رکن نے اس رائے کا اظہار بھی کیا کہ پاکستان میں جمہوری اور سیاسی عمل کے رک رک کر چلنے کے باعث بھی نظریۂ پاکستان کی کوئی عملی صورت واضح نہ ہو سکی۔

پس چہ باید کرد؟

۱۔ اساتذہ کے ذہن و فکر کی تشکیل نظریۂ پاکستان کی روشنی میں کی جائے تاکہ اساتذہ نئی نسل کو بہت سی ذہنی و فکری گمراہیوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس سلسلے میں مشرقی پاکستان کے المیہ میں ہندو اساتذہ کے کردار سے بھی سبق لینا چاہیئے۔

۲۔ قائدِ اعظمؒ کے بعد ہمیں ابھی تک کوئی ایسا حکمران میسر نہیں آیا جو اسلامی نظام کے نفاذ میں مخلص ہوتا۔

۳۔ ایسی تحریکوں کو منظم کرنا چاہیئے، جو ملک میں اسلام کے نفاذ کی سعی کریں۔

۴۔ تعلیمی پالیسی بلکہ بعض دوسری اہم پالیسیوں کی تشکیل میں عوام کو بھی شریک کیا جانا چاہیئے۔

اسلام کے معاشی نظام کے اہم اصول

۱۔ ہر انسان محنت سے کمائے۔

۲۔ آمدنی کے ذرائع اور خرچ کے طریقے حلال ہونے چاہئیں۔ یعنی ذرائع و مقاصد میں اسلامی تعلیمات کو مشعلِ راہ بنانا چاہیئے۔

۳۔ اسلام معاشرے میں ایسے حالات پیدا کرتا ہے، جس سے دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کے امکانات ختم ہوجاتے ہیں اور امیر و غریب کی تفریق کم کردی جاتی ہے۔

۴۔ اسلام کے معاشی اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک احتسابی ادارہ قائم کیا جائے۔

اسلام، سرمایہ داری اور اشتمالیت میں فرق

۱۔ اسلام اور اشتراکیت و سرمایہ داری میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلامی اقتصادی نظام

میں روحِ اعتدال کارفرما ہے جبکہ سرمایہ داری و اشتراکیت دونوں انتہاپسندی کی طرف لے جاتے ہیں۔

۲۔ اشتراکیت میں حکومت کی مطلق العنانیت فرد کی آزادی کو ختم کردیتی ہے اور حکومت کے فیصلے ہی غلط اور صحیح کا معیار بن جاتے ہیں۔

۳۔ سرمایہ دارانہ نظام صرف سرمائے کے گرد گھومتا ہے اور ایک فرد یا ادارے کے لئے سرمایہ جمع کرنے کی کوئی حد مقرر نہیں جبکہ اسلام میں سماجی، معاشرتی اور اخلاقی نظام کی بہت اہمیت ہے۔

۴۔ اسلامی معاشی نظام فوری طور پر نافذ ہو یا بتدریج۔ اسلام کے نفاذ کا فیصلہ فوراً ہونا چاہیئے لیکن نفاذ سے پیشتر ماحول پیدا کرنے کے لئے کچھ معینہ مدت بھی درکار ہے۔

گروہ کے صدر:۔ ڈاکٹر مسرت علی خان

گروہ کے سیکرٹری:۔ پروفیسر وارث میر

گروہی بحث کی رپورٹ

گروپ ۔ ج

نظریۂ پاکستان کی تعریف

علی عباس ۔ نظریۂ پاکستان اور اسلام ہم معنی ہیں۔ نظریۂ پاکستان تعلیمات اسلام کی عملی صورت کا نام ہے۔

اسلم سعید :۔ نظریۂ پاکستان انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے مطابق ڈھالنا ہے اور ان نظریات سے بچنا ہے، جو اس کے منافی ہیں۔

صفدر حسین :۔ اپنے وطن سے محبت کا نام نظریۂ پاکستان ہے۔ غیر مسلموں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے سرزمین پاکستان سے محبت ضروری ہے۔ رنگ و نسل اور مذہب کی شرط نہیں۔

فضل حق :۔ پاکستانی اور اسلامی نظریہ میں فرق ہے۔ استحصال پسندوں کے ساتھ جنگ اب بھی ہونی چاہیے ورنہ نظریہ نامکمل رہے گا۔

مس ارشاد :۔ اسلامی مملکت پہلے، پاکستان بعد میں۔ علیحدہ مملکت میں دین اور ثقافت کا تحفظ نظریۂ پاکستان کی اساس ہے۔

عبد الحئی علوی :۔ نظریۂ پاکستان کی تعریف اور تشریح وہی کر سکتا ہے، جو اس ملک کا بانی تھا۔ ان کے الفاظ میں ہندو اور مسلمان ہر طرح سے الگ الگ قومیں ہیں۔ ثقافت، دین، تہذیب، تاریخ، ذہنیت ہر لحاظ سے الگ ریاست کا قیام منفرد ہونے کی

وجہ سے ضروری ہوا تاکہ اپنے مفادات، اپنا مذہب اور اپنی ثقافت محفوظ رہیں۔

زرینہ خانم :۔ الگ ریاست میں اپنے مذہبی اور معاشی نظام کے لئے پاکستان لیا گیا تھا۔

افتخار احمد :۔ برصغیر میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ ملک کا نام ہی نظریۂ پاکستان ہے۔

صادق حسین :۔ اللہ اور رسولؐ کے طریقے پر زندگی گزاریں۔ ہندو اور مسلمان مل جل کر رہیں۔

ڈاکٹر عبد الحمید :۔ ہم غیروں کو پہلے دیکھتے ہیں، اپنوں کو بعد میں، جو غلط نظریہ ہے۔ قوم کا ترجمہ نیشن NATION کرتے ہیں اور اس سے ہماری نظر مغرب پر چلی جاتی ہے۔ مغرب کا نظریۂ زبان، روایات، نسل الگ ہے۔ ہمیں NATION کا ترجمہ ملت کرنا چاہیے۔

گزشتہ ۲۴ برس کی تاریخ سے نظریۂ پاکستان کے متعلق ہم کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں؟

اسلم سعید :۔ جس سیاسی جماعت نے نظریۂ پاکستان اپنا کر پاکستان حاصل کیا، وہی جماعت اصل مقصد بھول گئی۔ قرار دادیں منظور ہوئیں، عمل نہیں ہوا۔ نظریاتی مملکت میں خاص طور پر نوجوان طبقے کو نظریے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ احساس بہت بعد میں ہوا۔

مس ارشاد :۔ مغربی تہذیب نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔

ایک صاحب :۔ نظریۂ پاکستان ہم آج تک (DEFINE) ہی نہیں کر سکے، ورنہ ہم خانہ جنگی کا شکار نہ ہوتے۔

عبد الحئی علوی :۔ یہ ایک نظریہ ہے، اس پر عمل نہیں ہوا۔ اسلام کی طرح نظریۂ پاکستان بھی مظلوم ہے۔ تعلیمی ادارے اسے شروع کرتے، استاد اس نظریے کے حامی ہوتے۔ ایسا

گروہی بحث کی رپورٹ

گروپ ۔ ج

نظریہ پاکستان کی تعریف

علی عباس ۔ نظریہ پاکستان اور اسلام ہم معنی ہیں۔ نظریہ پاکستان تعلیمات اسلام کی عملی صورت کا نام ہے۔

اسلم سید :۔ نظریہ پاکستان انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے مطابق ڈھالنا ہے اور ان نظریات سے بچنا ہے، جو اس کے منافی ہیں۔

صفدر حسین :۔ اپنے وطن سے محبت کا نام نظریہ پاکستان ہے۔ غیر مسلموں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے سرزمین پاکستان سے محبت ضروری ہے۔ رنگ ونسل اور مذہب کی شرط نہیں۔

فضل حق :۔ پاکستانی اور اسلامی نظریہ میں فرق ہے۔ استحصال پسندوں کے ساتھ جنگ اب بھی ہونی چاہئے ورنہ نظریہ نامکمل رہے گا۔

مس ارشاد :۔ اسلامی مملکت پہلے، پاکستان بعد میں۔ علیحدہ مملکت میں دین اور ثقافت کا تحفظ نظریہ پاکستان کی اساس ہے۔

عبد الحئی علوی :۔ نظریہ پاکستان کی تعریف اور تشریح وہی کر سکتا ہے، جو اس ملک کا بانی تھا۔ ان کے الفاظ میں ہندو اور مسلمان ہر طرح سے الگ الگ قومیں ہیں۔ ثقافت، دین، تہذیب، تاریخ، ذہنیت ہر لحاظ سے الگ ریاست کا قیام منفرد ہونے کی

وجہ سے ضروری ہوا تاکہ اپنے مفادات، اپنا مذہب اور اپنی ثقافت محفوظ رہیں۔

زرینہ خانم :۔ الگ ریاست میں اپنے مذہبی اور معاشی نظام کے لئے پاکستان لیا گیا تھا۔

افتخار احمد :۔ برصغیر میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ ملک کا نام ہی نظریہ پاکستان ہے۔

صادق حسین :۔ اللہ اور رسولؐ کے طریقے پر زندگی گزاریں۔ ہندو اور مسلمان مل جل کر رہیں۔

ڈاکٹر عبد الحمید :۔ ہم غیروں کو پہلے دیکھتے ہیں، اپنوں کو بعد میں، جو غلط نظریہ ہے۔

قوم کا ترجمہ نیشن NATION کرتے ہیں اور اس سے ہماری نظر مغرب پر چلی جاتی ہے۔ مغرب کا نظریہ زبان، روایات، نسل الگ ہے۔ ہمیں NATION کا ترجمہ ملت کرنا چاہیے۔

گزشتہ ۲۴ برس کی تاریخ سے نظریہ پاکستان کے متعلق ہم کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں؟

اسلم سید :۔ جس سیاسی جماعت نے نظریہ پاکستان اپنا کر پاکستان حاصل کیا، وہی جماعت اصل مقصد بھول گئی۔ قرار دادیں منظور ہوئیں، عمل نہیں ہوا۔ نظریاتی مملکت میں خاص طور پر نوجوان طبقے کو نظریے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ احساس بہت بعد میں ہوا۔

مس ارشاد :۔ مغربی تہذیب نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔

ایک صاحب :۔ نظریہ پاکستان ہم آج تک (DEFINE) ہی نہیں کر سکے، ورنہ ہم خانہ جنگی کا شکار نہ ہوتے۔

عبد الحئی علوی :۔ یہ ایک نظریہ ہے، اس پر عمل نہیں ہوا۔ اسلام کی طرح نظریہ پاکستان بھی مظلوم ہے۔ تعلیمی ادارے اسے شروع کرتے، استاد اس نظریے کے حامی ہوتے۔ ایسا

بھی نہ ہو سکا اور اصل مقصد فوت ہو گیا۔

ایک صاحب:- علاقائی ثقافت چھوڑ کر پاکستانی ثقافت کی طرف آیئے۔ علاقائی ثقافت قربان کیجئے ورنہ علیحدگی کے رجحان کو تقویت ملے گی۔

افتخار احمد:- پاکستان لیا اور کام کے لئے تھا مگر یہ حصول اقتدار کا ذریعہ بن گیا۔ اصل مقصد کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔

ڈاکٹر عبدالحمید:- کسی پروگرام کو عملی جامہ نہ پہنانے والی قومیں مٹ جاتی ہیں۔ بے مقصد جینے والی قومیں بھی مٹ جاتی ہیں۔

نصب العین یا مقصد کو پس پشت ڈال دیں تو تباہی کی طرف جانا لازمی ہے۔

کارفرماؤں کی زبان یہ ہے، کہ جو کہتے ہیں، اس پر عمل نہیں کرتے۔

اسلام کے معاشی نظام کے اہم اصول کیا ہیں؟

ایک صاحب:- یہ حدیث ہمارے لئے کافی ہے کہ وہ شخص مسلمان نہیں جس کا پڑوسی بھوکا سو جائے اور وہ خود پیٹ بھرلے۔

ایک صاحب:- ہم اللہ کی حاکمیت تسلیم کریں۔ سب کچھ اللہ کا ہے اور ہم اس کے صرف امین ہیں۔

ایک صاحب:- قرآن نے ایک MOTTO دیا ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

اس لئے ہمارا جینا مرنا خدا کے لئے ہے۔

علی عباس:- تقسیم دولت اسلام کا اصول ہے۔

حصول زر صحیح طریقے سے ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر عبدالحمید:- بنیادی اصول عدل ہے اور اسے معاشی نظام میں داخل کرنا چاہیئے۔

محمد اسلم:- وراثت، صدقات، زکوٰۃ، خیرات کے نظاموں سے اسلام میں گردش دولت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

اسلام، سرمایہ داری نظام اور اشتمالیت میں کیا بنیادی فرق ہے؟

ایک صاحب:- اسلام پہلا نظام ہے جس نے گردش دولت کا اصول بتایا ہے۔

سرمایہ داری نظام میں انسان کی تخلیقی قوت کو جلا ملتی ہے۔ ہر شخص جدوجہد سے کما سکتا ہے۔ اشتمالیت میں انفرادی قوت ختم ہے۔

اسلام دونوں کے بین بین ہے۔ خیر الامور اوسطہا۔

ایک صاحب:- رزق حلال کا تصور اسلام نے دیا ہے اور کسی نے نہیں۔

ڈاکٹر عبدالحمید:- اقبال نے کہا تھا۔ سوشلزم + خدا = اسلام

بہت سے لوگ اس سے گمراہ ہو گئے کیونکہ وہ یہ سمجھ نہ سکے۔ کہ خدا کے حضور عبودیت، اس کے احکام کے آگے سر جھکانا کس قدر اہم ہے۔

اشتمالیت بے قابو گھوڑا ہے، خدا جانے کس طرف نکل جائے۔

ایک صاحب:- اسلام کے کچھ بنیادی اصول ہیں جو دوسرے نظاموں میں نہیں۔

باقی نظام وقت کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ اسلام کے اصول اٹل ہیں۔

علی عباس:- سرمایہ داری نظام میں کمانے پر کوئی پابندی نہیں۔

اسلام نے بھی اس پر پابندی نہیں لگائی لیکن خرچ کا طریقہ بتایا ہے۔ اشتمالیت دولت جمع کرنے پر پابندی لگاتا ہے۔

کیا اسلامی معاشی نظام بتدریج نافذ کیا جانا چاہیئے؟

ایک صاحب :۔ فوری طور پر نافذ کریں۔ مسلمان ہونے کا کیا فائدہ۔ "بتدریج" کام چوری کا نام ہے۔

ایک صاحب :۔ اب دین مکمل ہو چکا ہے۔ اس لئے اب بتدریج کا کوئی سوال نہیں۔ اب اسلام کا معاشی نظام فوری طور پر نافذ ہونا چاہیئے۔

ایک صاحب :۔ ہم مسلمان ہیں۔ اسلامی معاشرہ میں رہتے ہیں۔ اسلام پر نجی زندگی میں عمل کرتے نہیں ہیں۔ اسے صرف سرکاری حیثیت حاصل ہے۔ نفاد کوئی نئی چیز نہیں ہو گی۔ جمود طاری ہے اسے توڑا جائے۔ شاہ ولی اللہ اور اقبالؒ نے اس جمود کو توڑنے کی کوشش کی۔ ہمارا موجودہ قانون گزشتہ عہد کے معاشرے کیلئے تھا۔ پہلے تمام قانون پر موجودہ معاشرے کے پیش نظر نظرثانی کی جائے۔

حاصل بحث

سوال نمبر ۱:۔ نظریۂ پاکستان کا مطلب مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت کا قیام ہے، جس میں ان کے دین اور ثقافت، تہذیب اور تاریخ کا تحفظ ہو سکے اور مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے مطابق ڈھال سکیں اور قرآن وسنت

پر مبنی معاشی نظام سے استحصال اور ارتکاز زر ختم ہو سکے۔

سوال نمبر ۲:۔ کسی نظریاتی مملکت میں نوجوان پود کو خاص طور پر اس کے نظریے کی تعلیم دی جاتی ہے مگر ہم نے اس کا ادراک نہیں کیا اور مغربی تہذیب کی مضرتوں کا شکار رہے۔ تعلیم کے ذریعے ہمیں اس نظریے کو نوجوانوں کے دلوں اور ذہنوں میں راسخ کرنا تھا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ہمیں علاقائی رجحانات سے بچنے کے لئے بھی نظریۂ پاکستان کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھنا چاہیئے تھا مگر یہ بھی نہ ہوا۔

سوال نمبر ۳:۔ اسلام میں حصول زر صحیح طریقے سے ہونا چاہیئے۔ اسلام میں حاکمیت اعلیٰ اللہ کی ہے اور ہم صرف اس کے امین ہیں۔ اسلام میں گردش دولت کے لئے زکوٰۃ، صدقات، خیرات، عشر، وراثت وغیرہ کے قوانین موجود ہیں۔ اس طرح معاشی استحصال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سوال نمبر ۴:۔ اسلام پہلا نظام ہے جس نے گردش دولت کا اصول بنایا ہے سرمایہ داری نظام میں ہر انسان اپنی جد وجہد سے کما سکتا ہے اور اشتمالیت میں انفرادی ملکیت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسلام کے اصول ابدی ہیں اور ہر زمانے میں کام آ سکتے ہیں جبکہ دوسرے نظام وقت کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ اسلام نے کمائی پر پابندی نہیں لگائی لیکن خرچ کا طریقہ بتایا ہے۔ اسلامی نظام کو فوری طور پر نافذ کرنا چاہیئے۔

گروہ کے صدر :۔ ڈاکٹر میاں شکور احسن
گروہ کے سیکرٹری :۔ پروفیسر محمد اسلم (شعبہ تاریخ)

گروہی بحث کی رپورٹ

گروپ د

سوال نمبر ۱ (ا) اسلامی ضابطۂ حیات کے نفاذ کے لئے برصغیر کے مسلمانوں کی ایک مثالی ریاست کا قیام تاکہ وہ اپنے ثقافتی تشخص کو فروغ دے سکیں۔

(ب) گذشتہ چوبیس سالہ تاریخ شاہد ہے کہ عملاً ہم نے نظریۂ پاکستان سے انحراف کیا ہے۔ پاکستان کے حالیہ بحران کا بنیادی سبب یہی ہے اور اس سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ اسلامی ضابطۂ حیات و اقدار، اس کے تمام سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی تقاضوں کے ساتھ فوری طور پر اپنایا جائے تاکہ ہم لسانی، علاقائی اور دیگر تفرقات کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔

سوال نمبر ۲

(ا) اسلامی معاشی نظام کے اہم اصول

۱۔ بنیادی ضروریات کی ضمانت دی جائے۔

۲۔ ارتکاز زر نہ ہو البتہ حلال ذرائع سے حاصل کی ہوئی ذاتی ملکیت کی اجازت ہے۔

۳۔ اسلام کا نظام زکوٰۃ ایک ایسا بنیادی اصول ہے، جو دولت کو ایک جگہ مرتکز نہیں ہونے دیتا۔

۴۔ اگر انفرادی اور اجتماعی مفادات متصادم ہوں تو اجتماعی مفادات کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اولیت و فوقیت حاصل ہونی چاہیئے۔

۵۔ حلال و حرام کا امتیاز لازمی ہے۔

۶۔ یہ سرزمین اور اس کے تمام وسائل اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور ان میں تصرف بھی اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق ہونا چاہیئے۔

(ب) اشتمالیت میں پیدائش زر اور صرف زر کے تمام وسائل حکومت کے پاس ہوتے ہیں، سرمایہ داری نظام میں سرمایہ کاری کے تمام ذرائع افراد کے قبضہ میں ہوتے ہیں، اسلام میں دونوں نظاموں کی خوبیاں موجود ہیں۔

(ج) ہم اصولی طور پر متفق ہیں کہ اسلامی معاشی نظام فوری طور پر رائج کیا جائے لیکن اس معاملے میں جو تکنیکی مشکلات ہیں، انہیں کسی صورت میں بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ عبوری دور میں مزید اقتصادی خرابیوں کا احتمال ہوسکتا ہے۔

گروہ کے صدر: چودھری عبدالغفور

گروہ کے سیکرٹری: جناب شجاعت حسین بخاری

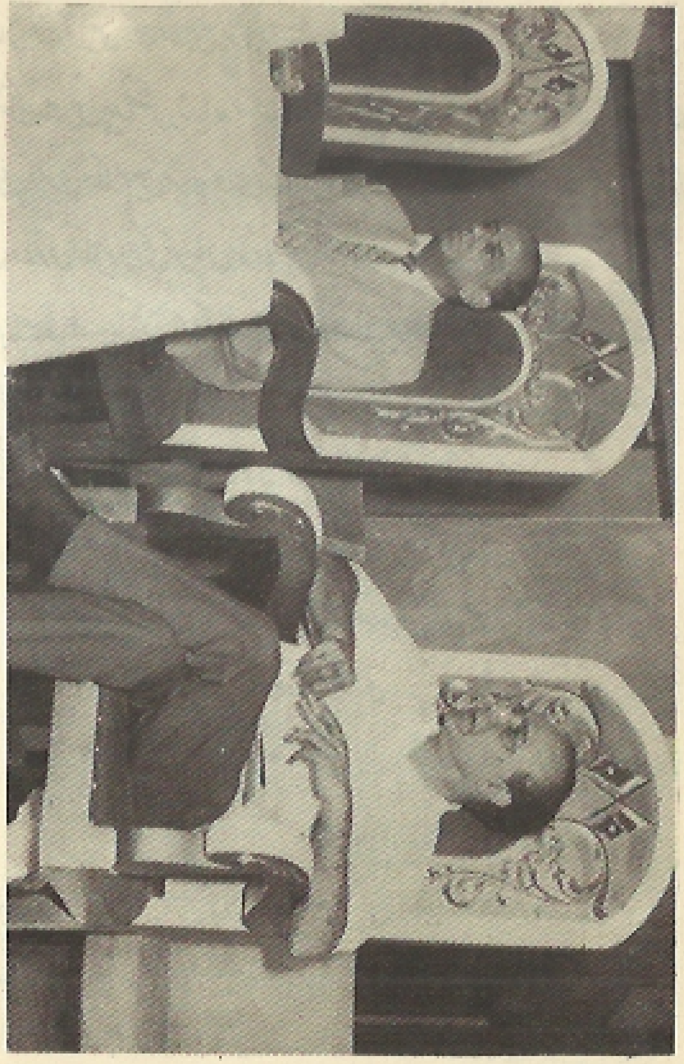

پروفیسر حمید احمد خان تیسری نشست کی صدارت کر رہے ہیں

خطبۂ صدارت

پروفیسر حمید احمد خان

خواتین و حضرات! سب سے پہلے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ تمام گروہی بحثوں سے ایک ہی نتیجہ نہیں نکلتا۔ طریقِ کار کے اختلافات، خود مقاصد کے تعین کے اختلافات موجود ہیں اور یہ جو میرے دوست وارث میر صاحب نے فرمایا ہے، اظہار و ابلاغ کے مسائل بیچ میں حائل ہو گئے۔ اس ملّت پاکستان میں ان مسائل پر جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں اختلاف رائے موجود ہے ہمیں تھنکیٹ ٹینک بورڈ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ ان مسائل کو نہایت وضاحت سے سوالیہ انداز میں انہوں نے ہمارے سامنے رکھ دیا۔ پہلے آپ نظریۂ پاکستان کی تاریخ کو لیجئے یہ اختلاف رائے اور تناقض کی حد تک پہنچا ہوا اختلاف رائے اس بنا پر پیدا ہوا کہ چوبیس برس میں ملّت پاکستان نے عجیب عجیب طرح سے پاکستان کے مقاصد اور جس نظریے پر پاکستان قائم ہوا، ان کا اظہار فرمایا۔ خواتین و حضرات! آپ میں جو اصحاب میرے ہم عمر تو نہیں لیکن کچھ کم عمر رکھتے ہیں اور انہوں نے پاکستان کی جد و جہد کو دیکھا ہے اُن کو یاد ہوگا کہ حضرت قائد اعظمؒ نے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک یا ۱۹۴۶ء تک بار بار دو قومی نظریے کی ترکیب TWO-NATION THEORY استعمال کی اپنے دلائل میں۔ اس وکالت میں جو انہوں نے ہندوؤں اور انگریزوں کے سامنے پیش کیے، بار بار دو قومی نظریے کا ذکر ہوا لیکن ۱۴ راگست، ۱۹۴۷ء کو جب قائد اعظمؒ نے پاکستان کے پہلے سربراہ کی حیثیت سے تقریر کی تو نہ صرف یہ کہ دو قومی نظریے کا ذکر نہیں ہوا، اس کے بعد انہوں نے اس پر زور بھی نہیں دیا۔ دو قومی نظریے کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ ہندوؤں سے خلاصی حاصل کرنے کے لئے قومی وکیل کو یہ ثابت کرنا تھا کہ ہم اور ہندو ایک قوم نہیں ہیں۔

پھر اس بات کو دہرانے کی ضرورت باقی نہ رہی بلکہ پہلی ہی تقریر میں جو قائد اعظمؒ نے قانون ساز اسمبلی میں فرمائی اس میں انہوں نے خاص طور پر یہ کہا کہ ملت پاکستان اختلاف مذہب کے باوجود ایک ملت ہے۔ ہندو بھی ہم میں کسی دن شامل ہو جائیں گے۔ یاد رکھیے کہ ہمارے قائد نے اس تمام عرصے میں کہا تھا کہ ہندو ایک الگ قوم ہیں اور اب انہوں نے یہ کہا کہ جو اسلام کا نظریہ ہے جس پر ہم نے پاکستان کو قائم کیا وہ ہندوؤں اور غیر مسلموں کو اپنی پناہ میں لینے کو تیار ہے اور اگر یہ پناہ ویسی ہی ہوتی جیسے اسلام دیتا رہا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہندو بھی اسی طرح پاکستان کے پیغام پر لبیک نہ کہیں، جس طرح ایشیائے کوچک کے عیسائیوں نے حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں مسلمانوں کو کہا حق کر آؤ اور ہمیں مشرقی پاپائیت کے پنجے سے چھڑاؤ اور یہ بھی ہوتا رہا ہے مسلمانوں کی تمام تاریخ میں کہ یہودی بھاگ بھاگ کر یورپ سے اُندلس اور ترکیہ میں پہنچتے رہے۔ اس بنا پر ہمیں قائد اعظمؒ کا قول یاد رکھنا چاہیئے کہ انہوں نے اصرار فرمایا کہ ہندوؤں کو اب ہم اپنے اندر قومی حیثیت سے قوم میں شامل کر رہے ہیں۔ گزارش کا مطلب صرف یہ تھا کہ وہ دن جب دو قومی نظریے کا بلند بانگ اعلان کرنا اور اس پر اصرار کرنا ضروری تھا۔ اب گزر چکے ہیں۔ اب بار بار ہمیں ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہندو اور ہم ایک قوم نہیں۔ اگر خدانخواستہ پاکستان پر پھر یہ وقت آئے کہ اپنی علیحدہ ہستی برقرار رکھنے کے لئے ہندوؤں سے اپنی علیحدگی ضروری ہو تو یقیناً دل سے ہم اقرار کریں گے کہ ہندو ہم میں ضم نہیں ہو سکتے اب تو ہم ان سے الگ ہو چکے۔ اب اس علیحدگی پر زور دینا میرے خیال میں درست نہیں ہے۔ ان دنوں بھی ۱۹۷۱ء میں بار بار بڑے بڑے سیاسی لیڈر اعلان کرتے ہیں کہ پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر قائم ہوا۔ دو قومی نظریہ ایک منفی حقیقت ہے اور اسلام ایک مثبت حقیقت

پر قائم ہوا ہے۔ دو قومی نظریہ اس مثبت حقیقت تک پہنچنے کا محض ایک ذریعہ تھا اور جب اس ذریعے کو استعمال کر چکے تو اب ہمیں اپنے مثبت نصب العین کا ذکر کرنا چاہیئے اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کے چاروں گروہوں نے اس چیز پر اب زور نہیں دیا کہ دو قومی نظریے پر پاکستان بننا چاہیئے۔ پاکستان تو بن چکا اب تو پاکستان کو کس طرح قائم رہنا چاہیئے۔ اور کس نظریے پر قائم ہوا اس پر مختلف رائیں ظاہر ہوئیں یہ کہنا چاہیئے کہ اسلام کی بنا پر قائم ہوا یہ تیسرے گروہ کے دلائل میرے سامنے ہیں۔ مثلاً اس میں میاں شکور احسن صاحب کا گروہ تھا۔ پروفیسر محمد اسلم صاحب نے نہایت مفصل رپورٹ آپ کے سامنے رکھی ہے۔ اس میں بعض صاحبوں نے کہا کہ اسلام پر اجتماعی اور انفرادی صورت میں عمل کرنا پاکستان کا مقصد تھا کسی اور صاحب نے کہا کہ اس وطن سے محبت بھی نظریۂ پاکستان میں شامل ہے۔ اور مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کا نقیض قرار دیا گیا۔ اگر میں لاہور کو، پنجاب کو، بلوچستان کو یا مشرقی پاکستان کو پاکستان کا ملجا و ماویٰ قرار دوں کہ اس کا سلامت رہنا ضروری ہے۔ تو پھر واقعی اسلام کی وطنیت میں اور اس قسم کی وطنیت میں، جس کا پاکستان اس وقت ہم سے تقاضا کرتا ہے، فرق ہے۔ دراصل یہ جو خطہ وار قومیت ہے، اس کی عمر اتنی تھوڑی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں اسلام نے اس کو ہمیشہ کے لئے رد کر دیا۔ خود رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں۔ گورے کو کالے پر کوئی تفوق نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ایک مشہور خطبے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہ اس لئے فرمایا کہ قومیت اسلام کی بنیاد کوئی خطۂ ارضی نہیں ہے۔ باوجود اس کے پاکستان کی حفاظت ضروری ہے۔ کہیں نہ کہیں تو اسلام کو اپنے اصولوں پر کار فرما، عمل پیرا ہونے کے لئے جگہ ملنی چاہیئے۔ لیکن اگر ہم اس پاکستان کی خاک کو اس طرح سے گلے لگانا شروع کر دیں، جس طرح یونانیوں نے، اور تاریخ انسانی کی بنیادی حقیقت یہی ہے کہ اس نظریے کی، جو

خطہ وار قومیت قائم کرتا ہے جیسے جرمنی، روس، برطانیہ اور امریکہ اس کی عمر تین ہزار برس سے زیادہ نہیں ہے۔ یونانیوں نے پہلے پہل ٹیریٹوریل نیشنلزم کی بنیاد رکھی اور ان سے اور دوسرے لوگوں سے ہوتے ہوئے بدقسمتی سے ہم تک بھی آپہنچی۔ اسلام ٹیریٹوریل نیشنلزم کا دشمن ہے۔ حاشا وکلا اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ لاہور کی حفاظت کا وقت آئے، اس خاک کے ذرے ذرے کی حفاظت کا وقت آئے تو ہمیں اپنا خون نہیں بہانا چاہیئے۔ اس قسم کی وطنیت جو یونان، روم اور پھر یورپ نے ہم کو دی، وہ اسلام کا مطمع نظر نہیں ہے۔ اور اس لئے گو وطن سے محبت جیسے تیسرے گروہ نے فرمایا، بڑی ہی ضروری ہے۔ لیکن یہ اصل اصول نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے بہت عمدہ بات فرمائی۔ اس کا ذکر ہوا تھا اس لئے میں نام لے رہا ہوں۔ انہوں نے فرمایا تھا۔

کہ NATION کا ترجمہ مسلمانوں کو "قوم" نہیں کرنا چاہیئے "ملت" کرنا چاہیئے۔ اگرچہ قرآن مجید میں اس طرح بار بار آیا ہے لیکن علامہ اقبالؒ کے اس شعر پر غور کیجئے کہ۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

پھر بار بار حضرت علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم!
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

یہ میرے خیال میں وہ نظریہ ہے، جو پاکستان کو قبول ہونا چاہیئے اور جو بنیادی طور پر

اس پاکستان کی بنیادوں میں موجود ہے۔

اگر میں جسارت کروں اور اس قدر مفید اور سیر حاصل بحث کے بعد مختصر طور پر اپنا تصورِ "نظریہ پاکستان" آپ کی خدمت میں پیش کروں تو مجھے یقین ہے، میں کسی گروہ کے کسی فیصلے سے اختلاف نہیں کر رہا۔ میرے نزدیک نظریہ پاکستان کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک آفاقی "یونیورسل" اور دوسری "مقامی"۔ مقامی اس لئے اس میں شامل کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کے بغیر آفاقی اقدار کو اپنے قیام اور فروغ کے لئے کوئی موقع میسر نہیں آتا۔ میں آفاقی اقدار کو سب سے پہلے رکھتا ہوں۔ قانون الٰہی کی بے پناہ اور یا ہمہ قوت کا اعتراف اور اس پر ایمان یعنی کیا تاریخ اور کیا جغرافیہ اور کیا طبیعیات اور کیمیا کے علوم، ان میں سے خدا کو نکالنے کا اختیار پاکستان کے معلم کو نہیں ہے یعنی میں یہ نہیں کہتا کہ آپ تھرموڈائنیمکس کا کوئی LAW آپ پڑھائیں اور کہیں کہ خدا نے یہ فرمایا لیکن یہ نہ کہیئے کہ مادہ بذاتِ خود قادر ہے ان انقلابات اور تحولات کو پیدا کرنے میں جو اس تھرموڈلا یا فورمولا میں بیان ہوتے۔ نیوٹن ہو یا آئن سٹائن ہو، ان قوانین کو ضرور ہم کو پڑھنا چاہیئے۔ مگر یہ احساس پاکستان کے کسی استاد یا شاگرد کے دل میں پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ خدا کی ذات سے پیٹھ پھیر لینے سے بھی علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں پاکستان کے نصاب تعلیم اور کتاب ساز اداروں کے لئے خاص طور پر عرض کر رہا ہوں کہ علوم کی تبلیغ میں کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہیئے، جس سے ذات باری تعالیٰ کی نفی ہوتی ہو۔ مگر اس کے بعد پاکستان کے آفاقی نظریے میں انسانی تعلقات تک ہم پہنچتے ہیں۔ عالمگیر اسلامی اخوت، مساوات اور عدل کی بنیادوں پر پاکستان قائم ہوا۔ اگر ہم صحیح قسم کا عدل اس پاکستان میں ۲۴ برس میں قائم نہیں کر سکے تو ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں اور جھک جانے چاہئیں۔ ایک گروہ نے کہا کہ حکمرانوں کے قول و فعل میں تضاد رہا۔ میں پوچھتا ہوں، ہمارے اپنے عوام کے قول و فعل

میں کتنی موافقت رہی؟ کیا ہمارے دکاندار سچ بولتے رہے؟ کیا ہمارے بڑے بڑے سرمایہ کار اسلام کے اصولوں پر عمل پیرا رہے اور صرف وزیر اعظم اور صدر پاکستان کے جو تھے وہی اسلام کی جڑیں کاٹتے رہے؟ یقین مانئے کہ ہم جیسے ہیں ویسے ہی ہم کو حکمران نصیب ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ پہلے ہمیں اپنی اصلاح کرنی چاہیئے۔ یہ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ جیسی کوئی قوم ہو ویسے ہی حکمران اسے نصیب ہوں گے۔ تو قومی اخلاق کی اصلاح ہم پر فرض ہے اور صرف حکمرانوں کو کوسنے سے ہم اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

پھر یہ چند اور تاریخیں ہیں، جس سے ظاہر ہے کہ مساوات، مساوات تو خیر ایک طریقہ سے آجاتی ہے، مگر قانون الٰہی کی ہمہ گیر، عالمگیر گرفت کا ذکر نہیں ہے۔ اسی گروہ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کا مقصد یہ ہے کہ استحصال پسندوں کے خلاف جنگ کرو۔ استحصال پسندوں کے خلاف ایک دفعہ اٹھارویں صدی میں امریکہ نے جنگ کی، بیسویں صدی میں روس نے جنگ کی۔ اب بھی بہت سی قومیں اس وقت استحصال پسندوں کے خلاف جنگ کر رہی ہیں۔ تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ نظریہ پاکستان کے تمام مقاصد اس قوم نے پورے کر دیئے۔ یقیناً استحصال پسندوں کے خلاف جنگ ہمارے چند مقاصد میں شامل ہے۔ مگر یہ کہنا اور محدود کر دینا پاکستان کی تخلیق کی بنیاد کو اس بات سے کہ استحصال پسندوں سے جنگ کرو تو پاکستان کا مقصد پورا ہو گیا۔ میرے خیال میں بڑے ادب سے یہ اختلاف کر رہا ہوں کہ یہ بات پوری نہیں ہوتی۔ استحصال پسندوں کے خلاف جنگ ضرور ہونی چاہیئے اور فیصلہ کن جنگ ہونی چاہیئے مگر یہ سمجھنا کہ اس جنگ کے بعد مسئلہ حل ہو جائے گا اور پاکستان اپنے عظیم الشان نصب العین تک پہنچ جائے گا، میں سمجھتا ہوں کہ یہ درست نہیں ہو گا۔ پھر میں نے کہا تھا کہ اس تحریک میں پاکستان کے نظریے کی ایک مقامی حیثیت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ملک جس کے حدود ہزاروں میلوں میں پھیلے ہوئے

ہیں، بر عظیم کے مشرق اور مغرب تک اس کی حدود کی حفاظت بھی نظریہ پاکستان کا جزو ہے اور اگر ہم اس وطن عزیز کی خدمت کے لئے کٹ مرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو ہم نظریہ پاکستان کے خلاف عمل کر رہے ہیں۔ یہ علاقے، جو اس آفاقی نظریے کو عملی صورت دینے کے لئے حاصل کئے گئے، جب وہ علاقے قائم نہیں رہتے تو آفاقی حیثیت یعنی قانون الٰہی کی بے لاگی اور ہمہ گیری کا اعتراف، عالمگیر انسانی اخوت کا اعتراف اور انسانی عدل کا قیام اس کے لئے کوئی تجربہ گاہ ہمارے ہاتھ میں نہیں رہتی۔ ہم بڑے ہی کم فہم ہوں گے، اگر ہم سمجھیں گے کہ محض کتاب و سنت پڑھ کر، کلام مجید کو سامنے رکھ کر اور اس زمین کو دشمنوں کے حوالے کر کے زندہ رہ سکتے ہیں اور وہ آفاقی قدریں پھر بھی قائم رہیں گی۔ اس لئے یہ ضروری ہے اور ان اصحاب سے میں متفق ہوں جنہوں نے کہا کہ وطن کا ذکر بھی نظریہ پاکستان میں ہونا چاہیئے۔

اگرچہ جیسے میں نے استحصال پسندی کو شامل رکھا ہے مگر تنہا بنیاد اس کو قرار نہیں دیا، اسی طرح وطنیت محض کو پاکستان کا نظریہ قرار دینا درست نہیں ہے۔ اپنے پرانے شعرا میں سے ایک شاعر کا شعر یاد آگیا ہے کہ

ایمان تو اک نور ہے اور خاکِ وطن خاک
پھر خاک کو دوں نور پہ کس طرح میں تقدیم

آفاقی قدریں زیادہ عزیز رکھیں اور میرے نزدیک آفاقی حیثیت جو پاکستانی نظریے کی ہے وہ ہے جسے ہم اکثر پاکستان کی نظریاتی سرحد کہتے ہیں۔ گورنر صاحب نے کل بہت خوب فرمایا تھا کہ ہمیں اپنی نظریاتی سرحد اور اپنے خطے کی سرحدوں کی حفاظت کرنی ہے۔ تو اس سے میں نے یہی مراد لی کہ پاکستان کے نظریے کی جو آفاقی حیثیت ہے اس کی بھی حفاظت کرنی ہے اور جو مقامی حیثیت ہے اس کی بھی حفاظت کرنی ہے۔

جناب والا! آخر میں مجھے ایک اور بات کے متعلق گزارش کرنا ہے جس پر ابھی بحث ہوئی وہ یہ ہے کہ اس میں تدریج ہو یا انقلاب پر عمل کیا جائے۔ تدریج اگر ۲۴ برس میں پوری نہیں ہوئی، تو معلوم نہیں کب پوری ہوگی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو ملاحظہ فرمایئے۔ جب انہوں نے فرمایا کہ شراب حرام ہے۔ ایک دن شراب حرام ہوگئی، جوا، حرام ہوگیا اور سود حرام ہوگیا تو پھر یہ موقع نہیں دیا گیا کہ میں جو شراب پیتا ہوں، اگلے مہینے چھوڑوں گا، ذرا کم کر دوں۔ شراب اگر حرام ہے تو آج ہی اس کو چھوڑ دینا چاہیئے، بت اگر میری آستین میں ہیں اور مجھے بہت عزیز ہیں تو بت آج توڑنے ہیں۔ اسلام ایک انقلاب ہے اور اس انقلاب میں میرے نزدیک اسلام کے ہوسس نے، رسول اکرمؐ نے کوئی تدریج نہیں کی تھی۔ باقی یہ جو معاشی ناہمواریاں ہیں، ظاہر ہے کہ انسانوں کی پیدا کی ہوئی ہیں اور انسانوں ہی کو اس کا علاج کرنا ہوگا۔ ہمارے اکانومسٹ کہیں کہ اس پر اگر اگلے پنجسالہ منصوبے میں یہ کر دو اور اس سے اگلے میں یہ۔ تو یہ ٹھیک ہے لیکن فیصلے آج انقلابی طور پر ہونے چاہئیں کہ انسان انسان کا ہمسر ہے، کسی کے سامنے اس کی گردن نہیں جھکتی اور بعض چیزیں جو خدا نے حرام کر دی ہیں، وہ آج بھی حرام ہیں، جیسے ۲۴ سال پہلے بھی حرام ہونی چاہئیں تھیں۔ یہاں اساتذہ اور اہل علم اصحاب کا مجمع ہے۔ میں خاص طور پر درخواست یہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ جو کبھی کبھی ہم دو قومی نظریہ ضرور لکھتے ہیں، اس پر اصرار اب کم کیا جائے اور پاکستانی نقطہ نظر کے مثبت پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جائے پھر "آزادی" کی بجائے "تقسیم" کا لفظ استعمال کرنا میرے لئے بڑا افسوسناک ہے۔ ہمیں "استقلال پاکستان" کی تاریخ کا ذکر کرنا ہے "تقسیم" کا نہیں کرنا ہے۔ اب ہندوؤں کو چھوڑ دیا جائے اور اپنے استقلال اور نظریہ حیات پاکستان کی فکر کیجئے۔ اگر میں لکھنؤ سے، لدھیانے سے، مرشدآباد سے آیا ہوتا تو شاید مجھے ایک ذہنی تسکین ہوتی کہ چلو لفظ تقسیم بھی بجا ہے کہ میں تقسیم کا مارا ہوا یہاں پہنچا

ہوں۔ مگر خواتین و حضرات، آپ میں سے اکثر یہیں رہتے ہیں، مشرقی پاکستان والے بھی بہت سے یہیں رہتے ہیں، اب آبادی کی جو کثرت ہے اس کے لئے پاکستان کا بننا "تقسیم" نہیں ہے اور غضب یہ کرتے ہیں کہ بعض لوگ "تقسیم ملک" لکھتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کا ساتھ، حضرت گاندھی کا ساتھ دیتے ہیں کہ گائے کے دو ٹکڑے کئے گئے، ملک کے دو ٹکڑے کئے گئے۔ ہندوستان ہمارا ملک نہیں تھا، برعظیم کی تقسیم اس لئے ہوئی کہ ہم اپنے وطن کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ اس لئے اب "تقسیم" کا لفظ کتابوں میں سے اڑایئے، "استقلال پاکستان" فرمایا کیجئے۔ انگریزی میں کہنا ہو تو INDEPENDENCE کہا کیجئے PARTITION نہ کہا کیجئے۔ اسی طرح TWO-NATION THEORY کی بجائے بہتر ہے کہ پاکستان کے ان پہلوؤں کا ذکر ہو، جو ہمیں زیادہ عزیز ہیں۔ دو قومی نظریہ تو صرف ایک منزل تھی جس سے ہم گزر گئے۔

آخر میں ایک گزارش اور کرنی ہے وہ یہ کہ ۲۰ یا ۲۲ برس پہلے تعلیم نے عارضی سمجھوتوں کی تلاش میں گزارے ہیں۔ اس میں ہم نے معلمین کو ذلیل کیا ہے، متعلمین کو خراب کیا ہے اور ذلیل کیا ہے۔ یعنی یہ غور کیجئے کہ تعلیم کی نجات کبھی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نویں، دسویں، گیارھویں اور بارھویں جماعت کے امتحان الگ الگ کر دیں گے سال بسال تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ نیوٹن اور آئن سٹائن ہم میں پیدا ہوں گے۔ یہ نہیں ہوتا اور ایسے اقدامات انتظامی دقتوں کی وجہ سے چھوڑنے پڑتے ہیں۔ پھر کبھی ہم یہ کہتے ہیں کہ دسویں کو گیارھویں کر دو، اور اگر بی۔ اے کی جماعت کو تین برس یا چار برس کا کر دیا ایم۔ اے کو آنرز کے ساتھ ٹانک دو تو اس سے تعلیم کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ یہ بڑی گڑیا اپنے نفس کو دھوکا دینے والی چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ یہ کوئی انقلاب ہے تعلیم کو ویسے ہی انقلاب کی ضرورت ہے، جیسے ہماری معیشت کو انقلاب

کی اس وقت ضرورت ہے اور حقیقت میں انقلاب نہ آیا تو یقین رکھیے کہ تعلیم میں انقلاب نہیں آئے گا۔ کوئی طالب علم دو استادوں کا جو بالکل متضاد نظریہ رکھتے ہوں، شاگرد نہیں رہ سکتا وہ یہ نہیں کر سکتا کہ دینیات کے استاد سے تو یہ پڑھے۔

واقیموا الوزن بالقسط

یا کچھ اور ایسی چیز پڑھے لیکن جب وہ دکاندار کے پاس جائے تو کچھ اور طرزِ عمل دیکھے۔ افسر کے پاس نوکری کرنے کے بعد جائے تو اسے ایک اور فرعون پائے۔ یہ تمام باتیں اس معاشرے کو بدلنی ہوں گی کیونکہ انسان ان باتوں سے بھی سیکھتا ہے، اپنی سوسائٹی سے بھی سبق لیتا ہے۔ محض گھنٹی بجنے پر جس استاد کے کلاس روم میں جاتا ہے، اسی سے نہیں سیکھتا۔ اس معاشرے کو بہتر بنائیے تاکہ ہمیں بہتر طالب علم نصیب ہوں۔

خواتین و حضرات: میں بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے ان متفرق خیالات کو جو کم از کم دردِ دل پر ضرور مبنی تھے، . . . . . . توجہ سے سُنا۔

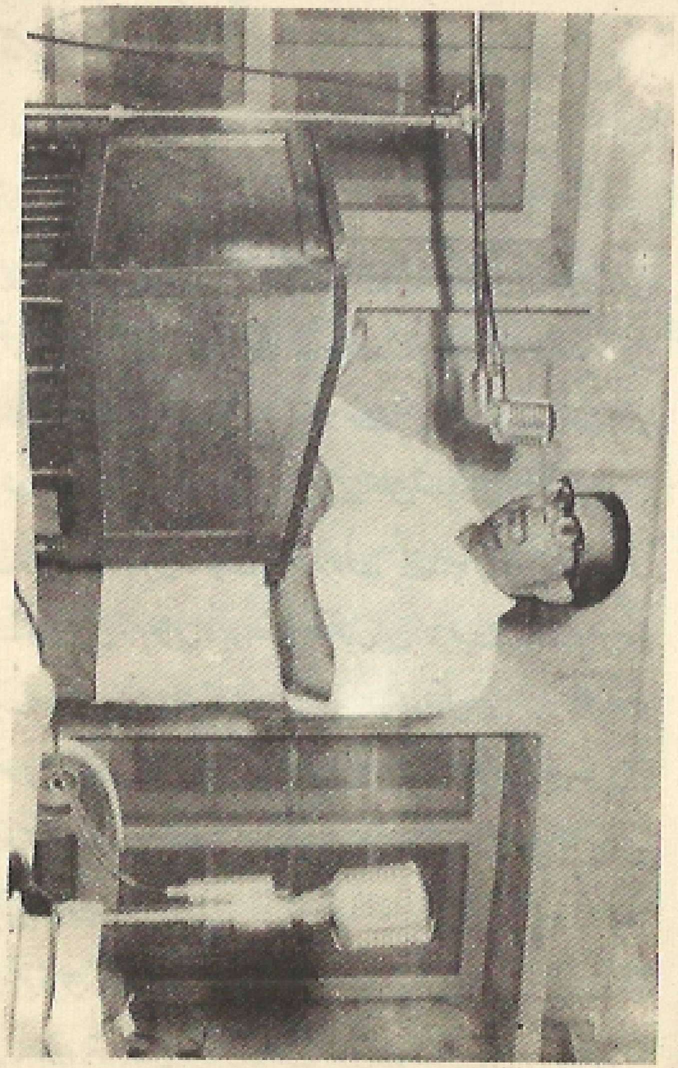

سید محمد قاسم رضوی تقریر کر رہے ہیں۔

نظریۂ پاکستان کو تقویت دینے والے عوامل

سیّد محمد قاسم رضوی

صدرِ گرامی قدر، خواتین و حضرات

کسی بھی بامقصد لائحہ عمل کے عوامل کو سمجھنے کے لئے یہ بات غالباً ضروری ہے کہ ان محرکات پر بھی غور کیا جائے، جن کے نتیجے کے طور پر وہ مقصد پیدا ہوا۔ وہ عوامل جو نظریۂ پاکستان کے مطابق ہمارے لائحہ عمل کو متعین کرنے میں مدد ہو سکتے ہیں، ان کا مطالعہ غالباً اس پس منظر میں ضروری ہے، جس میں مطالبۂ پاکستان کے متعلق نظریات کی تخلیق ہوئی۔ یہ داستان بہت طویل ہوگی کہ تاریخی لحاظ سے وہ کیا محرکات تھے، جنہوں نے ایک خطۂ ارض میں ایک بہت پھیلی ہوئی قوم کو جس کا کچھ حصہ کچھ علاقوں میں اکثریت میں تھا مگر جس کا اتنا ہی بڑا ایک حصہ بہت بڑے علاقے میں منتشر تھا۔ اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ وہ اپنی آزادی کے حصول کی تحریک میں اپنے لیے کچھ ایسے نظریات مختص کرے جو نہ صرف قوم کا عارضی بلکہ مستقل سلسلۂ جہد متعین کرنے والے ہوں۔ اس مختصر صحبت میں میں صرف آپ کو چند باتیں یاد دلانا چاہتا ہوں۔

وہ بات جو تواتر سے کہی جاتی ہے غالباً سب سے غیر اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک ہمسایہ قوم کے ساتھ روزانہ زندگی میں بار بار اپنے حقوق کے تحفظ سے مایوس ہو کر مسلمانوں میں ایک سیاسی، ایک قسم کا سماجی اور بہت حد تک اقتصادی ردعمل اس بات کا محرک ہوا کہ مسلمان برصغیر میں اپنا ایک علیحدہ وطن مانگیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہندوستان کے

مسلمانوں میں اپنی مسلسل محرومیت کا احساس اور اپنے مستقبل کی بہتری کے لیے خواہش اس لیے شدت اختیار کر گئی کہ انہیں ہمسایہ قوم سے مسلسل اور متواتر غیر منصفانہ سلوک ملتا تھا اور یہ ردعمل قوم کے فوری اتحاد اور وسیع ہم خیالی کا باعث ہوا۔ لیکن صرف یہی ہنگامی احساس مطالبۂ پاکستان کا بنیادی محرک نہیں ہے۔ ویسے بھی اس قسم کی محرومی بذات خود اتنی اہم بات نہیں ہے کہ ایک قوم کو آزادی کے حصول کے بعد بھی مستقلاً مقصد طور پر مجتمع اور زندہ و پائندہ رکھ سکے۔ درحقیقت اس جذبے سے بہت برتر اور گہرے کچھ اور محرکات بھی تھے جنہیں ہم نے نہ صرف لوگوں کے سامنے پیش نہ کیا بلکہ جن کے متعلق رفتہ رفتہ بین الاقوامی سیاست کے تقاضوں میں الجھ کر ایک سرد مہری پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

بین الاقوامی سیاسی شعور کی تاریخ میں کچھ ایسے پڑھے جا سکنے والے خطوط بھی ہیں، جن سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ شعوری طور پر کچھ سیاسی تحریکوں نے عامتہ الناس کے لئے عالمی طور پر لائحہ ہائے عمل تجویز کرنا چاہا ہے۔ انیسویں صدی اور اس سے پہلے دو ایسی وسیع سیاسی تحریکیں خاص طور پر سامنے آتی ہیں، جن کے خفیہ مقاصد کے پیچھے دولت اور اقتدار کا ہاتھ تھا۔ پہلی صیہونیت کی تحریک ہے، جس کے مطابق یہودیوں نے بڑے غور و خوض کے بعد اپنی قوم کے لئے ایک لائحہ عمل تجویز کیا۔ پیرس پروٹوکول میں جسے آجکل خاص طور پر ابلاغِ عامہ سے چھپایا جاتا ہے، یہ بات طے کی گئی کہ "یہودی جو بہت بڑے ماضی کے مالک ہیں اور اس سے عظیم تر مستقبل کے مستحق ہیں تو انہیں بین الاقوامی طور پر کیا رویہ اپنانا چاہیے کہ ان کے نسلی مقاصد حل ہو سکیں۔ مختصراً انہوں نے فیصلہ یہ کیا کہ انہیں سیاسی اقتدار کے لیے مدینے سے لے کر بحیرۂ روم تک کا علاقہ اپنی قوم کے منبع و ماخذ

کے طور پر دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ان کے ہاں تبدیلیٔ مذہب سے کوئی شخص یہودی نہیں ہوتا اور یہودی مذہب نسلی مذہب بن کر رہ گیا ہے، لہٰذا ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ دنیا کی مخلوق پر لوگوں کو یہودی بنا کر نہیں، بلکہ کسی اور طریقے سے اقتدار حاصل کریں۔ سب سے اہم وسیلہ جو ان کے پاس اس کام کے لئے موجود تھا وہ دولت تھی۔ انہوں نے اندازہ کیا کہ دنیا میں دولت اور کچھ فنون کی رہبری جیسے موسیقی اور آرٹ ان کے پاس موجود ہے۔ یہ طے کیا گیا کہ ان ذرائع کے استعمال سے صیہونیت کے منصوبے کی تکمیل ہونا چاہیے۔ اسی زمانے میں انہوں نے طے کیا کہ دولت کے استعمال سے بینکنگ، انشورنس، بحری تجارت اور ابلاغ عامہ قسم کے شعبوں پر انہیں کُلی قابو میسر کرنا چاہیے۔ نتیجتاً بین الاقوامی یہودی تحریک کے مطابق جو کہ مذہبی نہیں بلکہ صیہونیت کی سیاسی تحریک تھی۔ رفتہ رفتہ بینکنگ میں، انشورنس میں، بحری تجارت میں اور بالخصوص ابلاغ عامہ کے اداروں میں ان کا عمل دخل بڑھتا چلا گیا۔

آج حالت یہ ہے کہ بین الاقوامی اعداد و شمار کا اندازہ کریں تو اخبارات میں اسّی (۸۰) فیصدی، بینکنگ میں پچاس (۵۰) فیصدی سے زائد، انشورنس میں اس سے بھی زائد ملکیت یہودیوں کی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ امریکن یہودی ہوں یورپ کے ہوں یا ایشیا کے۔ اس اقتدار کا یہ عالم پہلی جنگ کے بعد دنیا کو معلوم ہوا کہ جنگ جرمنی، برطانیہ اور امریکہ وغیرہ کی ہی نہیں تھی بلکہ اس جنگ کے عوامل میں یہودی دولت اور یہودی مفادات کا بہت بڑا حصہ تھا۔ کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ایک تحریک بین الاقوامی صیہونیت کے نام پر موجود رہی ہے۔ اس کے لائحہ عمل کے مطابق دو عالمی منصوبے بروئے کار ہیں۔ اوّلاً ایک آزاد مملکت کا قیام۔ جو مدینے سے بحیرۂ روم تک ہو۔ یہودی اقتدار اور

تسلّط کا مرکز ہو اور ثانیاً دوسرے باقی تمام ممالک میں وہ حکمت عملی جس کی بنا پر یہودیوں کے اکثریت میں نہ ہونے کے باوجود اور ان کی حکومت میں شرکت کی امید نہ ہونے کے باوجود وہ ان ذرائع پر قابض ہوں جو حکومتوں کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس قسم کی ایک دوسری تحریک پچھلی صدی کی عیسائیت کی سیاسی تحریک تھی۔ یہ تحریک بھی محض نظریاتی یا مذہبی تحریک نہ تھی۔ عیسائی رہنماؤں نے جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ دنیا میں ایک آزاد سرمایہ کارانہ نظام سے ہی ترقی ہو سکتی ہے اور ان کے مفادات محفوظ ہو سکتے ہیں، اس بات پر بالخصوص غور کیا کہ دنیا کے خطوں کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اوّل وہ حصے جو ابتدائی اور بنیادی پیداوار کے متعلق ہوں خام مال پیدا کریں اور دوم وہ حصے جو خام پیداوار کو استعمال کی چیزوں میں منتقل کریں۔ اس تقسیم کے لیے طے یہ ہوا کہ ایشیا اور افریقہ کا بڑا حصہ محض وہ اجناس پیدا کیا کرے جو برآمد کے بعد مغربی ممالک کو پہنچیں وہاں ان پر مشینی عمل سے اشیا کی تخلیق ہو۔ مغرب کے باشندے اس عمل سے زیادہ منافع کما کر بہتر معیار زندگی قائم رکھیں اور اپنی ضروریات سے فاضل اشیا کئی گنا دام پر واپس مغلوب خطوں کو بھیج دیں۔ اس FREE ENTERPRISE CAPITALISTIC SYSTEM کے قیام کے راستے میں انہیں چند کانٹے نظر آئیں زیادہ ہے کہ میں انیسویں صدی سے پہلے اور انیسویں صدی کا ذکر کر رہا ہوں جب اشتراکیت کا بول بالا نہ ہوا تھا، معلوم ہوا کہ اسلام کا نظریۂ حیات اس رستے میں حائل تھا ان کے ہاں جو نظریات جہاد، تقویٰ، پرہیزگاری اور جو سماجی، اقتصادی اسلامی سلوک کے احکام تھے وہ مغرب کے اس منصوبے کی راہ میں حائل تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی سیاسی، اقتصادی، سماجی، ثقافتی اور دوسری تنظیموں کے ذریعے وہ حالات پیدا کیے کہ

آج جو خطۂ اسلام ہے، وہ غالب ہونے کی جگہ مغلوب ہے۔ اگر وہ براہ راست طاقت کی وجہ سے مغلوب نہیں ہے تو خیالات سے مغلوب ہے۔ خیالات سے مغلوب نہیں ہے، تو اقتصادی طور پر مغلوب ہے۔ مغرب کی مسلسل کوشش ہے کہ یہ علاقہ انسانی جدوجہد میں ان کے برابر نہ آنے پائے۔

ان تحاریک کا مطالعہ اور تجزیہ اس زمانے میں مسلمان مفکرین کو بھی میسر ہوا۔ ان میں شاہ ولی اللہؒ اور جمال الدین افغانی کا نام نمایاں ہے۔ مختلف علاقوں کے مسلمان رہنماؤں کو اس کا اندازہ تھا لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ ان رہنماؤں اور ان سے رہنمائی کا حق رکھنے والوں میں کوئی مضبوط ذریعۂ ابلاغ نہ تھا۔ افہام و تفہیم کے راستے نہ تھے۔ چھوٹے سے مکتب میں، محمول سے کمرے میں، اپنے حلقے میں تو آدمی اس بات کا اظہار کر سکتا تھا لیکن تبلیغی طور پر "عامۃ الناس" میں ایک ایک فرد تک یہ خیالات نہیں پہنچائے جا سکتے تھے کہ ہمیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے پہلے اور کسی علاقے کے شہری ہونے کی حیثیت سے دوسرے خطرہ کا مقابلہ کرنا ہے۔ ملت کو خطرہ تھا سیلاب فکر سے اور علاقوں کو خطرہ تھا غیر ملکی تسلط سے۔ مسلمان مفکرین میں رفتہ رفتہ یہ خیال پختہ ہونا شروع ہوا کہ مسلمانوں کو بھی ایک ملت کی حیثیت سے ایک بین الاقوامی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے، جس میں نہ صرف ان کی علاقائی قومی ضرورتیں پوری ہوں بلکہ وہ پُرمقصد طور پر دنیا میں ایک ملت کی طرح زندہ رہ سکیں۔ ایسی ملت جس کا اپنا ابدی نظریہ موجود ہے، جس کے اپنے غیر متبدل بنیادی تصورات ہیں، جس کے اپنے مقاصد ہیں۔

جب یہ محسوس ہوا کہ ہندوستان میں بھی آزادی کا دور آنے والا ہے تو یہاں کے مسلمان مفکرین کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر آزادی ہمیں ایک مشترکہ برصغیر کے ساتھ ملتی ہے تو ہم ان

مضمرات کی جو اسلام کے خلاف ہیں اور جو اس خطۂ ارضی کے انسانوں کے مفاد کے خلاف ہیں پورے طور پر مدافعت نہیں کر سکیں گے۔ اس کی مدافعت کے لیے ضروری ہے کہ حکومت میں ہماری آواز ہو اور مؤثر آواز کی صورت صرف ایک ہی ہے کہ اپنے اکثریتی خطوں میں ہم حاکم ہوں، ہم اپنے ملّی پروگرام پر عمل کر سکیں اور اس بین الاقوامی اسلامی وحدت کے ساتھ مل سکیں، جو ایک ملت ہونے کے باعث اور چھوٹی چھوٹی قوموں میں منقسم ہونے کے باوجود، بین الاقوامی طور پر ایک منصوبہ قائم رکھ سکتی ہے۔

یہ امر افسوس کا باعث ہے کہ یہ عزم اس زمانے میں پوری طرح منظر عام پر نہ آیا۔ دراصل عامۃ الناس تک آزادی کی اس بہت مختصر اور بڑی جلدی سے طے شدہ لڑائی میں ایک ایک فرد تک قومی حکمت عمل پہنچ نہ سکی۔ مگر افسوس یہ ہے کہ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد بھی یہ معاملہ مفکرین کے زیر توجہ رہا، عوام تک نہ پہنچا۔ آزادی سے پہلے عوام کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے بہت مختصر وقت میں "فارمولا نعروں" کے ذریعہ اور جذباتی اتحاد کے نام پر، ان کی فوری تائید حاصل کر لی گئی۔ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد یہ فکری سوتے رفتہ رفتہ بالکل ہی خشک ہو گئے۔ ان کی بجائے ایک نئی حاصل شدہ مملکت کے مسائل میں ہم میں کچھ حقیقی تھے اور کچھ مفروضہ، تمام کی تمام قوم اور اس کے رہبر ملوث ہو کر رہ گئے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آج تک واضح طور پر یہ لائحۂ عمل ہمارے سامنے نہیں آیا کہ ہم بحیثیت ایک آزاد قوم کے اپنے مقاصد اور لائحۂ عمل صرف اپنے علاقے ہی کے متعلق نہیں رکھتے بلکہ ایک بڑی ملت کا جزو ہونے کی حیثیت سے ہمیں اس ملت کے مقاصد کی تزئین کرنا ہے اس سعی میں شامل ہونا ہے جو ہمارے میثاق کا مطالبہ ہے۔ ان نقشوں کو درست کرنا ہے جنہیں ہم بگاڑ بیٹھے ہیں۔ مختصراً یہ کہ خلافۃ اللہ

فی الارض قائم کرنے کا سامان وانصرام کرتا ہے۔

محرکاتِ پاکستان میں یہ بین الاقوامیت، یہ مسلمانوں کا ملّی لائحہ عمل ایک بہت بڑا حصہ رکھتے تھے۔ یہ کیفیت رفتہ رفتہ سیاسی طور پر مایوس ہونے کی وجہ سے اور ہم چشم اسلامی ممالک میں عدم قبول اور عدم اشتراک کی بنا پر کمزور پڑنے لگی۔ مغربی نظریۂ ریاست، روزمرہ کی سیاسی ضرورت اور بین الاقوامی برادری میں ملکی تحفظ، دنیاوی ترقی، معاشی استحکام کے مطالبات نے ہمیں بھی ایک لادینی نظام میں ملوث کر دیا۔ یہی حال ان دوسری آزاد مملکتوں کا بھی تھا جن میں نسلی، لسانی اور جغرافیائی بتوں کے نام پر قومی ضروریات ابھرنا شروع ہوئیں۔ کسی کو جنگ کا خطرہ، کسی کو اقتصادی مخالفت کا سامنا، کسی کو اپنی اقتصادیات کے گر جانے یا فوراً گر پڑنے کی فکر۔ اس ماحول میں یہ ملّی نظریۂ فکر کمزور ہونے کے بعد اس کی جگہ قومی ضروریات نے لے لی اور فکری توجہ قومیت کی آرائشِ ناتمام میں مصروف ہو گئی۔

ملّی نظریے کے غائب ہو جانے کے بعد یا کم سے کم اس پر توجہ نہ ہونے کے بعد جو قومی نظریہ سامنے آیا، وہ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایک یومیہ نظریاتی تھا۔ آئے دن کی مصیبت، آئے دن کا علاج۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ قومی لحاظ سے بھی کوئی طویل المیعاد لائحہ عمل اور کوئی ایسا عمل منصوبہ جس کے مقابلے میں ہم اپنے روزانہ حصول کا مطالعہ کر سکیں، سامنے نہیں آ سکا۔

اس مختصر تجزیے کے بعد آج کے عنوان کے متعلق ایک بالکل مختصر جواب یہ ہے کہ جائز طور پر جو لائحہ عمل آپ اپنے لیے تجویز کر سکتے ہیں اور جو عوامل آپ اپنے مقاصد کو پُر مقصد بنانے کے لئے بروئے کار لائیں، ان کا تعلق یقیناً ان محرکات سے ہونا چاہیے جن کی بنا پر آپ نے آزادی کا مطالبہ کیا تھا اور جن کے باعث ایک آزاد مملکت کا قیام ممکن ہوا۔ ہمیں ایک محدود قومی نظریے سے نکل کر ایک وسیع ترملّی تفکر، ایک وسیع تر ملّی حکمتِ عمل کے ساتھ

وابستہ ہونا ہوگا۔ آپ خواہ کتنا ہی احتجاج کیوں نہ کریں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس ملّت کے اہم جز ہیں، اس میں اہم ترین قدرِ مشترک یہ ہے کہ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایک سلسلۂ مواصلت ہے، خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ وہ معاہدہ اس دن سے ہے، جب اللہ نے آدمی کی خلقت کے بعد، اسے خلیفۃ اللہ فی الارض بنا کر بھیجا تھا اور اس معاہدے کی آخری ہدایت ہمیں اسلام کے ذریعہ ملی ہے۔ اس میثاق کے مطابق مسلمان اللہ کے بندوں کی ایک مسلسل اور متحدہ ملّت ہیں۔ کسی دوسرے علاقے میں ہونے کی وجہ سے اس علاقے کے لوگ ملت کے دوسرے جز کے مخالف نہیں ہو سکتے۔ انہیں اپنے مفاد کی قربانی دے کر بھی ملت کے مقاصد کو آگے لے جانا ہے۔

اس مقام پر آپ کو مجبوراً واپس جانا پڑتا ہے اس منبع کی جانب، جس سے کہ نہ صرف ہماری تحریک نے جنم لیا بلکہ ہماری تمام مخلص آرزوئیں اور خواہشیں جنم لیتی ہیں لیکن جس پر ہمارا کوتاہ عمل ہمیں چلنے سے روکتا ہے خود قائدِ اعظمؒ کے الفاظ میں جو اس سیمینار ہی کے بروشر پہ منعکس ہیں، "ہم مسلمان اپنی تابندہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ایک ملت ہیں"۔ ہم محض ایک خطے کی وجہ سے یا محض حادثۂ پیدائش کی وجہ سے ایک قوم نہیں ہیں۔ زبان و ادب، فنونِ لطیفہ، فنِ تعمیر، نام و نسب، رسم و رواج، تاریخ و روایت، ہر معاملہ پر ہمارا ایک انفرادی قومی یعنی ملّی اصولی نظریہ ہے۔ یہ معاملات و محاکمات کسی مقام پر خواہ کسی رنگ یا روپ میں ہوں، ان کے پیچھے جو شعورِ اقدار، جو قانون اور ضابطۂ اخلاق، جو رجحانات اور مقاصد کارفرما ہیں وہ ہمارے ملّی فلسفۂ حیات سے مشتق ہیں، جغرافیائی حادثات سے نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تصور اور تیقن کی موجودگی میں ہم اب تک کوئی ٹھوس کام ان عوامل کی تہذیب

ترویج کے لئے کیوں نہ کرسکے؟ کسی دور میں جب کوئی قوم کسی دوسری قوم سے مغلوب ہو جائے تو اس کے کچھ منفی تاثرات ہوتے ہیں اور بہت سے ردعمل اور تاثرات کے علاوہ دو بڑے تاثر ایک مغلوب قوم میں مطالعہ کیے جا سکتے ہیں۔

غالب قوم کے غلبے سے مغلوبیت کا تاثر تو بالکل ہی واضح بات ہے۔ یہ مغلوبیت کا تاثر کچھ حسرتیں پیدا کرتا ہے کچھ نفرتیں پیدا کرتا ہے، غالب قوم کے ناحق غلبہ کی مخالفت کرتا ہے، اپنے حق آزادی کی موافقت کرتا ہے، غالب قوم کے حاکم افراد کے غیر منصفانہ رویئے پر احتجاج پیدا کرتا ہے۔ یہ احتجاج ہوتے ہوتے کسی زمانے میں قوت کا مظاہرہ ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ غالب قوم کو جو مغلوب قوم کے ساتھ مدغم نہیں ہو سکتی اور اسے اپنا ساتھی نہیں بنا سکتی، اس میں جذب نہیں ہو سکتی یا اسے جذب نہیں کر سکتی، مجبوراً مغلوب قوم کا علاقہ چھوڑ دینا پڑتا ہے۔

اس دورانِ غلامی میں جہاں مغلوبیت کے ردعمل سے ہم نفرت کر رہے ہوتے ہیں ایک تاثر اور بھی ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے، جو زیادہ قابل غور ہے۔ وہ یہ ہے کہ بہر حال غالب قوم تمام وسائل کی مختار ہوتی ہے، غالب قوم کے افراد مغلوب قوم سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں، بڑے بڑے کام کرتے ہیں، ان کی کرسیاں بھی بڑی ہوتی ہیں، ان کے رنگ بھی زیادہ صاف نظر آتے ہیں، ان کے کپڑے خوبصورت لگتے ہیں، ان کے مشاغل، ان کی زبان، ان کا فلسفہ، ان کا ادب اور شاعری، ان کی تخلیقات اور ایجادات، ان کا رہن سہن اور عادات، ان کے اصول غرضیکہ ان کی ہر ادا، آن اور نخرہ مغلوب قوم کے افراد پر ایک مسلسل مرعوبیت قائم رکھتے ہیں۔ لہٰذا مغلوب قوم کا دوسرا تاثر غالب قوم کے کلچر سے مرعوبیت کا تاثر ہے۔ جونہی غالب قوم کا غلبہ ختم ہو جاتا ہے

تو مغلوبیت سے پیدا شدہ نفرت رفتہ رفتہ معدوم ہو جاتی ہے۔ چونکہ غالب قوم کے افراد طاقت کا ذرہ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہمارے سامنے موجود نہیں ہوتے لہٰذا ہم ان کے غلبے کو تصرف و تسلط کو بھول جاتے ہیں۔ البتہ وہ تاثرات جو جذبہ مرعوبیت سے یعنی انہیں دیکھ دیکھ کر حسرت کے طور پر پیدا ہوتا تھا، وہ ابھرنا شروع ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ غالب قوم کے چلے جانے کے بعد اس کا ثقافتی ورثہ پہلے سے زیادہ دندناتے ہوئے انداز میں "آزاد مغلوب" قوم پر حاوی ہوتا ہے۔ آپ کسی بھی نو آزاد مملکت کو دیکھ لیجئے گا، وہاں پہلے سے زیادہ فرنچ، ولندیزی اور انگریز تہذیب کا فروغ پائیے گا۔ آپ مشرقی اور مغربی پاکستان کے احوال کو دیکھ لیجئے مسئلہ زیادہ واضح ہو جائے گا۔

غیر ملکی حکومت کے زمانے میں ان دونوں علاقوں میں حاکم قوم اور محکوم عوام کے درمیان ایک دوسرے سے مختلف نوعیت کے رشتے قائم تھے۔ بنگال میں ابتداء سے ہی حکمرانوں نے مقامی واسطوں سے انصرام و انتظام کے اداروں کو استوار کیا۔ سب سے اہم شعبہ حکومت زمین اور مالیہ کا انتظام تھا۔ مستقل بندوبست کے نیلام میں مشرقی پاکستان کی اسی فیصد سے زائد زمینیں ہندو زمینداروں کے تسلط میں چلی گئیں۔ تمام کسان اور کاشتکار ہی نہیں بلکہ چھوٹے مالک ان کے ماتحت رعایا کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ تسلط زندگی کے ہر شعبے پر طاری ہو گیا۔ زمیندار فی الواقعہ حاکم کی حیثیت سے عامۃ الناس پر مسلط ہو گئے، رفتہ رفتہ ملازمتوں، تعلیم، صنعت، تجارت اور وکالت، ڈاکٹری اور دوسرے پیشوں میں ہندو اس طرح چھا گئے کہ مشرقی پاکستان کے کسی مسلمان کا نام ان فہرستوں میں ڈھونڈے نہ ملتا تھا۔ ہنرمند اور قابل مسلمان کسب معاش کے لئے کلکتہ جانے پر مجبور تھے۔ غرضیکہ مشرقی پاکستان کے علاقوں کے لئے غالب یا غلبہ یافتہ ثقافت یا سماج یا قوم براہ راست انگریز نہیں تھے

بلکہ ہندو تھے۔ جذبۂ مغلوبیت اور ثقافت سے مرعوبیت اس قوم سے تھی۔ انگریزی ثقافت کا اثر کلکتہ جیسے بڑے شہروں سے باہر ناپید تھا۔

دوسری طرف مغربی پاکستان کے علاقوں میں نظم اراضی و مالیہ مختلف تھا۔ بہت سے متوسط مالکان اور بڑے بڑے خود ساختہ تعلقداروں کی غیر موجودگی میں انتظامیہ کے کاروبار کا براہ راست عمل دخل تھا۔ کچھ جاگیردار، ذیلدار قسم کے غیر اختیار یافتہ افراد کے ذریعے استحکام حکومت کا کام بیشک لیا جاتا تھا لیکن غالب ثقافت انگریزی اپنی تھی۔ اس کے کلچر کا عکس براہ راست تھا۔

آزادی کے بعد انگریز کا سیاسی غلبہ مغربی پاکستان سے اور ہندو کا سیاسی غلبہ مشرقی پاکستان سے دور ہوا۔ رفتہ رفتہ مغلوبیت سے پیدا شدہ نفرت، علیحدگی، عدم تعاون، مخالفت کم ہوتی چلی گئی مگر اپنی ثقافتی وراثت پر عدم توجہی جاری رہی۔ سابق غالب قوم کے کلچر کے خلاف مدافعت کمزور ہوئی اور اس کی قدریں، انداز، سلیقے اور طور طریقے اپنائے جانے لگے۔ یہاں ہم پہلے سے زیادہ مغربیت زدہ ہوگئے اور وہاں وہ غلامی کے دور سے زیادہ ہندویت اور برہمنیت زدہ گہرے اور دقیق معاملات کو چھوڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے نشانات کیطرف توجہ کی دعوت دیتا ہوں۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندو خواتین کے ماتھے پر بندی ان کی ذات اور انفرادی حیثیت (کنواری۔ شادی شدہ۔ بیوہ) وغیرہ ظاہر کرنے کے لئے لگا کرتی تھی، وہ اب مسلمان بچیوں اور عورتوں کے لئے زیبائش اور سنگھار کی چیز ہے۔ وہ مذہبی تہوار جو ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کے نام پر مناتے تھے، آج موسمی تہوار بنا کر اس سے زیادہ شان و شوکت سے منائے جاتے ہیں۔ نام، جو ہندو اور مسلمان میں تخصیص رکھتے تھے، ان میں بھی تبدیلی در آئی اور خالص ہندو نام بھی مسلمان ناموں کا حصہ بننے لگے۔ پچھلے دس

سال میں بے شمار بچے اور بچیاں، ہندو دیو مالا کے مشہور کرداروں کے نام سے موسوم ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ان ناموں میں کوئی خوبی ہے محض اسلئے کہ مکمل مرعوبیت کا اثر ایسے اظہار پر آمادہ کرتا ہے۔ پھر زبان میں انتہائی کثیف تبدیلی آگئی بلکہ وہ تمام عوامل، وہ مائتھولوجی، وہ محاورے، جو کہ ہندو مذہب، فلسفہ، دیو مالا اور کلچر سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، رفتہ رفتہ زبان کے اظہار کا ذریعہ بن گئے۔ وہ گائیکی، وہ رسم و رواج، وہ اظہار اور قبول اور وہ تمام چیزیں جو کسی زمانے میں غالب قوم یعنی ہندوؤں کی ہونے کی وجہ سے اپنائی نہیں جاتی تھیں، اب انہیں اپنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔

ساتھ ہی اس طرف بھی توجہ کیجئے کہ بالکل اسی قسم کی حالت آپ کے مغربی پاکستان میں ہے کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد یہاں زیادہ انگریزی بولنے والے، زیادہ مغربی کپڑے پہننے والے، زیادہ انگریزی تصور و تخیل سے متاثر ہونے والے، زیادہ بہتر انگریزی لکھنے اور مسلسل انگریزی سوچنے، پڑھنے والے لوگ پہلے سے زیادہ پیدا ہو رہے ہیں اور اب مغربیت کا، مغربی تہذیب کا زیادہ تسلط ہے اور یہ بات اس لئے نہیں ہے کہ یہ چیزیں بذات خود اعلیٰ اور ارفع ہیں۔ کہنے تو ہم یہ اٹھے تھے کہ ہماری زبان مختلف، ادب مختلف، فنون لطیفہ مختلف، فن تعمیر مختلف، نام و نسب مختلف، شعور و اقدار مختلف، قوانین و اخلاق مختلف، رسم و رواج مختلف۔ پسندیں اور صفتیں مختلف ہیں اور ہمارے لئے اوروں کے تصورات سے مفید تر ہیں لیکن اگر آپ غور کریں تو ہم مغرب کے ساتھ اس اختلاف کو کتنی خوبی سے صبح و شام مٹا رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر مرعوبیت کے اس جذبے نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا ہے تو انصاف کا تقاضہ ہے کہ ہم کھڑے ہو کر اعلان کریں کہ صاحب وہ سب باتیں غلط تھیں۔

ہماری زبان وادب اور فنونِ لطیفہ اور ہمارا یہ اور ہمارا وہ یہ سب کمزور تھے۔ کسی زمانے میں ان سے کام چل چکا، اب یہ حقیر ہو گئے ہیں۔ یہ زمانۂ حال کی ضروریات کو پورا نہیں کرتے، یہ مستقبل کی روشنی کے ستون نہیں ہیں۔ یہ تو ماضی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ ہیں۔ اس اقبال اور اعتراف کے بعد نہ آپ کو نظریۂ پاکستان کی ضرورت پڑتی ہے، نہ کسی اور ملی نظریے کی ضرورت ہے۔ آپ ایک آزاد مملکت ہیں، جس کی کچھ جغرافیائی حدود ہیں۔ کچھ استحکام کے مطالبے ہیں، کچھ اقتصادی مسائل ہیں۔ اور وہ مسائل اب مختلف اقتصادی نظریات کے ذریعے حل کرنے کی کوشش ہوگی۔ کبھی مسائل بین الاقوامی مصالحتوں سے طے ہوں گے اور کبھی مصلحتوں سے۔ کہیں امداد لینی پڑے گی، کہیں آزادیٔ عمل کی قربانی دینی پڑے گی۔ غرضیکہ جس طرح اور آزاد قومیں مادی زندگی گزارتی ہیں، ہم بھی اپنی زندگی گزار لیں گے۔

اس میں رفتہ رفتہ ہمیں اس بات کا احساس ہو سکتا ہے کہ ایک عظیم آزاد ملک کا حصہ ہونا ایک آزاد مملکت کے لئے بہتر ہے۔ تو رفتہ رفتہ ہم یہ سوچیں گے کہ پڑوسیوں میں کون زیادہ بڑا ہے، کس کے ساتھ مدغم ہونے میں ہم لوگوں کا کم نقصان ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ جس زمانے میں آپ "یہ" ہوں گے اس زمانے میں وہ اختلافات اور وہ مخالفتیں بھی کم ہوئی ہوں گی، جو آج کل فوری طور پر آپ کے سامنے ہیں۔ اس مآل کے بعد صرف یہ رہ جاتا ہے کہ آپ یہ سوچیں کہ دنیاوی بہتری کی کون سی سب سے اچھی باتیں ہیں، عام تعلیم کا مرحلہ کس طرح سر کیا جائے، کس طرح عمارات تشکیل کی جائیں، کہاں پل ہونے چاہئیں، کہاں چاہ و تالاب ہونے چاہئیں۔ اس کش مکش میں آپ کے وسائل کبھی کم ہوں گے کبھی کافی۔ کم ہوں تو بھیک مانگ لیا کیجئے، کافی ہوں تو انہیں ان پر خرچ کر لیا کیجئے۔ کسی مقصد یا نظریے کی ضرورت نہ ہوگی لیکن اگر یہ بات غلط ہے اور ہم

نے کسی عظیم تر مقصد کے لئے قربانی دینی چاہی تھی تو ہمیں یقیناً اپنی تدریس میں، اپنی تعلیم میں، تربیت اور اپنی تہذیب میں، اپنے معاشرے میں وہ بات پیدا کرنی ہوگی کہ ہم تلاش کر سکیں کہ ہماری خصوصی روایات کیا تھیں، جن کے نام پر ہم نے آزادی حاصل کی اور ان کو ترقی و ترویج دینے کے لئے اور اس زمانے کے مطابق اپنی ضروریات کے لئے ڈھالنے کی کس کوشش اور کس محنت کی ضرورت ہے اور ہمیں یہ بات علی الاعلان کہنا ہوگی کہ ہر وہ بات جو مغرب سے آئی ہے اور ان قدروں کی مخالفت کرتی ہے ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہے خواہ کتنی ہی جاذبِ نظر اور تسکین دہ کیوں نہ ہو۔ ہماری تلاش یہ ہونا چاہئے کہ ہم ہر پیشکش کو اپنی قدروں کی کسوٹی پر پرکھیں۔ یہ تلاش اولاد میں والدین کو پیدا کرنا اور طالب علموں میں استاد کو پیدا کرنا غالباً اہم ترین فریضہ ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ تعلیم و تدریس کے بعد اور والدین سے تربیت پانے کے بعد، جب زندگی کے عملی میدان میں نوجوان مرد اور عورتیں پاؤں رکھتے ہیں تو انہیں نامساعد حالات اور مختلف ضروریات سے واسطہ پڑتا ہے، اگر ماحول کے مطالبات جداگانہ ہوں تو ان کے لئے بیحد مشکل ہوتا ہے کہ وہ محض اپنے بچپن کی روشنی پر تمام عمر عمل کریں۔ قوم کے ذرائعِ ابلاغ اس کے رسالے، اس کے اخبار، اس کا ریڈیو، اس کا ٹیلیویژن مسلسل اس مقصد کے لئے استعمال ہونے چاہئیں کہ افراد کے سامنے نہ صرف اس قوم کا مقصد رکھیں بلکہ اس کی قدروں کی عزت اس کے دل میں پیدا کریں، جب تک مسلسل طور پر ہم اس بات پہ مفتخر محسوس نہیں کریں گے کہ ہمارا ورثہ دراصل عظیم اور باعظمت ورثہ ہے، ہمارا ورثہ دراصل انسانیت کے لئے مفید ہے، ہم بے مقصد زندگی گزاریں گے۔ اگر ہمارے ابلاغ عامہ کے ادارے اور قومی تنظیم کے ارکان مادیت سے مغلوب ہونے والی تہذیب اور کلچر کے تقاضوں

پر مسلسل اپنی قدروں کی مخالفت کرتے رہیں گے تو یہ بات ہر شخص کی انفرادی جدوجہد کے امکان سے بالاتر ہے کہ وہ اس قسم کے ماحول میں رہتے ہوئے مسلسل اپنے عقائد کے خلاف پروپیگنڈہ سنتے ہوئے، مسلسل اپنے ورثے کی تحریف کو دیکھتے ہوئے پھر اپنی بات پر قائم رہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوا کرتے ہیں جو ایسے ماحول سے متاثر نہ ہوں اور وہ معاشرے کے متوازن افراد کی بجائے معاشرے کے باغی ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر واقعی طور پر ہمیں اپنے ان پُرمقصد عوامل کو، جو ہمیں اس طرف لے جاسکیں، جہاں جانے کی نیت سے سفر شروع کیا تھا، حاصل کرنا ہے تو بالکل ظاہر اور بالکل واضح بات یہ ہے کہ ہم یہ نہیں کر سکتے کہ زبان تو لیں ہم ایک دوسری ثقافت کی اور فکر و دانش پیدا کریں اپنے لیے۔ اس زبان میں جہاں ہماری ثقافتی قدروں کے لئے منافرت موجود ہے، جہاں کے محاورے میں ہماری اچھی باتیں بے ہودہ ہیں، جہاں کی مثالوں میں جہاں کے الفاظ میں ہماری اور ہمارے ماضی کی توہین شامل ہے ہم اس میں سوچتے ہوئے اور اس پر عمل کرتے ہوئے اپنے معاشرے کو، اپنی ثقافت کو اپنی اقدار کو بلند کیسے کر سکیں گے؟

جب چین نے نہ صرف اپنے ماضی، اپنے غلط ماضی بلکہ اپنے حال کے استبدادی نظام سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی اور انہوں نے برطانیہ، امریکہ اور مغرب کا سیاسی جوا گلے سے اتار پھینکا تو پہلا فیصلہ جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ نہ کوئی مغربی زبان پڑھائی جائے گی، نہ مغربی کتب لائبریری سے کسی کو دی جائیں گی اور چین پارٹی ورکرز نے، جن میں بڑے بڑے لیڈر بھی تھے، مغرب میں تعلیم حاصل کی ہے، انہیں ہر قسم کے رہبری کے کام سے علیحدہ کر دیا جائے۔ باوجود اس کے کہ ان کی بڑی قربانیاں تھیں اور انہوں نے سالہا سال سرد پہاڑیوں میں رہ کر انقلابی افواج کی رہنمائی کی تھی، انہوں

نے فیصلہ کیا کہ قومی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ ان سب کو اہم اور اثر ڈالنے والے مقامات سے علیحدہ کر دیا جائے۔ موؤزے تنگ سے میرے ایک پاکستانی دوست کو اس موضوع پر بات کرنے کا موقع ملا۔ موصوف نے یہ بات بڑے پُراثر انداز میں بیان کی کہ جب انہوں نے موؤزے تنگ سے پوچھا کہ آپ نے حصولِ علم اور تجربہ کا ایک بڑا اہم ذریعہ منقطع کر دیا ہے چونکہ مغرب نے جو سائنس کے میدان میں جدوجہد کی ہے اور وہاں جو فکری جدوجہد ہے، جو خیالات حاصل ہو رہے ہیں، ان سب کو آپ نے یکسر اپنے لئے کالعدم کر دیا؟ اور ان لوگوں کو بھی بیکار کر دیا جن کے خلوص کے آپ قائل تھے، جو آپ کے ساتھی تھے، جو مغرب کے تسلط کے خلاف خود آپ کی قوم میں ہوتے ہوئے آپ کے رہبروں میں سے تھے؟ رہبر چین نے جواب دیا ”ہاں ہم نے یہ کیا۔ چونکہ ہم نے یہ دیکھا کہ مغربی تاثرات سے ان کے دل ٹھیک ہونے کے باوجود ان کے دماغ مفلوج و مغلوب تھے۔ وہ اپنے شہروں کو گندا سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ یہاں وہ غلاظت تھی جو مغرب کے شہروں میں نہیں ہے۔ وہ مکھیوں، غربت اور پسماندگی پر نوحہ کناں تھے۔ وہ یہ نہیں سوچتے تھے کہ ہماری معاشی اور معاشرتی کیفیت، حدود اور قیود کیسی ہیں اور ہم کیسے ترقی کر سکیں گے۔ وہ ہماری ہر اس چیز سے جو کہ ماحول نے ہم پر پسماندگی کے طور پر مسلط کی تھی، اس لئے متنفر تھے کہ وہ ان کی صاف دنیا کا حصہ نہیں۔ اس کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ لوگوں کے ساتھ محبت و مروت سے نہیں، وہ حالات کو سمجھتے ہوئے نہیں بلکہ ایک بے چینی میں، ایک مخالفت میں یہ چاہتے تھے کہ یہ بھی ٹھیک ہو جائے، وہ بھی ٹھیک ہو جائے۔ ان کا طریق کار اپنوں کا نہیں غیروں کا تھا۔ وہ یہاں نہیں ہیں لیکن کیا ہمارا کوئی شہر غلیظ رہا؟ وہ یہاں نہیں ہیں، کیا آپ نے یہاں مکھیاں پائیں؟ وہ یہاں نہیں ہیں لیکن کیا آپ نے سائنس کے معاملے میں بھی کہیں کمی

آزاد ملکوں سے آگے نہیں پایا۔ اور یہ سب باتیں ہم نے اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے، ہم نے اپنے معاشرے کی ترویج کرتے ہوئے اور اپنے زاویۂ نگاہ کو بڑھاتے ہوئے کی ہیں"

نہ جانے آپ کے اور ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ نہیں کہ ہم تمام انگریزی پڑھے لکھے لوگوں کو یک بینی و دو گوش نکال باہر کریں۔ تجویز اچھی ہوگی لیکن چونکہ ہم سب پر براہ راست اس کا اثر پڑتا ہے اسلئے میں اس پر زیادہ زور نہیں دوں گا گو ایمانداری کی بات یہی ہے کہ اگر ہماری سوچ، ہمارا فکر، ہمارے تخیل کے منبعے اس تہذیب میں ہوں، جہاں کے لوگ ہماری محسوسات سے عاری اور جہاں کے لوگ ہماری ہمدردی سے بے درد ہیں، جہاں کے لوگوں کی سوچ ایک بالکل مختلف زاویے سے ہے۔ اس معاشرے میں ہوں، جس کی زبان اور جس کی تہذیب کا افتخار ہی ہماری مخالفت ہو جن کے تمام نظریے اور فلسفے متعلق ہی اس بات سے ہوں کہ ہم پسماندہ، ہم غیر، ہم مفسد اور ہم نامعقول ہیں تو ان کے نظریات اپنانے سے ہم کیسے پنپ سکتے ہیں؟

ہم بھی کسی زمانے میں دنیا کو خیالات دینے والے تھے ہم نے بھی سائنس کے ہر شعبے میں ہدایت کی ہے۔ سائنس کے بے انتہا ذخیرے، فلسفے اور تفکر کے بے انتہا خزانے ہم مسلمانوں سے مغربی زبانوں میں منتقل ہوئے لیکن مغرب کی قوموں نے ہمارے خیالات کو ہماری زبان میں اور ہمارے تفکر کو ہمارے معاشرے کی حدود میں قبول نہیں کیا۔ انہوں نے اس تمام میراث میں سے خوشہ چینی کرنے کے بعد اس کو اپنی زبان کا، اپنے خیالات کا، اپنے تفکر کا، اپنی ثقافت کا جامہ پہنا لیا اور آج انہیں یہ بھی یاد نہیں ہے کہ بہت سی باتیں، جو ان کے پاس ہیں وہ ہم سے ان تک پہنچی ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں ہم اپنے جذبۂ تابعداری کو اس قدر مغلوب کرتے ہیں کہ ہر ہدایت براہ راست ان سے حاصل کرنے کیساتھ

وہ اثرات بھی ان سے بلا چون و چرا قبول کرتے ہیں جو نہ ہماری ثقافت کے مطابق ہیں، نہ ہمارے ماحول کے مطابق ہیں اور نہ ہماری روایات کے مطالبات کے مطابق ہیں۔

ہمارے تعلیمی نصاب میں مشرقیت پر اس حد تک زور ہونا چاہیے کہ کسی بچے کو غلط وہم نہ ہو کہ مغرب ہم سے بالا تر ہے، مغرب کی تہذیب ہم سے بہتر ہے۔ مغرب کے طریقے ہم سے اونچے ہیں۔ اس کے دل میں یہ احساس پیدا ہونا چاہیے کہ وسائل کی غربت میں باکردار عمل باعث عزت ہے۔ ہم غریب کمزوری کی وجہ سے نہیں ہیں، وسائل کی کمی کی وجہ سے ہیں۔ لیکن عزت کا معیار ہماری غربت نہیں ہے، ہمارا کردار ہے۔ کردار کی مضبوطی دولت کے حصول سے زیادہ بہتر ہے۔ دولت مند بے کردار غریب باکردار سے بہت پیچھے ہے۔ ہماری ثقافت ہمیں جن قدروں پر متوجہ کرتی ہے، وہ انسانی قدریں ہیں، مالی قدریں نہیں ہیں۔ ہمیں بہتر بیٹا، بہتر شہری، بہتر شوہر، بہتر انسان بننا ہے اور چونکہ کم وسائل میں بننا ہے اسلئے ہمارا چیلنج بڑا ہے، لہٰذا ہماری عزت زیادہ ہونی چاہیے کہ ہم نے کم وسائل سے انسانی اقدار کو بلند کرتے ہوئے کردار کو بلند کیا۔ اب میں آپ کو سوالات کی دعوت دیتا ہوں۔

فیض محمد صاحب

سب سے بڑا مسئلہ اس وقت ہمارے ملک میں زبان کا مسئلہ ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی کی اکثریت مشرقی پاکستان میں آباد ہے اور ان کی زبان بنگالی ہے اور باقی مغربی پاکستان کی جو آبادی ہے، وہ بھی چار حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ سندھ میں عموماً سندھی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے اور نصابی کتابیں بھی وہاں سندھی میں، کہیں کہیں موجود بھی ہیں۔ اسی طرح بلوچستان کی اپنی زبان ہے، سرحد کی اپنی زبان۔ تو ماہرین تعلیم

کا سب سے پہلا جو فرض ہے، وہ اس بات پر غور کرنا ہے کہ اس ملک کی ایک زبان بنانے میں ہم کیا کیا اقدامات کر سکتے ہیں؟

جواب: اس سلسلے میں میرے خیالات آپ کو شاید اتنے زیادہ اچھے نہ لگیں لیکن میں پھر بھی عرض کروں گا کہ مسلمان جس تصور کو لے کر اٹھے تھے وہ ملت کا تصور تھا۔ ملت ان تمام لوگوں کی جو ایک خدا، اس کے دیئے ہوئے قرآن، اس کے بھیجے ہوئے نبی پر اس قسم کا ایمان بالغیب رکھتے ہیں کہ اللہ کے دیئے ہوئے پیغام کو اپنے لئے لائحہ عمل تصور کرتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ اسے سمجھیں، اس کے مطابق عمل کریں۔ اب اس ملت میں مختلف قومیں ہیں جیسے قبیلوں میں کنبے اور کنبوں میں افراد۔ قوموں کی تخصیص خواہ نسل کے مطابق ہو خواہ جغرافیائی حدود کے مطابق اور خواہ وہ حصوں میں کٹی ہوں وہ ہیں ملت کا ہی ایک جزو۔ اگر قومی جذبہ بے انتہا شدید ہو جائے اور وہ ملی جذبے پر فوقیت لے جائے تو ملی تصور ختم ہو جاتا ہے اور قوموں کو دنیاوی ذرائع استعمال کر کے اپنے مقاصد کے لئے آگے جانا پڑتا ہے۔ زبان قومی جذبات کی یک جہتی کے لیے ایک ضروری چیز ضرور ہے لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ جن ملی جذبات کی ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ترجمانی کرتے ہیں ان میں رنگ و نسل، جغرافیہ اور زبان کے لحاظ سے پیدا شدہ مسائل اتنے شدید منفی تاثرات نہیں ہیں۔ یہ معاملات بنیادی ملی جذبے سے انسان کو ادھر ادھر کرنے والے نہیں۔ اس ملی جذبے کی انتہا یہ ہونی چاہیے کہ تمام مسلمان قومیں جو مختلف جغرافیائی حدود میں محدود ہیں، اپنی جغرافیائی حدود کو بھولتے ہوئے ایک بین الاقوامی منصوبہ اور حکمت عملی پیش نظر رکھیں اور رفتہ رفتہ شاید ایک ہی طریقہ کار اور ایک ہی نظام حکومت پیدا کر سکیں۔ بالآخر اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس میں عرب بھی ہوں، ایرانی بھی ہوں، افغانی بھی ہوں، یورپین

قومیں بھی ہوں۔ ان تمام کے لئے جغرافیائی حالات اور اپنی لسانی وراثت علیحدہ علیحدہ ہوگی مگر یہ ہمیں اپنے اصل مقصد یعنی خدا کی اس زمین پر حاکمیت اور خلیفۃ اللہ فی الارض کے منصب کی ادائیگی سے متزلزل نہ کر سکے گی۔ میں یہ بھی نہیں سمجھتا کہ قوم زبان سے مشتق ہے۔ یہ مفروضہ اس حقیقت کی نفی ہے کہ ملت سے جو فرد منسلک ہے وہ اشتراک خیالات پر ہے، محض اظہار خیالات پر نہیں ہے۔ اتحاد سوچ پر ہے، زبان پر مبنی نہیں ہے۔ اشتراک عمل پر ہے، اس بات پر نہیں ہے کہ زبان کیا ہے، لہجہ کیا ہے۔ بنی نوع انسان میں زبانوں کا اختلاف رہے گا۔ قوموں میں زبانوں کا اختلاف بہت دیر تک رہے گا۔ خدا جانے کتنے ہزار سال کے بعد دنیا کی ایک زبان پیدا ہو۔ لیکن محض زبان کے نام پر قوم کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا، یہ تاریخی لحاظ سے ایک غیر منطقی عمل معلوم ہوتا ہے۔ آج بھی ایسی قومیں موجود ہیں، جہاں چار آٹھ زبانیں بولی جاتی ہیں اور جو رفتہ رفتہ اس اختلاف سے پیدا شدہ دقتوں کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مختلف زبانوں میں افراد کے ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک میں آنے کے بعد ایک اس قسم کی زبان پیدا ہونی شروع ہو سکتی ہے، جو ایک دوسرے کو سمجھ آتی ہو۔ لیکن کسی ایک زبان کو دوسرے علاقے پر مسلط کر دینا وہاں کئی نسلوں تک فکری لحاظ سے پسماندگی پیدا کر دیتا ہے، اس لئے کہ اپنی زبان میں سوچ اور اس کا اظہار ہی قدرتی ہوتا ہے۔ آرٹ کی تخلیق، ادب کی تخلیق، شعر و شاعری اور ہر تاثر کی تخلیق اس زبان میں ہی ممکن ہے، جو ماں پنگھوڑے ہی میں بچے کو دیتی ہے۔ پاکستان میں دو زبانوں کے ہونے کی وجہ سے اس کی قومیت کو خطرہ قطعاً غلط معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ لوگ صرف زبان کے نام پر تو غالباً ایک دوسرے سے مراسلت و موافقت نہیں کرتے۔ البتہ یہ بات بہت ضروری ہے کہ جس طرح مشرقی پاکستان میں زبان میں ہندو تہذیب کا اثر زیادہ آ رہا ہے اور مغربی

پاکستان میں زبان کے سلسلہ ہائے جنبانی میں جدیدیت کے نام پر مغربیت کا تاثر زیادہ شامل ہو رہا ہے۔ اس سے احتراز اس طرح کیا جائے کہ وہ خیالات، وہ تصورات، وہ ثقافتی قدریں جو دونوں میں مشترک ہیں ہر زبان میں سامنے آسکیں۔ آپ نے بالکل صحیح کہا کہ یہ تفاوتِ زبان صرف مشرق و مغرب میں ہی نہیں، مغربی پاکستان کے صوبوں میں بھی ہے۔ اگر ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب اور ایران، افغانی اور مصری بلکہ دنیا کی ہر مسلمان قوم ملتِ اسلامیہ کا ہی جزو ہے تو مجھے یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ کے اپنے ملک میں محض کئی زبانیں ہونے کی وجہ سے اس کی قومی وحدت کیوں مشکوک ہو؟ میرے ناچیز خیال میں ان زبانوں کے غلط رایک دوسرے سے مخالفانہ، استعمال اور ان زبانوں میں خارجی تاثرات کی درآمد یہ آپ کا اصل مسئلہ ہے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ زبان بذات خود آپ کو ایک دوسرے سے ہٹاتی ہے، مسئلہ یہ ہے کہ زبانوں میں خیالات اس قسم کے آرہے ہیں کہ ان زبانوں کے استعمال کرنے والے ان کے خارجی حالات سے متاثر ہو کر نفرت اور محبت کرتے ہیں۔ آپ ان خیالات کی روک تھام کیجئے گا تو صرف اختلافاتِ زبان کے باعث آپ قومی یکجہتی سے محروم نہ ہوں گے۔

مس نسیم شوکت

میں سب سے پہلے رضوی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ انہوں نے بہت بصیرت افروز تقریر فرمائی لیکن چونکہ ہم سب کا تعلق تعلیم سے ہے اور ہمیں یہ پتا ہے، بار بار اس چیز کا ذکر بھی کیا گیا ہے کہ تعلیم صرف نصابی کتب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس میں اور بھی بہت سے عوامل شامل ہیں بلکہ جدید نصاب کی تعریف کی گئی ہے

کہ ہر وہ ACTIVITY جو بچے کے کردار پر اثر انداز ہوتی ہے، وہ نصاب کا حصہ بنتی ہے، لہٰذا کمرۂ جماعت کے اندر کے ماحول سے بھی زیادہ اہم ہے تو میرا سوال یہاں یہ ہے کہ کتابوں کو ہم درست کر سکتے ہیں، یہ سب کچھ ہے لیکن جب تک ہم ماحول کو درست نہیں کریں گے، بات نہیں بنے گی۔ اس وقت کون نہیں جانتا کہ CO-EDUCATION جو ہے، وہ غلط ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جس قسم کی ہم سینماؤں میں فلمیں دکھاتے ہیں، وہ سب ہمارے ماحول کے منافی ہیں۔ میرا سوال یہاں یہ ہے کہ تمام چیزیں بڑی آسانی سے ختم ہو سکتی ہیں بشرطیکہ صاحبِ اختیار لوگ اس کی طرف فوری طور پر توجہ دیں۔ لیکن ہم جو یہاں سارے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں وہ اتنے صاحبِ اختیار نہیں، یہ ٹھیک ہے جو ہمارے پاس طلبا ہیں، جن کو ہم پڑھاتے ہیں، ان کو ہم اچھے خیالات دے سکتے ہیں لیکن ہم کس CAPACITY میں کس طرح یہ قدم اٹھا سکتے ہیں کہ اس قسم کی تمام چیزیں ختم ہو سکیں تاکہ جب تک ہم ایک مقصد متعین کر لیتے ہیں تو اس کے عین مطابق ہمارا ماحول ہو۔ کتابیں بناتے ہیں تو اس کے عین مطابق ہمارا ماحول ہو ورنہ میرا یہ خیال ہے کہ یہ تمام کتابیں اور یہ تمام چیزیں اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ پبلک کیا کر سکتی ہے اس چیز کے لئے کیونکہ ہمارے پاس براہ راست اختیار نہیں ہے۔ مثلاً ہم میں سے کسی ایک کے پاس یہ اختیار نہیں کہ ہم ایک قانون بنا دیں کہ ملک میں اس قسم کی کتابیں نہیں ہونگی۔ CO-EDUCATION نہیں ہوگی۔ یہ ہمارے اختیارات نہیں ہیں۔ دوسرا یہ سوال ہے کہ جیسا کہ آپ نے ابھی انگلش کی بات کی تھی۔ ہم عرصۂ دراز سے یہ محسوس کر رہے ہیں کہ انگلش کا ابھی تک ہماری قوم پر ناجائز بوجھ ہے۔ جب نئی تعلیمی پالیسی بنی تھی تو اس میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ ایجوکیشن کو ایک اختیاری مضمون رکھا جائے۔ لیکن یہ معاملہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا اور ہے اور اس کو ابھی تک حل کرنا یا اس

کو اختیاری مضمون کی حیثیت بھی نہیں دی گئی۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ اگر آپ کسی امتحان کے نتائج اٹھا کر دیکھیں گے تو آپ یہ دیکھیں گے کہ بیشتر طلبا جو ہیں وہ انگلش میں فیل ہوتے ہیں اور لازمی نہیں کہ ہر طالب علم کو انگریزی کی ضرورت ہو۔ تو اس انگلش کو ہم کیوں کھینچے جا رہے ہیں۔ کہ سب ہی اس کو پڑھیں۔ اس سلسلے میں پھر وہی بات اختیارات پہ آجاتی ہے کہ ہم اساتذہ اس سلسلے کو کس طرح لے کر چلیں گے۔

جواب: ہماری محترم بہن نے دراصل سوال نہیں پوچھا ہے بلکہ ہم پر ایک مشترکہ فردِ جرم عائد کی ہے جس سے مفر محال ہے۔ علم کی ایک تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اطلاعات جو ہمیں ملیں اور ہمارے ادراک میں جذب ہو جائیں تو علم بن جاتی ہیں۔ اگر ہمیں کسی بات کی خبر یا اطلاع ملے اور ہمارے دماغ میں دور ہے تو وہ ہمارے علم کا جزو نہیں تو علم اطلاعات اور خبروں کو اپنے دماغ میں شعوری طور پر محفوظ کرنے کا نام ہو سکتا ہے۔ آپ اساتذہ نے مجھے یہ علم دیا تھا کہ یہ سیدھی لائن (الف) ہے۔ یہ اطلاع دی تھی کہ یہ لمبی لائن جس کے نیچے نقطہ ہے (ب) ہے۔ میری ماں نے ہی یہ اطلاع دی تھی کہ گرم چیز پھونک مارنے سے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ یہ تجربہ میرا علم ہوگا۔ یہ علم بذاتِ خود کافی نہیں ہے۔ اس میں ہمارے غور کے بعد یہ ہمارا فکر بنتا ہے۔ فکر پختہ ہونے کے بعد دانش بنتی ہے اور مسلمانوں کا نظریہ ہے کہ دانش سے بالاتر ذریعہ احساس وجدان ہوتا ہے جو عقلی ذرائع سے بالاتر انسان کے دماغ پر تاثر دینے کے بعد اسے ایمان کی طرف راغب کرتا ہے۔ جب اطلاع بنیاد ہوئی علم کی اور علم ابتدا ہوا فکر کا۔ فکر ابتدا ہوا دانش کا تو یہ بھی طے ہو گیا کہ علم صرف تحریری علم نہیں ہے۔ فرد کو جو بھی اطلاعات حاصل ہوں وہ ذریعۂ علم ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس ماحول میں اطلاعات غلط ہوں گی، وہاں علم کا درست ہونا ذرا مشکل ہوگا۔ لہٰذا آپ کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اساتذہ تو صرف ایک حد

تک ہی اطلاع اور خبر دے سکتے ہیں۔ وہ تو علم حاصل کرنے، لکھنے پڑھنے اور سمجھنے کے طریقے بتا سکتے ہیں۔ بچہ اطلاع دے سکتے ہیں، جو طالب علم کے دماغ میں رہ جائے تو علم ہے اور وہ بھول جائے تو بے کار ہے۔ اس علم کو دانش بنانا، اس علم کو فکر بنانا یہ طالب علم کی سعی اور اشتراک پر منحصر ہے اور اس کے غور پر منحصر ہے اور جب وہ غور کر رہے ہوں ایک ایسے ماحول میں، جہاں اطلاعات نہ صرف ساتھیوں کی کرتوتوں سے، نہ صرف سینما سے، نہ صرف ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بلکہ اپنے بزرگوں کی گفتگو سے مختلف قسم کی مل رہی ہوں تو ان سے یہ توقع کرنا کہ آپ کی دی ہوئی اطلاعات کے علم پر وہ انحصار کریں گے، یقیناً غلط ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ معاشرے میں اطلاعات دینے کا، خبر دینے کا اور لہٰذا علم دینے کا کام صرف معلمین کا ہی نہیں ہے۔ تمام ماحول کا ہے، تمام معاشرے کا ہے۔ اسلئے میں نے عرض کیا تھا کہ ذرائع ابلاغ جو وسیع طور پر انسانی دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اطلاعات بہم پہنچا کر انسانی علم پر اثر انداز ہوتے ہیں اور پھر نامکمل علم سے نامکمل فکر تک لے جاتے ہیں، اور نامکمل دانش تک لے جاتے ہیں۔ ان تمام کا اس ماحول میں اکٹھا ہونا بہت ضروری ہے ورنہ یہ بات تباہ کن ہوگی کہ ایک طرف آپ کی دی ہوئی اطلاعات سے میں ایک قسم کا علم حاصل کر رہا ہوں اور دوسری طرف سینما، ٹیلیویژن اور اخبارات کی دی ہوئی اطلاعات سے میں دوسری قسم کا متضاد علم حاصل کر رہا ہوں۔ ان دونوں کی کشمکش سے جو دانش اور جو فکر پیدا ہوگا وہ یقیناً یکسوئی اور یک جہتی کا فکر نہیں ہوگا۔ لہٰذا یہ بات ضروری ہے کہ نہ صرف ٹیکسٹ بکس کے ذریعے ہی بلکہ ابلاغ کے تمام ذرائع کے تعاون کے ذریعے ہم وہ اطلاعات بہم پہنچا سکیں، جو اس علم پر منتج ہوں، جسے ہم انسانیت کی بہتری کا علم سمجھتے ہیں۔

ہدایت اللہ صاحب

جناب پروفیسر حمید احمد خاں نے گروہی رودادوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد ہمیں دو قومی نظریے کو بھلا دینا چاہئے۔ یہ تصور ہمارے ذہن میں نہیں آنا چاہیے۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں ہم جو اسباب بیان کرتے ہیں، ان میں پہلا سبب ہے کہ ہندوستان میں، برصغیر پاک و ہند میں دو قومیں آباد ہیں، مسلمان اور ہندو اور قائداعظم بھی اسی پر زور دیتے رہے ہیں، انہوں نے فرمایا تھا کہ چونکہ پاکستان کا قیام عمل میں آگیا لہٰذا اس تصور کو ہم اپنے ذہنوں سے خارج کر دیں تو کیا غیر مسلمان مؤرخین یہ نہ کہیں گے کہ مسلمان ابن الوقت ہیں اور مسلمانوں کے قول و فعل میں تضاد پایا جاتا ہے کیونکہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کے قول و فعل میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہونا چاہیے۔ تو چونکہ جناب قاسم رضوی صاحب تحریک پاکستان کے سرگرم رکن رہے ہیں لہٰذا میں ان سے یہ التماس کروں گا کہ وہ اس کی وضاحت کریں کہ ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک دو قومی نظریے کی کیا حیثیت رہی ہے اور کیا حیثیت رہے گی۔

جواب:۔ میرے خیال میں تقسیم ملک سے پہلے بھی ہمارا نظریہ دو قومی نہیں ایک قومی نظریہ تھا کہ ہم ہندی مسلمان ہندوستان میں ایک قوم ہیں۔ باقی قومیں اگر دو بھی تھیں تو ہمیں اس سے تعلق نہیں تھا۔ ہم ایک قوم کی حیثیت سے کچھ حقوق رکھتے تھے۔ جہاں ہماری قوم واضح اور وسیع علاقائی اکثریت میں تھی وہاں ہم آزادانہ حکومت کے حقدار تھے۔ جہاں ہماری قوم اقلیت میں تھی وہاں ہم دوسروں کی حکومت کے ماتحت اپنے حقوق کے تحفظ کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔ یہ الفاظ کا گورکھ دھندا ہے کہ اس حقیقت کا نام دو قومی نظریہ رکھ دیا جائے۔ ہمارا تو مطالبہ ہی یہ تھا کہ ہم مسلمان ہندوستان میں ایک قوم ہیں۔

راس کماری سے خیبر تک، ہم ایک قوم ہیں۔ ہم اکثریت کے علاقوں میں ایک ایسا انتظام قائم کرنے کے خواہشمند تھے جس سے اسلام کی حقانیت اور فلاحِ انسانی کے دور کی پھر ابتدا ہو۔ لیکن محض اس مملکت اور حکومت کے قیام سے ہی ہم قوم نہیں بن رہے تھے۔ پاکستان کی جغرافیائی حدود میں رہ کر ہم باقی مسلمان قوموں کے ساتھ ایک ملت ہیں۔ یوں سمجھیے کہ جہاں کسی انتظامی، کسی جغرافیائی، کسی حکومتی لحاظ سے ہم ایک نظام میں منسلک ہوں، وہاں ہم ایک قوم ہیں۔ اگر اس کے علاوہ کچھ لوگ ہمارے لائحہ عمل سے اختلاف رکھنے والے بھی موجود ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ نہیں صاحب اس ماڈرن زمانے میں کوئی جذبۂ ملی ضروری نہیں اور جو یہ کہتے ہوں کہ نہیں صاحب ہر قوم کے نظریات دوسری قوموں سے مختلف اور متضاد ہونے کے باعث ایک دوسرے سے اختلاط کی بجائے ایک دوسرے میں مخالفت کا باعث ہوتے ہیں۔ تو پھر وہ ہماری اس ایک قوم کا جزو بھی نہیں ہیں۔ جب ہمیں ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر قومی لحاظ سے اپنے آپ کو ممیز اور مخصوص کرنا تھا، اس وقت اس بات کی بہت ضرورت تھی کہ ہم یہ احساس پیدا کریں کہ زبان و رنگ اور ہر چیز کے اختلاف کے باوجود اللہ کے ایک نام پر ہم ایک قوم ہیں اور باقی دوسری قوم یا قومیں ہیں۔ جب ہمیں اس مملکت میں آزادی حاصل ہو گئی تو دوسرے شہریوں سے جو ہمارے ملک کی حدود میں ہی رہتے ہوں، ان ہنگامی یا عارضی اختلافات پر زور دینا اس قدر اہم نہ رہا کیونکہ اللہ کے فضل سے ہم یہاں اتنی اکثریت میں بحیثیت ایک قوم موجود ہیں کہ دوسری اقلیتوں کے ساتھ ہم منصفانہ ہی نہیں بلکہ خسروانہ سلوک کر سکتے ہیں۔ اپنے سے بہتر حالاتِ معاش انہیں دے سکتے ہیں۔ چونکہ ان کا مقصد تو صرف دنیاوی حصول ہی ہے، وہ انہیں اس سے بہتر دیا جا سکتا ہے جو مسلمانوں کو میسر ہے۔ اگر وہ ہمارے ملی جذبے کے ساتھ منسلک نہیں ہیں تو ظاہر ہے یہ بات ہے کہ ہماری گاڑی میں

بیٹھے ہوئے ہیں لیکن ہم دونوں کا سفر مختلف منزلوں کے لئے ہے۔ مجھے معلوم نہیں ہے کہ حمید احمد خاں صاحب نے کیا فرمایا تھا۔ ممکن ہے ان کا خیال ہو کہ اندرون ملک دو قومی جذبے کو زیادہ اہمیت دینا اس وقت ان حالات میں غیر ضروری ہے۔ غالباً ان کا مقصد یہ نہیں ہو گا کہ عیسائی ہندو اور مسلمان پاکستان میں بحیثیت ایک قوم کے ہیں۔ غالباً اس نظریہ میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ ہم اس بات کا دعویٰ کریں کہ جغرافیائی پاکستان میں ایک مسلمان قوم ابھی زندہ ہے۔

فیض محمد صاحب

میں نے جو پہلا سوال جناب قاسم رضوی سے پوچھا تھا ان کے جواب سے میں مطمئن نہیں ہوں۔

اب اس نظام سے اگر یورپ کے عیسائی مذہب کے لوگ پیدا نہ ہو سکیں گے یا گورے رنگ کے لوگ پیدا نہیں ہوں گے تو وہ مسلمان بھی نہیں رہیں گے۔ یعنی میکالے کو اعتماد تھا اپنی پالیسی کی مضبوطی پر کہ وہ ایک ایسی تہذیب کو جنم دے گی جو کم از کم اگر مغربیت کی طرف نہیں لے آئے گی تو مشرقیت بھی نہیں رہنے دے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ زبان جو ہے ابلاغ کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ الفاظ کے اپنے کوئی معنی نہیں ہوتے جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو بالکل خالی ذہن لے کر آتا ہے اور اس کے بعد میں وہ گھر کے ماحول سے چیزیں سیکھتا ہے۔ وہاں سے وہ اپنے والدین کی زبان اپنا لیتا ہے اور اسے انس اپنے والدین کے ساتھ رشتہ داروں کے ساتھ اسلئے زیادہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زبان کو سمجھتے ہیں۔ اگر گھر کے اندر مختلف زبان ہوگی اور قبیلے میں ایک دوسرے کی زبان

کو سمجھنے والے ہی نہیں ہوں گے تو میرے خیال میں وہ انس نہیں رہے گا، UNITY نہیں رہے گی۔ ہاں یوں تو ہو سکتا ہے کہ جیسے جناب رضوی صاحب نے کہا کہ بیرونی ممالک میں بھی مسلمان رہتے ہیں، ان پر ہم یہ زبان کیسے ٹھونس سکتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری ہمسائیگی میں کچھ لوگ ہیں، جو غیر زبان بولتے ہیں تو ان سے CONTACTS ہمارے ثانوی درجے پر ہوتے ہیں لیکن ایک فیملی کے اندر جو ہمارے RELATIONS ہیں وہ اتنے قریب کے ہوتے ہیں، اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ اس کے بغیر ہمارا گزارا ہی نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک ہی زبان جاننے والے ہیں۔ تو ایسا رسم الخط یا ایک ایسا ذریعہ ضرور ہونا چاہئے کہ پانچوں صوبوں میں ایک زبان استعمال ہو۔ جس طرح انگریزی کو اس وقت بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے۔ ٹھیک ہے، علاقائی زبانیں اور ہیں دوسرے ملکوں کی لیکن ہر ایک ملک کی بین الاقوامی زبان سمجھتے ہوئے انگریزی زبان ہر ملک میں نافذ ہے تو اس صورت میں پاکستان میں بھی ایک ہی زبان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ ماہرین تعلیم اگر اس مسئلے کو بالکل ہی ٹال دیں تو میرے خیال میں وہ وقت نہیں آئے گا، جس سے قوم کی یک جہتی کو تقویت ملنے کا موقع ملے۔

جواب: میرے خیال میں اس وقت پاکستان کے ساتھ جو معاملہ ہے وہ ایسا ہے، جیسے کہ کسی جسم میں کاری سا زخم تمام توجہ کا مرکز بنا ہوا ہو۔ جب کسی زخم سے جسم مجروح ہوتا ہے تو باقی کوئی دوسری بات نہیں سوجھتی تمام توجہ زخم کی طرف ہوتی ہے۔ وہ درد کرتا ہے، وہ مرہم مانگتا ہے۔ صحت مند اعضا کی طرف تصور ہی نہیں جاتا۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ زخم ہی تمام زندگی ہے، لیکن انسان کو آپ بخوبی جانتے ہیں۔ جسم انسانی پر بچپن سے لے کر بڑھاپے تک زخم لگتے رہتے ہیں، اس کی قوت مدافعت انہیں ٹھیک کرتی رہتی

ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ زبان کے جو زخم ہمیں حال ہی میں لگے ہیں، ان کی وجہ سے ہماری توجہ زبان کے معاملے پر اس حد سے زیادہ ہے، جو ہونی چاہیے تھی۔ زبان دراصل جن خیالات کا، جن جذبات کا اظہار کرنے کا ذریعہ ہے، ان کی طرف توجہ نہیں ہے، محض زبان پر بذات خود تمام توجہ ہے۔ زبان کی تاریخ تو یہ ہے کہ جب فتح اسلام عرب میں یہ لسانی سوال پیدا ہوا تو حجازی یہ کہتے تھے کہ نجدیوں کو کچھ کہنا ہی نہیں آتا۔ پھر جب عرب اپنے منطقوں سے نکلے تو انہوں نے باقی تمام دنیا کو عجم کا خطاب دیا۔ "گنگ، بے زبان جو بولنا نہیں جانتے۔ وہ تمام علوم، وہ تمام زبانیں، جو عرب سے باہر تھیں، گنگ تھیں، زبان دان تو صرف ہم عرب ہیں"۔ زبان کے متعلق ایک علاقائی غرور اور فخر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ زبان کبھی اوپر سے اتاری نہیں جاتی۔ زبان ہمیشہ لوگوں کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے، ان کے قبول سے آگے چلتی ہے۔ زبان کے سلسلے میں فی الحال آپ یہ کر سکتے ہیں کہ مشترکہ الفاظ کی تلاش اور استعمال پر غور کریں اور بدقسمتی سے چند ہی سال پہلے آپ کے مشترکہ الفاظ زیادہ تھے۔ ایسٹ اور ویسٹ پاکستان میں، سرحد میں اور بلوچستان میں، سندھ اور پنجاب میں میلاد شریف، مجالس مذہبی ملاقات سب کے سب اپنے لہجے کی اردو میں تھے۔ یہ ایسی زبان تھی جسے ہم سب سمجھتے تھے لیکن جب کسی زبان کی عصبیت کو ابھارا گیا تو مخالفت میں اس کے خلاف عصبیت بھی بڑھتی گئی۔ اگر اس تعصب کو اس طرح چیلنج نہ کیا جاتا تو غالباً یہ اختلاف اتنی سختی سے اپنے آپ کو ظاہر اور معلن نہ کرتا۔ لیکن جب اسے چیلنج کیا گیا تو اس نے دھماکے سے اپنا اظہار کیا اور ہمیں زخم دیئے۔ یہ زخم کوئی مستقل زخم نہیں ہیں۔ اگر جسم صرف ایک ٹانگ کا نام ہے، اگر مملکت صرف زبان کی یکسوئی کا نام ہے اور زبان سے پیدا شدہ دیگر مشتقات کا نام ہے، تب تو آپ کے لئے ایک بہت بڑا نازک مرحلہ ہے لیکن اگر جذبات میں یکسانیت

ہو سکتی ہے تو قومیت میں فرق نہیں آئے گا۔ یہ تو وہی زبانیں بولنے والے ہیں جو کئی سال پہلے ایک ہی زبان میں یہ کہا کرتے تھے کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ۔ پاکستان زندہ باد۔ نہ اس جذبے کو کسی نے مدراس میں ادا کیا، نہ کسی نے بنگال میں ادا کیا۔ لہٰذا میری حقیر رائے میں اگر آپ زبان کی عصبیت پر ضرورت سے زیادہ (دونوں طرف) توجہ دیئے بغیر، کچھ عرصے کے لئے اس کے اختلاف کو برداشت کرتے رہیں، بجائے اس کے کہ اس کا مقابلہ کریں تو شاید چند سالوں (۲۰-۲۵ سالوں) میں آپ کی زبانوں کا اشتراک ایک دوسرے سے ہونے لگے اور الفاظ بھی ایک دوسرے کے پاس پہنچنے لگیں۔ یہ اردو آخر کیا ہے؟ آج سے دو تین سو سال پہلے اس کا ایک تیور اور محاورہ بھی معرض وجود میں نہیں تھا۔ یہ مختلف زبانوں کی وراثت ہے جو انتشار بٹنے سے پیدا ہوئی اور پھر پھیل گئی۔ اگر آپ کی تمام حکمت عمل اس بات پر ہوگی کہ اپنی قومی زبان کے مقابلے میں مقامی زبان کا معیار متعین کرتے رہیں یا کوئی نئی زبان ایسی ڈھونڈنے کی کوشش کریں، جسے آپ لاکر پھر لوگوں پر مسلط کریں تو یہ اس قدر طویل محنت ہے، اس قدر وقت ضائع کرنے والی محنت ہے کہ شاید زمانہ ٹھہر کر تمہارا انتظار نہ کرے۔ زبان کی عصبیت کو ٹھنڈا ہونے دیجئے گا۔ ہمیں شاید اس کے متعلق زیادہ بہتر راستے مل جائیں لیکن اس تمام وقت میں کوشش یہ کرتے رہیے گا کہ زبان کے اختلاف کے باوجود خیالات کا، جذبات کا اختلاف پیدا نہ ہونے پائے۔ میرے پاس اس سوال کا اور کوئی جواب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جتنی بحث ہوتی ہے اتنی ہی تلخی پیدا ہوتی ہے۔

مسٹر اے بی ملک

صاحب صدر! جناب قاسم رضوی صاحب نے فرمایا ہے کہ ہمارے وسائل کم

ہیں اور ہم طالب علم کو یہ پڑھائیں کہ آپ غریب نہیں، آپ امیر ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ جدید اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کی تقریباً ساڑھے بارہ کروڑ آبادی ہے اور اس کے وسائل بھی امیر ہیں۔ یہاں کوئلہ اور پٹرولیم کے ذخائر ہیں۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ ان وسائل کو بروئے کار نہیں لایا جاتا، ان کو استعمال میں نہیں لایا جاتا اور ہمارا طالب علم یہ پڑھتا ہے کہ ہم تو ایک غریب ملک میں پیدا ہو گئے ہیں حالانکہ یہ غریب ملک نہیں ہے۔ اس کے وسائل دیکھنے کے لیے جب باہر کے ماہرین آتے ہیں تو اپنی من مانی اور غلط قسم کی رپوٹیں دیتے ہیں۔ کیا پٹرولیم یہاں نہیں ہے؟ کیا سوئی گیس یہاں سے نہیں ملتی؟ کیا یہاں کوئلہ نہیں ہے؟ ہر چیز موجود ہے لیکن میں ایک طالب علم ہوں اور کامرس کا طالب علم ہونے کی وجہ سے میں یہ پڑھتا ہوں کہ ہماری کاٹن کمزور ہے، ہماری جیوٹ گھٹیا ہے۔ یہ پڑھ کر ہمارے ذہن میں (پیدا ہوگا۔ میں کیا یہ نہ سمجھوں گا کہ میں ایک غریب ملک کا طالب علم ہوں اور جب میرا استاد مجھے پڑھاتا ہے تو وہ انتہائی معذرت سے کہتا ہے کہ دیکھیے ہم غریب ملک میں پیدا ہو گئے ہیں، ہمیں غریب ملک کا تصور ہی ذہن سے اٹھانا چاہئے، اہم وسائل بھی یہاں موجود ہیں، انسانوں کی بہتر تعداد بھی موجود ہے۔ میرا سوال کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ بتانا چاہئے کہ ہمارے وسائل کم نہیں ہیں۔ وسائل بے شمار ہیں اور پاکستان غریب نہیں امیر ملک ہے اور میرا یہی سوال ہے۔

جواب: میں بڑا خوش ہوں اور بڑے فخر سے کہتا ہوں کہ میرا ملک اور میرے لوگ امیر ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ کہتا ہوں کہ امارت کا تعلق دولت سے نہیں، دل سے ہے۔ میں جب وسائل کہتا ہوں تو میرا مطلب ہوتا ہے، بروئے کار اور مستعمل وسائل۔ میں دفینوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں، چونکہ ان کا مجھے علم نہیں، مجھے امید ہے کہ اللہ نے ہمارے وسائل مدفون بھی

رکھے ہوں گے، معلوم بھی رکھے ہیں۔ اگر ہم لفظ غریب میں کوئی برائی محسوس کرتے ہیں تو یہ ہماری کمزوری ہے۔ غربت بذات خود باعث ندامت نہیں ہونی چاہیے۔ غربت اور امارت کا تصور اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ ہمارے فلسفے کے مطابق کردار کی غربت و مفلسی اور اس امارت کا ہے۔ یہ ایک طویل بحث ہے۔ تقویٰ کا مقصد دراصل یہی تھا کہ ہر شخص اپنے محدود وسائل کے باوجود انسانیت کے شرف کو اور اس کے منصب کو اونچا کرتا چلا جائے۔ لہٰذا اپنے بچوں کو اگر کوئی استاد غریب کہنے کے بعد ان میں احساس کمتری پیدا کرتا ہے تو میرے خیال میں میرے دوست کا یہ اعتراض ٹھیک ہے لیکن اگر وہ یہ کہتا ہے کہ جو لوگ تمہیں غریب کہتے ہیں وہ نہیں سمجھتے کہ تمہاری اصل دولت کہاں ہے اور تم اس دولت کو بروئے کار لاؤ، جو تمہارے کردار کی اور تمہارے ایقان کی دولت ہے تو میرے خیال میں وہ ٹھیک بات کرتا ہے۔ ہمارے مادی وسائل کمزور ہیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ انسانی وسیلہ سب سے بڑا خزانہ ہے۔ ہم تو انسانیت پر یقین رکھتے ہیں اور انسانیت کے مستقبل میں، مادیت کے مستقبل میں نہیں۔ لہٰذا میں اساتذہ کرام سے درخواست کروں گا کہ اپنے دوست کے کہنے کے مطابق جب وہ بچوں کو غریب کہیں تو ان میں حسرت پیدا نہ کریں، کردار کا فخر پیدا کریں۔

عبدالرؤف انجم صاحب

دراصل سوال تو دو تین پوچھنے تھے مگر میں ایک اہم ترین سوال کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ یہاں ہم نے بہت سی باتیں سنی ہیں جو THEORETICAL ہیں، جن پر عمل کرنا ہمارے اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ ہمیں بہت کچھ بتایا گیا —— لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہاں اقتدار کا منبع اور سرچشمہ ایک خاص گروپ ہے اور آپ نے بھی اپنی

تقریر میں جذبۂ مرعوبیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پہلے ایک طرف جہاں خارجی حکمران تھے، ان سے ہم مرعوب بھی ہوئے اور مغلوب بھی ہوئے۔ تو آج کیا یہ صورت نہیں ہے کہ اسی ملک میں ایک اور طبقہ ابھرا ہوا ہے، جس نے جس طرح کل کی گروہی بحث میں بات ہوئی ہے ۴۴ سال تک نظریۂ پاکستان کی تردید کی اور ہم ان سے متاثر ہو کر مرعوبیت کے تحت نہ تو اپنی آواز بلند کر سکے اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھا سکے۔ اس سلسلے میں کیا اس وقت اس ملک کو ایسے حالات تو درپیش نہیں کہ جس طرح ہم نے پہلے خارجی حکمرانوں کو باہر کیا تھا، آج ہم اپنے داخلی حکمرانوں کا بھی محاسبہ کریں اور پھر جب میدان صاف ہوتا ہے تو اپنے طور پر اور اپنے فکر اور اپنی سوچ کے مطابق ہم تعلیمی پالیسی بھی وضع کریں۔ زبان کا مسئلہ بھی حل کریں اور پھر اپنے اقتصادی معاملات، جذبۂ ایمان سب چیزوں کی طرف توجہ دے سکیں۔ میرا قاسم رضوی صاحب سے صرف یہی سوال ہے۔

جواب: انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی ۴۴ سال کی نامرادی کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈیں۔ ہر شخص بہانہ ڈھونڈتا ہے۔ کوئی سیاست دان کے پیچھے ڈنڈا لئے ہوئے ہے اور کوئی معلم کے پیچھے۔ اِس نے تعلیم خراب کر دی، اُس نے سیاست خراب کی۔ ملازمین نے حکومت خراب کر دی، ڈاکٹر نے صحت خراب کر دی۔ یہ حیلہ جوئی دراصل اس شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ ہے جو ۴۴ سال کی ناکامی اور نامرادی نے پیدا کی ہے۔ ہم خود ہی بوتلیں کھولتے ہیں، ان سے جن برآمد کرتے ہیں اور پھر ہم اپنی بوتل کھولنے کے فعل کی مذمت کیے بغیر یہ کہتے ہیں کہ جن کا قصور ہے، میرا قصور نہیں۔ معاشرے میں جہاں جہاں ہماری آپس کی کلاس وار یا طبقاتی کشمکش ہے، وہ بھی جن ہے۔ کسی کے پاس تعلیم کی ذمہ داری ہے، کسی کے پاس تجارت کی، کسی کے پاس صنعت کی، کسی کے پاس ملازمت کی، کسی کے پاس انتظام کی اور سب نے

اپنی اپنی ذمہ داری جیسے نبھائی ہے قوم کو معلوم ہے۔ ذاتی خامیوں کا احتساب کیے بغیر ہم یہ حیلہ جوئی کرتے ہیں کہ ہماری ناکامیوں اور نامرادیوں کی یہ وجہ ہے کہ میں اس کرسی پر نہیں ہوں، فلاں اس کرسی پر ہے۔ کبھی یہ کرسیوں کی جنگ انفرادی حسرتوں کے نام پر ہوتی ہے اور کبھی طبقاتی محرومیوں کے نام پر۔ حالانکہ اپنی اپنی کرسی پر سب نے اکثر و بیشتر حق قوم ادا نہیں کیا۔ نہ جانے کچھ کرسیاں کھینچنے اور افراد کو بدلنے سے یک لخت انصاف اور فرض کے حقوق از خود کیسے پورے ہو جائیں گے۔ درحقیقت اگر آپ عوام سے پوچھیں یعنی ان ۹۵ فیصد لوگوں سے پوچھیں، جو ہم سب کے کئے دھرے کا خمیازہ بھگت رہے ہیں تو انہیں قطعاً اس بات سے دلچسپی نہیں ہے کہ کس کی کرسی اونچی ہے اور کون کس کرسی پر بیٹھا ہے۔ یہ تو محض کرسیوں والوں کی اپنی طبقاتی مہم جوئی ہے، جو ہم دانشورانہ بحثوں میں لے کر آتے ہیں اور ایک دوسرے پہ پھینکتے ہیں۔

ہم ایک نظام سے منسلک اور اس میں متعین ہیں۔ اگر یہ غلط نظام ہے تو اس نظام کو بدل دینا چاہیے۔ جب تک یہ نظام ہے، اس میں ایک آدمی کو پڑھانا پڑے گا، دوسرے آدمی کو سرجری کرنی پڑے گی، تیسرے آدمی کو خلاف قانون مجمع کے سامنے جا کر اسے روکنا پڑے گا۔ ہم ایک دوسرے پر الزام دے کر بے عملی اور عدم کارکنی کا دھبہ نہ دھو سکیں گے۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ ہم جو بھی ہیں اپنے نظام تعلیم کے پیدا کردہ ہیں۔ اگر ۱۶ سال تک جو غالباً اونچی ملازمتوں تک پہنچنے کی کم سے کم تعلیم ہے افراد کو یہ نہیں بتا سکے کہ انسانی قدریں کیا ہیں اور غیر انسانی قدریں کیا ہیں اور خدمت کیا ہے اور "حکومت" کیوں فرد کا حق نہیں تو ہمیں اپنی ناکامیاں بھی تو اسی تعلیم اور تربیت کے چہرے میں دیکھنا چاہیے۔ اسی آئینے میں جہاں ہمیں استبداد سے بھرا ہوا، ہنٹر لیے ہوئے ایک آدمی مجمع کو مارتا نظر آتا ہے، ہم یہ بھی تو دیکھیں کہ اس کا کردار کہاں سے آیا۔ اس کا علم کہاں سے آیا، اس کی قدریں کہاں سے آئیں۔ ۱۶ سال میں ہم نے اسے کیا دیا یعنی نہ

کہ چند سال کے اندر یہ طاغوتی قوتوں کا ایک مظہر ہو کر رہ گیا، ذاتی حصول کے لالچ کا پابند ہو کر رہ گیا۔ دراصل ایمانداری کی بات یہ ہے کہ پورے نظام کا پورا محاسبہ کئے بغیر محض چند بکریاں پچاٹ کران کی گردن کاٹنے سے معاشرہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ چند بکریاں کاٹنے سے سوائے اس کے کہ دوسری بکریاں وہاں آجاتی ہیں کوئی مطلب حل نہیں ہوتا۔ لہٰذا پورے کے پورے معاشرے میں جہاں جہاں غلطیاں ہیں ان کو ہمیں ایمانداری سے خود کردہ تسلیم کرتے ہوئے ٹھیک کرنا چاہیے۔ یہ خود فریبی ہے کہ ہم اپنے ضمیر کی تمام ملامت کسی اور پر پھینک کر آسودہ ضمیر ہو جائیں، خواہ وہ اس ملامت کا مستحق ہو یا نہ ہو۔

سیمینار کے شرکاء

آئیڈیالوجی میں جدیدیت کی رُوح پھونکنے کی ضرورت

جناب بختیار حسین صدیقی

پاکستانی آئیڈیالوجی اسلام کی آئیڈیالوجی ہے۔ اسلام کسی خاص فرقے، گروہ یا خطۂ زمین کا مذہب نہیں ہے۔ مذہب صرف طاعت وعبادت پر زور دیتا ہے۔ یہ صرف خدا سے ہمارا رشتہ استوار کرتا ہے۔ دنیا میں رہنے کے اصول ہمیں نہیں سکھاتا۔ اسی لئے قرآن نے اسلام کو دین کہا ہے، مذہب نہیں کہا ہے۔ دین کی حیثیت سے اسلام ہماری زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔ یہ اُخروی اور دنیوی دونوں امور میں ہماری رہبری کرتا ہے۔ جہاں یہ نماز، روزے، زکوٰۃ، حج اور دیگر عبادات پر زور دیتا ہے، وہاں ماں باپ، اہل وعیال، عزیز واقارب، ہمسایوں، دوستوں اور دوسرے انسانوں کے حقوق ادا کرنے پر بھی زور دیتا ہے۔ خدا کے حقوق ادا کرنے میں اگر ہم سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو اس کے لطف وکرم سے امید ہے کہ وہ ہمیں معاف کر دے گا، لیکن بندوں کے حقوق ادا کرنے میں اگر ہم سے کوئی فروگزاشت ہو جائے تو وہ اس وقت تک ہمیں معاف نہیں کرے گا جب تک وہ بندہ خود ہمیں معاف نہ کر دے۔ پس اسلام کی رو سے حقوق کی دو قسمیں ہیں، ایک حقوق الحق اور دوسرے حقوق العباد۔ پہلی قسم کے حقوق کا تعلق خدا سے ہے، ان میں جدیدیت کی روح پھونکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ دوسری قسم کے حقوق یعنی حقوق العباد جن کا تعلق ہمارے رہن سہن اور عام معاشرتی زندگی سے ہے اور جن کی تنظیم کے لئے قرآن نے ہمیں ایک باقاعدہ قانون دیا ہے، ان میں جدیدیت کی روح پھونکی جا

سکتی ہے۔ اسلام ایسا کرنے کی ہمیں اجازت بھی دیتا ہے۔ اسلامی فقہ کی تاریخ خود اس کی ایک روشن دلیل ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں: "میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے جورس پروڈنس (اصول فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ . . . مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے میلانِ طبع سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔"

جس طرح اسلام ایک دین ہے، مذہب نہیں ہے، اسی طرح اس کے مخاطب کسی خاص خطۂ زمین یا کسی خاص زمانے کے لوگ نہیں ہیں۔ یہ ایک عالمگیر دین ہے جو تمام نوعِ انسانی کی رہبری کا دعویٰ کرتا ہے اور ہر جگہ اور ہر زمانے کے لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھاتا ہے۔ اپنی اسی عالمگیریت کی بنا پر وہ تقلید کے ساتھ ساتھ اجتہاد کی ضرورت پر بھی زور دیتا ہے، جس کے بغیر کسی بھی آئیڈیالوجی میں جدیدیت کی روح نہیں پھونکی جا سکتی۔ قرآن بار بار کہتا ہے: "تو پھر تم مشاہدہ کیوں نہیں کرتے؟"، "تم غور کیوں نہیں کرتے؟"، "تم سوچتے کیوں نہیں؟"، "کیا تم عقل نہیں رکھتے؟"، "وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے جانوروں سے بدتر ہیں۔"

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس اعتبار سے اسے صرف خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت پر زور دینا چاہیئے تھا لیکن محض تقلید کو اسلام نے کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ غور و فکر، عقل و شعور سے کام لینے پر بھی زور دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک معتدل اور روشن خیال معاشرے کی تشکیل کرنا چاہتا ہے اور یہ مقصد محض اندھی تقلید سے پورا نہیں ہو سکتا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ ان بدلے ہوئے حالات میں وسیع مفہوم میں اسلامی تعلیمات کو سمجھنا نہایت ضروری ہے اور یہ کام صرف عقل انجام دے سکتی ہے۔ تقلید انسان کو تنگ

نظر بناتی ہے اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ عقل سے نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور سوچ میں گہرائی جس کے بغیر کوئی معاشرہ مادی اور روحانی حیثیت سے ترقی نہیں کر سکتا۔ اسلام چونکہ ہر زمانے کے لوگوں کی رہبری کا دعویٰ کرتا ہے اس لئے وہ تقلید کے ساتھ ساتھ تفکر اور اجتہاد پر بھی زور دیتا ہے۔ تقلید کے تنگ و تاریک راستے کو غور و فکر کے ذریعے کشادہ و روشن کئے بغیر کوئی قوم سائنس اور ٹیکنالوجی کی تیزی سے بدلتی ہوئی اس دنیا میں اپنا اصل مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ فرانسیسی مستشرق شوان SCHUON نے مشرق اور مغرب کے تمدنوں کے زوال کی جو وجہ بیان کی ہے وہ اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے وہ لکھتا ہے "تمام تمدن تباہ ہوئے ہیں لیکن ان کی تباہی مختلف طریقوں سے ہوئی ہے۔ مشرق کی تباہی انفعالی ہے اور مغرب کی تباہی فعّالی ACTIVE تباہ شدہ مشرق کا قصور یہ ہے کہ اس نے سوچنا بالکل چھوڑ دیا ہے اور تباہ شدہ مغرب کی غلطی یہ ہے کہ وہ سوچتا بہت ہے اور غلط سوچتا ہے۔ مشرق حقائق پر سو رہا ہے اور مغرب غلطیوں پر غلطیاں کئے جا رہا ہے"۔

اسلام کی روح و کمال اعتدال اور توازن ہے۔ رسول اکرم کا ارشاد ہے کہ ہر معاملے میں درمیان کا راستہ ہی خیر کا راستہ ہے۔ قرآن افراط و تفریط دونوں سے ہمیں روکتا ہے۔ وہ نہ نری تقلید پر زور دیتا ہے اور نہ محض اجتہاد پر بلکہ ان دونوں کے کامیاب امتزاج پر زور دیتا ہے۔ تقلید و اجتہاد، تنگ نظری اور روشن خیالی دونوں کو اپنے اندر سموئے بغیر ہم آج کی دنیا میں اسلامی تعلیمات کی ابدیت اور عالمگیریت کو ثابت نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے اور اسی لئے آج اسلامی دنیا پر چاروں طرف جمود و انحطاط طاری ہے۔

جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے اسلام انسان دوستی کی ایک تحریک ہے اس نے حریت و مساوات، باہمی محبت اور اخوت، سماجی تنظیم اور معاشرتی انصاف کی بنیاد پر مدینے میں ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جس کی اعلیٰ ترین تخلیقی صلاحیتیں قانون کی ترتیب و تدوین میں ظاہر ہوئیں۔ فان کریمر VON KREMER لکھتا ہے: "رومیوں کے بعد عرب ہی وہ قوم ہیں جو اس امر کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کے پاس اپنا ایک مخصوص اور بڑی خوبی اور محنت سے تیار کیا ہوا نظام قانون موجود ہے"۔ غور طلب بات یہ ہے کہ کیا روحانی اساس پر استوار یہ ابدی قانون جامد ہے؟ کیا یہ مزید نشو و نما کے قابل نہیں؟ کیا اس میں جدیدیت کی روح نہیں پھونکی جا سکتی؟ اسلامی فقہ کی تاریخ کم از کم اس خیال کی ہرگز تائید نہیں کرتی۔ پہلی صدی ہجری کے وسط سے لے کر چوتھی صدی ہجری کے آغاز تک عالم اسلام میں فقہ و قانون کے کم از کم انیس مذاہب ظہور میں آئے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے فقہا نے ایک بڑھتے ہوئے تمدن کی ضروریات کے پیش نظر کس سعی و جد و جہد سے کام لیا۔ علامہ اقبال نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "فتوحات میں توسیع اور اضافے کے ساتھ ساتھ جب عالم اسلام کے مطمح نظر میں بھی وسعت پیدا ہوئی تو اس سے فقہائے متقدمین کو بھی ہر معاملے میں وسعت نظر سے کام لینا پڑا۔ وہ مجبور ہو گئے کہ جو قومیں اسلام قبول کر رہی ہیں ان کے عادات و خصائل اور مقامی حالات کا مطالعہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس وقت کی سیاسی و ملّی تاریخ کی روشنی میں ہم ان مذاہب فقہ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے سلسلۂ تعبیر و تاویل میں استخراج DEDUCTION کی بجائے رفتہ رفتہ استقرائی منہاج INDUCTIVE METHOD اختیار کرتے چلے گئے۔

اسلامی قانون کی اساس روحانی ہے اور اس لئے ابدی لیکن یہ ابدیت اقبال کے نزدیک تغیر و تنوع کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جس معاشرے کی بنیاد حقیقتِ مطلق کے اس تصور پر ہو اس

کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر دونوں خصوصیات کا یکساں طور پر لحاظ رکھے۔ اس کے پاس ضرور کچھ ایسے اصول ہونا چاہئیں جو اجتماعی زندگی میں نظم و ضبط قائم رکھیں کیونکہ ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں ہم اپنا قدم مضبوطی سے جما سکتے ہیں تو ان ہی کی بدولت۔ لیکن یہ ابدی اصول تغیر و تبدیلی کے امکانات کو بالکل ختم نہیں کر دیتے کیونکہ تغیر قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نشانی ہے، جسے نظر انداز کر کے ہم اس شے کو جس کی فطرت ہی حرکت ہے، حرکت سے عاری کر دیں گے۔

پس اسلامی قانون جامد نہیں۔ وہ حرکت کی نفی نہیں کرتا وہ تغیر پذیر ہے اس میں جدیدیت کی روح پھونکی جا سکتی ہے اور اس لئے وہ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے یہ حرکت و تغیر یعنی جدیدیت کی روح پھونکنے کا عمل جس اصول کے تحت واقع ہوتا ہے، اسلامی فقہ میں اس کا نام اجتہاد ہے۔

اجتہاد کے لغوی معنی سعی، جہد، مشقت اور کوشش کے ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد ہے کسی معاملے میں شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے غور و فکر، استدلال و استنباط کی صلاحیتوں کو استعمال کرنا۔ ابوبکر رازی نے اجتہاد کے تین معنی بتائے ہیں ایک یہ کہ کسی شرعی حکم کی وجہ معلوم کر کے اس سے دوسرے نتائج اخذ کرنا جو لازماً اس سے نکلتے ہوں۔ دوسرے یہ کہ کسی شرعی حکم کی وجہ معلوم کرنا مقصد نہ ہو بلکہ صرف اندازے یا ظنِ غالب کی بنا پر کوئی بات طے کرنا مقصود ہو مثلاً قبلے کی سمت یا وقت کا تعین کرنا تیسرے یہ کہ مسلمہ اصولوں کے ذریعے جزئیات تک رسائی حاصل کرنا۔ علامہ آمدی کے نزدیک اجتہاد کے معنی ہیں احکام شرعیہ میں سے کسی چیز کے بارے میں ظن غالب حاصل کرنے کے لئے پوری پوری کوشش کرنا اور سر کھپانا کہ اس سے زیادہ اس پر غور و خوض ممکن نہ ہو۔

اجتہاد کی اساس قرآن پاک کی ان آیات پر ہے: جو لوگ خلوص سے کوشش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دیتا ہے۔ اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو۔ اے مومنو! اگر کسی معاملے میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔

قرآنی آیات کے علاوہ کئی احادیث بھی اجتہاد کے جواز میں ملتی ہیں۔ روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے جب حضرت معاذ کو یمن کا عامل مقرر کیا تو فرمایا کہ معاملات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ انہوں نے کہا، کتاب اللہ کے مطابق۔ لیکن اللہ کی کتاب نے ان میں تمہاری رہنمائی نہیں کی تو پھر؟ آپ نے کہا۔ پھر اللہ کے رسولؐ کی سنت کے مطابق۔ انہوں نے جواب دیا۔ لیکن اگر سنت رسولؐ بھی ناکافی ٹھہری تو۔ آپ نے کہا: پھر میں خود ہی کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔ حضرت معاذ نے جواب دیا۔ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے۔ اجتہاد کرو کیونکہ جو شخص جس کام کے لئے پیدا کیا جاتا ہے، اللہ وہ کام اس کے لئے آسان کر دیتا ہے۔ جب کوئی حاکم فیصلہ دینے میں صحیح اجتہاد کرے تو اس کے لئے دو اجر ہیں اور اگر اس نے اپنے اجتہاد میں غلطی کی تو اس کے لئے ایک اجر ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قول ہے: میں اس شخص کے بارے میں جو مرنے کے بعد وارث نہ چھوڑے اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہوں۔ پس اگر میری رائے صحیح ہو تو توفیق الٰہی ہے اور اگر وہ غلط ہو تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا۔ عمر یہ نہیں جانتا کہ اس نے حق کو پا لیا لیکن اس نے اپنی سعی میں کوتاہی نہیں کی۔

اجتہاد ایک نہایت مشکل کام ہے۔ اس کے لئے شریعت کا گہرا مطالعہ ضروری ہے اور ان حالات سے بھی اچھی طرح واقف ہونا لازمی ہے جن کے بارے میں شریعت کا حکم معلوم کرنا مقصود ہو۔ اجتہاد کسی خاص طبقے یا گروہ (اسلام میں عیسائیت کی طرح مذہبی پیشوائیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں) کی اجارہ داری نہیں ہے لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ ہر کس و ناکس اجتہاد کا اہل ہے۔ فقہ کی کتابوں

میں اس کے بارے میں جو شرائط بیان کی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ اجتہاد کا اہل وہ شخص ہے جس کو قرآن اور حدیث پر پورا پورا عبور حاصل ہو، اس کا اصل مقصد کسی معاملے میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہے نہ کہ شرعی امور میں فکر و استدلال کی کھلی آزادی دینا۔

۲۔ مجتہد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ معاملات اور حالات کی تہہ تک پہنچنے والا ہو اور ان کے دور رس نتائج پر نظر رکھتا ہو۔

۳۔ وہ اخلاق و سیرت کے اعتبار سے قابلِ اعتماد شخص ہو تاکہ لوگ دین کے معاملے میں اس پر بھروسہ کر سکیں۔

اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسان برابر نت نئے مسائل سے دوچار رہتا ہے اور اگر شریعت کی روشنی میں ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو ہماری زندگی کا شریعت سے ربط ٹوٹ جائے گا جس کو کوئی مسلمان ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ ہمیں اپنی بقا کے لئے اجتہاد کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ ہوا اور پانی کی۔ پہلی صدی ہجری کے وسط سے لے کر چوتھی صدی ہجری کے آغاز کے فقہا نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اس زمانے میں فقہ و قانون کے کم از کم انیس مذاہب وجود میں آئے جن میں سے امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام حنبلؒ کے مذاہب زیادہ مشہور ہوئے۔ ان فقہا نے ایک مبسوط اور مدلل نظام قانون مرتب کیا جو پروفیسر گب GIBB کے الفاظ میں، انسانی فکر و استدلال کا ایک شاندار مظہر ہے۔ تقلید پرست علما نے اس خیال سے کہ کہیں غیر اسلامی افکار اسلامی نظام قانون میں نہ داخل ہو جائیں، رفتہ رفتہ اجتہاد کے دائرے کو محدود کیا اور ایک وقت آیا کہ انہوں نے اعلان کر دیا کہ اب اسلامی قانون میں کوئی خلا باقی نہیں رہا اور اگر ہے تو نہ ہونے کے برابر۔ اس طرح انہوں نے اجتہاد کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے۔ مفکر پاکستان علامہ اقبالؒ علمائے اسلام کی اس رائے سے متفق نہیں۔ ان کے

خیال میں قرآن پاک نے جن اصولوں پر قانون کی بنیاد رکھی ہے ان سے نہ تو فکرِ انسانی پر کوئی روک عائد ہوتی ہے، نہ وضع آئین و قانون پر۔ اس کے برعکس ان میں جو وسعت، رواداری اور گنجائش موجود ہے اس سے ہمارے غور و فکر کی صلاحیتوں کو اور بھی تقویت ملتی ہے: "اس میں کوئی شک نہیں کہ فقہائے متقدمین نے بڑے جامع اور ہمہ گیر نظاماتِ قانون پیش کئے لیکن یہ نظامات فقہ بالآخر افراد ہی کی ذاتی تاویلات کا نتیجہ ہیں اور اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان پر قانون کے نشوونما کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ . . . . . . ائمہ مذاہب (فقہ) کا کیا یہی دعویٰ تھا کہ ان کے استدلال اور تاویلات حرف آخر ہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ قرآن پاک کا یہ ارشاد کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے بجائے خود اس امر کا مقتضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے، یہ نہیں کہ اسے اپنے لئے ایک رکاوٹ تصور کرے۔"

اجتہاد وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسلامی تمدن میں اگر جدیدیت کی روح پھونکی جا سکتی ہے تو اسی کے ذریعے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اقبال یہ بھی نہیں چاہتے کہ اجتہاد کے جوش میں ہم اصلاح کی جائز حدود سے تجاوز کر جائیں۔ چنانچہ وہ ہمیں خبردار کرتے ہیں کہ "زندگی محض تغیر ہی نہیں، اس میں حفظ و ثبات کا بھی ایک پہلو موجود ہے۔ . . . . زندگی چونکہ ماضی کا بوجھ اٹھائے آگے بڑھتی ہے، اس لئے ہمیں چاہیے کہ معاشرے میں تغیر و تبدیلی کا جو نقشہ ہم نے قائم کیا ہے، اس میں قدامت پرستی کی قوتوں کی قدر و قیمت . . . . . فراموش نہ کریں۔" اس مضمون کو اشعار میں انہوں نے اس طرح پیش کیا ہے۔

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید — مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب — کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

اسلام میانہ روی کا ایک دین ہے۔ وہ ہر معاملے میں اعتدال، توازن اور ہم آہنگی پر زور دیتا ہے۔ وہ نہ محض تقلید کا حکم دیتا ہے اور نہ فقط اجتہاد کا۔ اس لیے ثبات و تغیر، تقلید و اجتہاد دونوں کو اپنے اندر سمو کر ہی ہمیں اس کی معاشرتی تعلیمات میں جدیدیت کی روح پھونکنی ہوگی۔

اسلام کے قانونی تصورات میں سب سے زیادہ اہم اجماع کا تصور ہے۔ لغوی اعتبار سے اجماع کے دو معنی ہیں، ایک عزم و ارادے کی استواری کے، دوسرے اتفاق رائے کے۔ امام غزالیؒ کے نزدیک اجماع میں دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ علامہ سمعانی اور ابن برہان کے خیال میں گو مناسب بات یہی ہے کہ اس میں عزم کی پختگی نمایاں اور غالب ہو لیکن فقہی اغراض کے پیش نظر اتفاق و تائید کے معنی زیادہ بہتر رہیں گے۔ اصطلاح میں اجماع کے معنی یہ ہیں کہ کسی زمانے میں تمام مجتہدین کسی امر دینی پر متفق ہو جائیں۔ اس کے شرعی دلیل ہونے کے حق میں فقہا نے حسب ذیل دلائل دیئے ہیں۔

قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ ”اے مومنو! اگر کسی مسئلے میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔“ اس آیت سے ضمناً یہ بھی معنی نکلتے ہیں کہ اختلاف ہونے کی صورت میں اجماع امت شرعی دلیل کی حیثیت سے قابل قبول ہے۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے ”میری امت غلط بات یا گمراہی پر مجتمع نہ ہو گی۔“ ”جماعت کے ساتھ اللہ کی تائید ہوتی ہے۔“ اس کے علاوہ کسی زمانے کے تمام مجتہدین کا کسی غلط فیصلے پر متفق ہو جانا عادتاً اور عقلاً ناممکن ہے۔

اجماع اجتہاد کا تکمیلی جزو ہے۔ اجتہاد ہمیں اپنے زمانے کے مسائل کو حل کرنے کے لئے اسلامی قانون کی تاویل کا حق دیتا ہے لیکن اس تاویل کو قانونی حیثیت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ تمام مجتہدین وقت اس تاویل پر متفق نہ ہو جائیں۔ اجتہاد ایک تخلیقی اصول ہے اور اجماع ایک تائیدی دلیل۔ اجماع میں جمہوریت کی روح جلوہ گر ہے کیونکہ یہ اتفاق

رائے کو قانون سازی کی اساس قرار دیتا ہے۔

اجتہاد اور اجماع دونوں مل کر اسلامی قانون کی مزید نشوونما کی ضمانت دیتے ہیں۔ یہی حرکت اور تغیر کے وہ اصول ہیں جن کے ذریعے علامہ اقبالؒ اسلام کے قانون، اس کی تعلیم، اس کے تمدن میں زندگی کی ایک نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں اور اس طرح نہ صرف ان کو اسلام کی اصل روح بلکہ جدید تہذیب کے بھی قریب لانا چاہتے ہیں جسے سائنس اور ٹیکنالوجی نے جنم دیا ہے۔

دشمن سے چوکس رہنے کی ضرورت ہے

پروفیسر وارث میر

عہد حاضر میں جنگ دو محاذوں پر لڑی جاتی ہے۔ فوجی محاذ اور تہذیبی و نظریاتی محاذ پر اور ان دونوں محاذوں پر دشمن سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی حکمت عملی بھی دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک پہلو یہ کہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کیا جائے اور دشمن کی یلغار روکنے کے لیے، تمام وسائل جنگ کو مجتمع کیا جائے اور دوسرا پہلو یہ کہ دشمن کی جنگی چالوں اور ہتھیاروں کا علم حاصل کر کے پیش بندی کی جائے۔ قیام پاکستان کے سال سے لے کر موجودہ بحرانی سال تک اہلِ سیاست و اہلِ قلم تہذیبی و نظریاتی محاذ پر، تحفظ پاکستان کی حکمت عملی کے ایک پہلو پر تو بڑی دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ گفتگو کرتے رہے ہیں کہ تعلیمی اداروں میں تاریخ، فلسفہ، سیاسیات، اقتصادیات، عمرانیات اور ادب کے نصابات کو غیر ملکی استعماری طاقتوں کے اثر و نفوذ سے پاک کر کے، پاکستانی اقدار و نظریات کی روشنی میں از سرِ نو مرتب کرنا چاہیے۔ لیکن اس حکمت عملی کے دوسرے پہلو یعنی دشمن کی چالوں اور سازشوں سے آگاہ ہونے کی ضرورت پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

ہم نظریۂ پاکستان اور اسلام کا نعرہ متواتر اور مسلسل لگاتے رہے۔ شاید ہماری نیتوں کا فتور تھا کہ یہ نعرہ بلند ہو ہو کر ہوا میں تحلیل ہوتا رہا اور دشمن اندر ہی اندر جسدِ ملی میں فساد و اختلاف کے جراثیم داخل کرتا رہا اور اب اس انت پر وہ وقت

آن پڑا ہے کہ دعا کے لیے اُٹھے ہوئے ہاتھ تھک چکے ہیں، آنکھیں پشیمانی کے آنسو بہا بہا کر ویران ہو چکی ہیں، سجدے تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے پڑ چکے ہیں لیکن درِ توبہ وا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ ہم نے عرفانِ ذات کے بڑھ بڑھ کر دعوے کیے لیکن اپنے دشمن کا شعور حاصل کرنے کی کوئی سعی نہ کی اور اسی بے شعوری کے عالم میں دشمن ہمیں گھائل کر گیا۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ تاریخ کے موضوع پر عہدِ انگلشیہ میں لکھی گئی نصابی کتب میں اکثر مسلمان بادشاہوں کی شخصیت اور کارناموں کو مسخ کیا گیا ہے اور آزادی حاصل کرنے کے بعد نئی نسل کو یہ بتانا ضروری ہو جاتا ہے کہ محمود غزنوی لٹیرا نہیں تھا۔ علاؤ الدین خلجی صرف خوبصورت ہندو عورتوں کو حاصل کرنے کے لیے دوسرے راجاؤں پر حملہ آور نہیں ہوتا تھا اور اورنگ زیب کو متعصب اور متشدد مسلمان بادشاہ ثابت کرنا۔ تاریخ کا بہت بڑا جھوٹ ہے۔ تاریخ پر نئی لکھی جانے والی کتابوں میں شاید ہم نے بے دلی کے ساتھ اور کسی سائنٹفک کوشش کے بغیر، اِدھر اُدھر ہندو اور انگریز کی ان تاریخی افترا پردازیوں اور غلط بیانیوں کا ذکر بھی کر دیا ہے لیکن ہم نے ہندوستان کے تاریخی پس منظر اور ہندو کے قومی مزاج پر جدید تحقیق کو ابھی تک تاریخ کی نصابی کتابوں کا حصہ نہیں بنایا۔ مثال کے طور پر، تاریخ کے کتنے طالب علموں بلکہ استادوں کو علم ہے کہ ہندو نہ کبھی ایک قوم تھے اور نہ اب ہیں اور "ہند" کی شہرت میں آج کے بھارت کا ذرہ برابر حصہ نہیں رہا۔ بھارت یعنی وادی گنگا و جمنا ایک ایسا غیر معروف علاقہ اور تہذیبی لحاظ سے ایک ایسا بند اور متعفن جوہڑ رہا جس کا بیرونی دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اہلِ فارس اور اہلِ یونان اسے جانتے تک نہیں تھے۔ ایک آریائی قبیلے کے نام پر، ایک محدود سے علاقے

یعنی یو۔پی کے مغربی اور پنجاب کے چند مشرقی اضلاع کا نام بھارت ہوگیا۔ زمانے کے حوادث اور ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد نے غیر مسلموں اور ہندوؤں کو ہم معنی بنا دیا اور ہندو وادیٔ سندھ یعنی مغربی پاکستان کی تاریخ بھی چرانے میں کامیاب ہوگئے اور آج وہ لوگ بھی ہندو کہلاتے ہیں جو بت پرست ہیں اور وہ بھی جو ایک خدا کو مانتے ہیں اور وہ بھی جو سرے سے خدا کو نہیں مانتے۔ جواہر لال نہرو کہا کرتا تھا

"ہندو مت میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں۔ چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور اعمال کچھ ہی ہوں۔"

ڈھاکہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ نفسیات و فلسفہ پروفیسر جی سی دیو ASPIRATIONS OF THE COMMON MAN جیسے عنوانات کے تحت، سال ہا سال تک نوجوان بنگالی مسلمانوں میں ایک دنیا، ایک مذہب اور ایک تہذیب کا زہر گھولتا رہا اور ہمیں اس کی زہر چکانیوں کا علم اس لیے نہ ہو سکا کہ ہمارا طالب علم ہندو فلسفیوں کے ذہن کی چلتر بازیوں سے بے خبر تھا اور تحریک پاکستان کے ایام میں ہم بڑے بڑے مسلمان ادیبوں اور شاعروں کی بے حسی اور پاکستان دشمن تحریروں پر حیران اس لیے ہوتے تھے کہ ہم نے ہندو ادیبوں اور شاعروں کی "وطن پرستی" میں پوشیدہ اسلام دشمنی کے وہ گہرے منصوبے جاننے کی کوشش نہ کی جو اس وقت تک ایک منظم تحریک کی صورت اختیار کر کے مسلمانوں کے ذہن و جسم میں اپنا ڈنک چھوڑ چکے تھے۔

ہمیں گاندھی سے بھی واسطہ پڑا جو قائد اعظمؒ کے الفاظ میں "جو کچھ زبان سے کہتا تھا، دراصل اس کا مقصد نہیں ہوتا تھا۔ اصل مقصد کو وہ کبھی زبان پر نہ لاتا تھا۔" وہ ایک ایسا سانپ تھا جس کے سینکڑوں منہ تھے اور ہر منہ میں الگ الگ زبان بولی جاتی

تھی۔ پرانی نسل نہرو کو بھی جانتی تھی، جو ایک طرف تو تقسیم ہند کے فیصلے پر دستخط کر رہا تھا اور دوسری طرف کنکھیوں سے اپنے ہندو ساتھیوں کو ڈھارس بندھا رہا تھا کہ تقسیم ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے۔ اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا کسی اور طریقے سے ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں گے جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں گے کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجیے۔ نئی نسل کی بدقسمتی کہ پرانی نسل کے ان تجربات کو ہندو فلسفۂ سیاست کے عملی مظاہر کے طور پر محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا اور اس کوتاہی کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

یہ حقیقت بہرحال تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ گزشتہ چند صدیوں میں علم سیاسیات کے عملی و نظری پہلوؤں کی بھرپور اور مکمل نشوونما یورپ میں ہوئی ہے اور یورپ میں اس علم کی تاریخ، ارتقا و عروج کے مطالعہ کے بغیر سیاسیات کے موضوع پر کوئی شخص "مستند" اور "قابل اعتماد" رائے دینے کا مدعی نہیں ہو سکتا لیکن کسی ملک کی اہم ترین اور فوری ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنے قریب ترین ہمسایہ ملک کی سیاسی نفسیات کو سب سے پہلے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔ بھارت ہمارا قریب ترین ہمسایہ ملک ہے۔ اس کے اور ہمارے درمیان کئی تنازعات ہیں۔ ان تنازعات کی وجہ سے کئی خونریز جنگیں بھی ہو چکی ہیں اور حال ہی میں بھارت کی گھناؤنی سازش کی بدولت پاکستان ختم ہوتے ہوتے بچا ہے۔ بھارت کا فکر و عمل پاکستانی قوم کی سیاسیات، اقتصادیات، نظریات اور جذباتی زندگی پر ہمیشہ اثر انداز ہوتا رہے گا۔ لہٰذا پاکستانی قوم کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ دوسرے عصری نظریات پر نظر رکھے، وہاں اس کی اوّلین

ضرورت یہ بھی ہے کہ وہ بھارت کے سیاسی ذہن و فلسفہ سے مکمل آگاہی حاصل کرے اور ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لیے ہماری نگاہ درسگاہوں کی طرف اٹھتی ہے کہ وہ ہندو فلسفے کی مکمل، جامع اور تجزیاتی انداز میں تعلیم و تدریس کا خاص طور پر اہتمام کریں۔ جنگ کا زمانہ ہو یا امن کا دور، ہمارے طالب علموں کے لیے ہندو سیاسی فلسفے کی تعلیم اشد ضروری ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں نے سیاسیات کے نصاب میں مسلمانوں کے سیاسی فلسفہ کا معتدبہ حصہ شامل کر رکھا ہے اور طالب علموں پر اسلامی تصورِ حکومت و سیاست کسی حد تک واضح ہو جاتا ہے لیکن ہمارے طالب علموں کے ذہن ہندو فکر، تہذیب اور سامراج کے اس مزاج سے بالکل نا آشنا ہوتے ہیں، جس کے متعلق ایک امریکی مصنف نارتھراپ نے کہا ہے کہ منو کی سیاستِ اقتدار کے آگے میکیاولی کی یہ حیثیت ہے، جیسے ایک ننھی منی چرواہن میمنے کو اپنی گود میں کھلا رہی ہو اور میکیاولی نے اپنے سیاسی صحیفہ "دی پرنس" میں اپنا نظریۂ سیاست بیان کرتے ہوئے یوں لکھا ہے۔

"بادشاہ کے لیے صفتِ روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ دجل و فریب کے جال بچھا سکے۔ اس کے ساتھ خوئے شیر بھی تاکہ وہ بھیڑیوں کو خائف رکھ سکے۔ عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب دیکھے، کوئی عہد یا معاہدہ اس کے اپنے مفاد کے خلاف جاتا ہے یا جن وجوہ کے پیشِ نظر وہ معاہدہ کیا تھا، وہ باقی نہیں رہیں تو اسے بلاتامل توڑ ڈالے۔" پاکستانی طالب علم مغرب کے سیاسی افکار کا مطالعہ کرتے وقت جب میکیاولی تک پہنچتا ہے اور اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے بڑے بڑے فرماں روا دی پرنس کو مقدس کتاب کی حیثیت سے سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے اور عصرِ حاضر کے سیاسی مدبرین اور سیاسی رہنماؤں کے اعمال و افعال کا منبع میکیاولی ہی ہے۔

تو اس کے قلب و ذہن پر میکیاولی کی "عظمت" کا نقش گہرا ہو جاتا ہے لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے کہ اس کے ہمسایہ میں ایک ایسی قوم آباد ہے جس کی فکر، سیاست اور تہذیب و ثقافت کی بنیاد، میکیاولی سے بہت پہلے نسبتاً "زیادہ مکارانہ اصول پر اٹھ چکی ہے اور آج پاکستان کو اسی قوم کا سامنا ہے" تو پھر کیا یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ پاکستانی طالب علموں کو کوٹلیہ عرف چانکیہ جی مہاراج اور منوجی مہاراج کے اندازِ فکر سے آگاہ کیا جائے کہ ان کے نزدیک جو بھی طاقت پکڑ جائے وہ صلح و امن کے معاہدے توڑ سکتا ہے۔ یقین کرنا چاہیے کہ برہمنی فلسفۂ سیاست کے مطالعہ کے بعد میکیاولی کی "مکارانہ عظمت" ان کی نظروں میں کم ہو جائے گی۔ منوجی مہاراج کے اشلوکوں کی روشنی میں بھارتی حکومت کی داخلی اور خارجی پالیسیوں پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالیے تو یہ چیز اظہر من الشمس ہو جائے گی کہ وہ منوجی مہاراج کی فاتحانہ توسیع پسندی اور مجنونانہ فریب شعاری کی تعلیمات پر فکر و عمل کی پوری قوتوں کے ساتھ عمل پیرا ہے اور اس کا اعتراف "آبزرور" لندن نے ۴ نومبر ۱۹۶۲ء کے ایک اداریہ میں یوں کیا ہے، کہ "ہندوستان کے لوگ بالعموم دوہرا معیار رکھتے ہیں۔ ایک طرف باہر کی دنیا میں سامراج کی مخالفت کرتے ہیں اور اس پر غم و غصے کا اظہار اور دوسری طرف خود اپنی تاریخی سرحدات کے آس پاس موقع و وقت کی مناسبت سے تھوڑی بہت سامراجیت کے لیے ہمہ وقت تیار۔"

قدیم ہندو فلسفہ کے مطالعہ سے اس حیران کن حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ ڈانڈا (طاقت) کے استعمال پر مسلسل زور دیا گیا ہے اور تمام انتظامی و اقتصادی مسائل کا حل "طاقت" میں تلاش کیا گیا ہے مثلاً بدنظمی اور انتشار ختم کرنے کے تین ذرائع کا

خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔ (۱) ڈانڈا (طاقت) (۲) دھرم (مذہب) (۳) راجہ (بادشاہ) طاقت کا تصور ہندو فلسفہ کی روح اور نچوڑ ہے۔ تمام قدیم ہندو مفکرین راجہ کو "ڈانڈا" کے استعمال کے مکمل اختیارات تفویض کرنے پر متفق نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک طاقت کے استعمال کے بغیر انسانی زندگی میں قانون، امن اور نظم و نسق کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ طاقت ہی دھرم کو قائم رکھ سکتی ہے اور طاقت ہی راجہ کی حفاظت کر سکتی ہے۔ چارلس ڈریکمیئر نے قدیم ہندو فلسفیوں کے فلسفۂ طاقت کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا ہے "مہا بھارت اور منو سمرتی اس بات کا اعلان کرتی ہیں کہ معاشرہ اس وقت منظم ہوتا ہے جب بادشاہ کے پاس سزا دینے کے وسیع اختیارات موجود ہوں۔ طاقت سے ہی حکومت کی جا سکتی ہے اور طاقت کے سہارے ہی اپنے آپ کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے اور کیوں کہ طاقت کے بغیر دھرم کی حفاظت نہیں کی جا سکتی لہٰذا دھرم، طاقت ہی کا ایک "عملی رخ" ہے"۔ ہندو قوم کی تاریخ اس حقیقت کا واشگاف اعلان کرتی ہے کہ اس کے معاشرتی و سیاسی ڈھانچوں کا آغاز مطلق العنانیت سے ہوا ہے۔ افراد قبیلہ کی زندگی، ضمیر اور وجود پر قبیلے کے سردار کے مکمل تسلط پر کسی کو دخل اندازی کا حق نہیں تھا۔ ویدوں کی بعض روایات کے مطابق قبیلے کے سردار اپنی "اتھارٹی" کو استعمال کرتے ہوئے قصوروار بیٹے کی آنکھیں نکال لیتا تھا یا اسے فروخت کر دیتا تھا۔ آبادی اور ذرائع میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہی سردار بعد میں بادشاہ کی شکل اختیار کرتا گیا اور اسی لحاظ سے اس کے اختیارات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اور چندر گپت موریہ کے وزیر اعظم چانکیہ نے ہندو بادشاہوں کو ان کے (۱) فرائض (۲) انتظامی امور (۳) قانون (۴) خزانہ اور حکمت کو درپیش خطرات کے ازالے (۵) حکومت کی

سیاسی معاشرتی پالیسیوں (۶) فتح حاصل کرنے کے طریقوں (۷) فوجی حکمتِ عملی اور محکمۂ جاسوسی وغیرہ کے سلسلے میں جو مشورے دیے ہیں ان کی روشنی میں قائم کردہ حکومت، جدید سیاسی اصطلاح میں "پولیس سٹیٹ" کا بہترین نمونہ نظر آتی ہے۔ برہمنی فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کا اگر مغربی فلسفۂ سیاست کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ برہمن فلسفہ کا تصورِ طاقت و حکومت، افلاطون، ارسطو، ہابز اور روسو کے نظریات کا امتزاج ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ مغربی فلسفۂ سیاست کے سوتے برہمنی فلسفے سے پھوٹے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں سیاسیات کے طلبا کو جب یہ بتایا جاتا ہے کہ افلاطون نے عدل کی تعریف "طاقتور کا مفاد" کی ہے اور یہ کہ افلاطون نے معاشرے کو تین طبقات میں پیش کیا ہے۔ (۱) ارباب حل و عقد (۲) فوج (۳) اہل حرفہ یعنی کسان، مزدور اور غلام تو آخر ان طلبا کو یہ بتانے میں کیا حرج ہے کہ منوجی مہاراج کی سمرتی میں اشلوک یوں ہے "جو سدا ضرب لگانے کے لیے چوکس رہے، دنیا اس سے خوفزدہ رہتی ہے۔ تو تمام مخلوق کو اپنی قوت سے قبضے میں کر" اور یہ کہ ہندوؤں کے ہاں برہمن کا بیٹا برہمن، کھشتری کا کھشتری اور شودر کا بیٹا شودر (جبکہ افلاطون بعض خصوصی حالات میں استثنا کا بھی قائل ہے کہ کبھی کبھی پست درجہ کی نوع میں خلافِ معمول اچھے دل و دماغ کا بچہ بھی پیدا ہو جاتا ہے) کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جب یہ پڑھایا جا سکتا ہے کہ ہابز کے نزدیک مقتدرِ اعلیٰ اپنے فیصلوں میں کسی آئین و ضوابط کا پابند نہیں۔ اس لیے اس کے فیصلے افرادِ متعلقہ کے لیے ضابطۂ اخلاق و قانون بن جاتے ہیں حتیٰ کہ دوسری مملکتوں کے ساتھ معاملات میں بھی کوئی متفق علیہ

ضابطۂ اخلاق نہیں بلکہ صرف معاہدہ ضروری ہوتا ہے۔ اور تلوار کے بغیر معاہدات خالی الفاظ رہ جاتے ہیں، جن میں اپنی حفاظت کی کوئی قوت نہیں ہوتی۔ لہٰذا مقتدرِ اعلیٰ کی قوت ہی ضابطۂ اخلاق ہے اور ہیگل کا نظریہ IDEALISTIC THEORY کہ مملکت ایک معبود ہے اور مملکت سے وفاشعاری اس معبود کی پرستش۔ مملکت اپنے معاملات میں اخلاقی نظریوں کی پابند نہیں ہے۔ اس کی مصلحت کوشی اور مفاد بینی، خود ایک ضابطۂ اخلاق ہے اور اس ضابطے کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہو سکتی۔" تو آخر انہی یونیورسٹیوں میں منوجی کا یہ فلسفہ طالب علموں کے گوش گزار کیوں نہ کیا جائے۔ "ہمیشہ حملے کی تیاری رکھ، اپنی طاقت کی نمائش کرتا رہ، اپنے راز چھپائے رکھ اور دشمن کی کمزوری کا کھوج لگا۔ بگلے کی طرح یک سوئی سے شکار کو تاڑ، شیر کی طرح وار کر، بھیڑیے کی طرح نوچ اور فرار کے وقت خرگوش کی طرح بھاگ۔ اپنے ہمسائے راجہ کو دشمن اور دشمن کا ساتھی سمجھ۔ ہمسائے کے ہمسائے کو دوست رکھ۔ جو راجہ ان دونوں سے پرے ہو اس کے ساتھ غیر جانبدار رہ۔ جب امکان آئندہ غالب آنے کا اور حال میں کچھ نقصان ہونے کا ہو تو امن کا چرچا کرتا رہ۔ لیکن جب رعایا خوش حال ہو اور تو تنومند ہو تو ضرور جنگ کر۔ جب تیرے رتھ، جانور اور فوجیں کم ہوں تو احتیاط سے خاموش بیٹھ اور رفتہ رفتہ دشمنوں سے صلح اور آشتی کی گفتگو کرتا رہ۔ بیوی کو بچانے کے لیے دولت دے ڈال لیکن اپنی ذات کو محفوظ کرنے کے لیے بیوی اور دولت دونوں دے ڈال۔" میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم کے ماہرین و حکام اور خود حکومت کو فوراً کوئی ایسی صورت تلاش کرنی چاہیے کہ پاکستانی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں "سیاسیات" کے نصاب میں برہمنی فلسفہ کے تجزیے کو بھی شامل کیا جائے تاکہ نئی نسل اپنے قریب ترین اور

دشمن ہمسایہ ملک کی سیاسی نفسیات اور اس کے سیاسی ہتھکنڈوں سے نپٹنے کے لیے ذہنی طور پر ہر وقت تیار رہے۔

آپ شاید یہ کہیں کہ میں نے اسلام، تحریکِ پاکستان اور نظریۂ پاکستان کو نصابی کتب میں ہونے کے ساتھ ساتھ نہرو اندازِ فکر کے تجزیے کو نصاب کا حصہ بنانے کی تجویز پیش کر کے زیادتی کی ہے۔ مختصراً یہی عرض کروں گا کہ غور کیجیے! ہندو ذہن کی تفہیم، تحریکِ پاکستان کو سمجھنے کا نکتۂ آغاز ہے۔

نظریاتی سرحدیں اور ساتواں در

ہر نظامِ فکر اپنے تحفظ کے طریقے اپنے ساتھ لاتا ہے

انتظار حسین

"پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت"۔ یہ بیان اب ہمارا روزمرہ بن چکا ہے۔ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کس طرح ہونی چاہیے۔ اس طرح جس طرح سوویٹ روس نے اپنی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کی ہے۔ یہ نسخۂ شفا بھی اب ہمارا روزمرہ بنتا جا رہا ہے۔ یہ نسخۂ شفا کیا ہے، بریرن واشنگ۔

اسلام آباد یونیورسٹی کی افتتاحی تقریب میں ایک مرتبہ پھر یہ بات یاد دلائی گئی اور اس مرتبہ یاد دلانے والے صدرِ پاکستان تھے کہ درس گاہوں کا یہ فریضہ ہے کہ طلبا کو نظریۂ پاکستان سے روشناس کرائیں اور ایک مرتبہ اس بیان پر تبصرہ پڑھنے میں آیا کہ نظریۂ پاکستان کے تحفظ اور ترویج کے لیے یہاں تعلیمی اور تبلیغی اداروں کو وہی کچھ کرنا چاہیے جو سوویٹ روس کے تعلیمی اور تبلیغی اداروں نے اپنے نظریہ کے تحفظ اور ترویج کے لیے کیا۔

سوال یہ ہے کہ پاکستان کی نظریاتی حفاظت کے لیے ہر پھر کر سوویٹ روس ہی کی مثال کیوں یاد آتی ہے اور ایسا کیوں ہے کہ یہ مثال خاص طور پر ان حضرات کو یاد آتی ہے، جو یوں سوویٹ روس کے نظام کے سخت مخالف ہیں۔ کیا یوں ہے کہ ان حضرات کو درخت ناپسند ہے مگر اس کے پھل کھانے کو ان کا جی چاہتا ہے یا یوں ہے کہ وہ اندر سے سوشلسٹ نظام کے قائل ہو چکے ہیں مگر اس دوا کو وہ اسلام یا نظریۂ پاکستان کے ورق میں لپیٹ کر

ہی حلق سے اتار سکتے ہیں۔

نظریۂ پاکستان کی جڑیں اسلام ہی میں تو بتائی جاتی ہیں۔ اسلام کی تاریخ چودہ سو سال میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس عرصے میں اس نظامِ فکر کے تحت مختلف سرزمینوں میں جاندار معاشروں نے جنم لیا، تعلیمی روایات قائم ہوئیں، نظریاتی ترویج و اشاعت کے ادارے وجود میں آئے۔ یہ کیا بات ہے کہ ہمیں پاکستان کی نشوونما اور تحفظ کے لیے اس پوری تاریخ میں سے کوئی مثال یاد نہیں آتی۔ یاد آتا ہے تو سوویٹ روس کا طریق کار یاد آتا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں نظریاتی تحفظ کا اتنا موثر طریق کار وضع نہیں کر سکا، جتنا موثر طریق کار سوویٹ روس نے وضع کیا۔

ایک نظامِ فکر اپنے تحفظ کے طریقے اپنے ساتھ لاتا ہے، وہ طریقے اسی نظامِ فکر سے جنم لیتے ہیں۔ سوویٹ روس میں نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کے لیے جو مخصوص طریق کار اختیار کیا تھا اور اس حساب سے جو مخصوص ادارے وجود میں آئے، وہ اس مخصوص نظریاتی نظام کی پیداوار ہیں۔ جان ڈین نے سوویٹ نظامِ تعلیم کے بارے میں یہ بات کہی ہے کہ یہ نظامِ تعلیم اپنے لوگوں کو جواب یاد کراتا ہے۔

ایک تعلیم وہ ہوتی ہے جو جواب حفظ کراتی ہے۔ ایک تعلیم وہ ہوتی ہے جو سوال اٹھانا سکھاتی ہے۔ جواب حفظ کرانے والی تعلیم اس خیال سے خوفزدہ رہتی ہے کہ کہیں اس کے مدرسہ تک کوئی ایسی بات نہ پہنچ جائے کہ طالب علم کوئی سوال اٹھا دے۔ اس خوف کے تحت ایک بند دروازوں والی عمارت کی طرح کا معاشرہ جنم لیتا ہے۔

مگر اس معاشرے میں کیا ہوتا ہے یہی کہ ایک طرح کے جواب سب کو حفظ ہوتے ہیں۔ سب ایک ہی لہجہ میں ان جوابوں کو دہراتے رہتے ہیں مگر کسی ایک ذہن میں سوال چھپکے سے

اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ پھر بند دروازوں میں سے ڈاکٹر ژواگو کا مسودہ چوری چھپے نکلتا ہے اور باہر کسی ملک میں چھپ کر مقفل معاشرے پر ایک جامع تبصرہ بن جاتا ہے۔

کیا ہم پاکستان میں اس قسم کا معاشرہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، اسلام کی کونسی روایت ہے، جس کے تحت ہم یہ معاشرہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام تعلیم کا کونسا تصور پیش کرتا ہے۔ ایسی تعلیم، جو ذوقِ جستجو پیدا کرے، تجسس کا مادہ پیدا کرے، انسانی معاملات کے بارے میں حیات و کائنات کے بارے میں سوال کرنا سکھائے۔ یا ایسی تعلیم جو بس سانچے میں ڈھلے ہوئے جواب حفظ کرا دے

اپنی مخصوص تہذیبی روایات اور اخلاقی اقدار کو ملحوظ رکھ کر تعلیم کا ایک نظام وضع کرنا ایک بات ہے اور فکر و احساس کے گرد حصار کھینچنا دوسری بات ہے۔ پہلی بات سمجھ میں آتی ہے اور وہ اسلام کی فکری روایات سے لگا کھاتی ہے۔ اگر ایسا نظامِ تعلیم پاکستان کے اربابِ بست و کشاد تیار کرنے میں ناکام رہے یا انہوں نے دیدہ و دانستہ اس سے پہلوتہی کی تو یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے۔ اس واقعہ کے نتائج اب ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن اس کے ردِ عمل میں موخر الذکر طریقہ کو اپنانا سمجھ میں نہیں آتا۔ اس طریقہ کا تعلق سوویٹ روس سے ہوگا، اشتراکیت سے ہوگا۔ اسلام کی فکری روایت سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ اسلام اور نظریۂ پاکستان کے نام لے کر اس طریقہ کو اختیار کرنے کا مشورہ ایک ناجائز فعل ہے۔ اس طریقہ کار کی تو کسی ایسے ہی فلسفہ کے تحت وکالت کی جا سکتی ہے، جو انسان کو انسان نہیں سمجھتا، مشین سمجھتا ہے۔

مشین سوال نہیں اٹھاتی، بس جواب دیتی ہے۔ بٹن دباؤ اور بنا تلا جواب لے لو۔ ایک REGIMENTED معاشرے میں آدمی مشین بن جاتا ہے۔ اس کے جواب، اس کا عمل اور ردِ عمل ایک مشینی عمل کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ کھلے دریچوں والے معاشرے میں آدمی میں آدمیت آتی ہے۔

ایک شہزادہ ایک دیو کی قید میں تھا۔ اس دیو کے محل میں سات کوٹھڑیاں تھیں۔ دیو نے شہزادے کو چھ کوٹھڑیوں کی کنجیاں دیں اور ہدایت کی کہ چھ در کھولنا، ساتواں در مت کھولنا۔ شہزادے نے چھ در کھولے اور کوٹھڑیوں کے اندر دنیا بھر کی نعمتیں دیکھیں اور مسرور ہوا۔ لیکن شہزادہ آخر آدمی تھا، مشین نہیں تھا۔ اس کے یہاں شوقِ جستجو پیدا ہوا کہ ساتویں در کو کھولو اور اندر کا حال معلوم کرو۔

یہ کہانی ہماری بہترین فکری روایات کی امین ہے۔ کیا ہم اپنی فکری روایات کو فراموش کر کے ایسے آدمی کی پیدائش کا بندوبست کرنا چاہتے ہیں جو ساتویں در کو کھولنے کے شوق سے محروم ہو؟

(بشکریہ روزنامہ "مشرق" ۱۰/ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

جسٹس حمود الرحمان پہلی نشست کی صدارت کر رہے ہیں

خطبۂ صدارت

جسٹس حمود الرحمان

اس نشست کا زیرِ بحث موضوع یہ ہے کہ تعلیم اور نصابی کتابوں کی تیاری کے میدان کی حد تک نظریۂ پاکستان کے استحکام کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں۔ نوجوانوں کے ذہن میں نظریۂ پاکستان کی بنیاد پر اس شعور کو بیدار کرنے کی ضرورت کو قومی تعلیمی کمیشن نے اپنی اس رپورٹ میں جو اس نے ۱۹۵۹ء میں پیش کی، پوری طرح محسوس کیا تھا۔

کمیشن نے اپنی رپورٹ کے باب ۱۲، پیرا ۲ میں واضح طور پر کہا تھا "ایک شہری کو اپنے وطن سے گہری اور پائدار محبت ہونی چاہیے۔ یہ محض ایک جذباتی احساس نہ ہو بلکہ تحریکِ پاکستان کو صحیح معنوں میں سمجھنے کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ اس کے اوصاف یہ ہوں کہ قوم کے ہر فرد کو ماضی پر فخر، حال کے لیے جوش و خروش اور مستقبل پر مستحکم اعتماد ہو اور یہ اس کا پختہ عقیدہ ہو کہ ہر شخص کو قوم کے استحکام اور ترقی کے لئے وہ سب کچھ کرنا فرض ہے جس کا وہ اہل ہے۔ حُبّ الوطنی کی روح قومی یک جہتی کا وہ احساس ہے، جس میں فرد خود کو تمام شہریوں کے مشترکہ جذبات سے ہم آہنگ کرتا ہے اور ان عوامل سے متاثر ہوتا ہے جن کے ذریعے افراد ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں اور ان سے گہرا لگاؤ اور تعلق محسوس کرتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ پاکستان سے اسی طرح وابستہ ہے جس طرح اپنے خاندان سے اور جو کچھ پاکستان پر گزرتی ہے، وہ خود اس پر بیتتی ہے۔"

کمیشن نے اس مقصد کے حصول کے لیے دو سفارشیں کی تھیں۔

(ب) سکول کی سطح پر تعلیمی دن کا آغاز ایک ایسی تقریب سے کیا جائے، جس میں قومی ترانہ گایا جائے اور ایسے مناسب اقتباسات پڑھے جائیں، جن میں پاکستانی قوم کے تصور پر زور دیا گیا ہو۔ سفارش کی جاتی ہے کہ ان جذبات کو مربوط کرنے کے لیے ایک قومی حلفِ وفاداری تیار کیا جائے۔ ہفتے میں ایک مرتبہ تقریب کو اس حد تک پھیلا دیا جائے کہ اس میں قومی پرچم بھی لہرایا جائے۔ کالج کی سطح پر اسی طرح کی ہفتہ وار تقریب منعقد کی جائے لیکن یہ تقریب ان طلبا کی برتر ذہنی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے مرتب ہو۔"

(ج) ایک طویل المیعاد پروگرام تیار کیا جائے، جس کے تحت ہر تدریسی سطح پر اہم قومی واقعات سے متعلق عام مطالعاتی مواد شامل کیا جائے جس میں بنیادی نیکیوں، ذاتی ایثار اور قومی زندگی کی نمایاں خدمات پر زور دیا گیا ہو اور ممتاز محبِ وطن افراد کے سوانحی خاکے بھی شامل ہوں۔ اس سے طلبا کے سامنے وہ نصب العین ہر وقت موجود رہے گا، جس کے حصول کی جدوجہد میں ہم مصروف ہیں۔ اس نوع کا مواد نہ صرف تاریخ اور شہریت کے عام نصابوں میں شامل کیا جائے بلکہ یہ پرائمرز ریڈرز اور ہر جماعت کی ورک بکس یا عملی کتابوں کا بنیادی جزو ہونا چاہیے"

پہلی سفارش پر [illegible] عمل کیا گیا ہے لیکن دوسری سفارش کو بدقسمتی سے ابھی عملی جامہ نہیں پہنایا گیا۔ نصابی کتابوں کی تدوین کے لیے ماہرین کی جو کمیٹیاں تشکیل دی گئیں، اُن کا زیادہ تر تعلق سائنسی کتابوں سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۵ء میں طلبا کے مسائل اور بہبود سے متعلق جو کمیشن تشکیل دیا گیا، اُسے بھی یہ کہنا پڑا کہ ابھی تک ہمارے

نوجوانوں میں اسلام کے اخلاق اور روحانی عقاید اور اصولوں کو مستحکم کرنے یا ان میں اس نظریے کو جاری و ساری کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا، جو تخلیقِ پاکستان کا باعث ہوا۔" کمیشن نے سفارش کی۔ "ہماری رائے میں جونیئر، ہائی اور مڈل سطح تک نصابی کمیٹیوں کے مرتب کردہ نصاب کے علاوہ ایسی کتابیں بھی ہونی چاہئیں، جو ہمارے صوفیا، مفکرین، مقننوں، امراء البحر، جرنیلوں، مورخوں، سیاستدانوں اور فلسفیوں وغیرہ سے متعلق ہوں، جو ان کی عظمت اور بلندیٔ کردار کو واضح کرتی ہوں۔ یہ کتابیں اس انداز میں لکھی جائیں کہ ان کا مطالعہ دلچسپ ہو اور طلبا کے دل میں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی آرزو اور ان کی کامرانیوں میں عظمت کا احساس پیدا ہو۔

یہ وہ سطح بھی ہے، جہاں نظریۂ پاکستان کا علم، قومی افتخار کا شعور، حب الوطنی اور ملک و قوم سے وفاداری کا جذبہ پیدا کیا جانا چاہیے۔ ہمارے خیال میں اس سطح پر طلبا کو علامہ اقبال اور نذر الاسلام کی نظموں سے بھی آگاہ کیا جائے، جو خفتہ قوم کو بیدار کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ مسدسِ حالی اور حفیظ جالندھری کے شاہنامۂ اسلام کے مناسب حصے بھی مفید انداز میں نصاب میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں اسی نوع کا مواد بنگالی سے منتخب کیا جا سکتا ہے۔"

مجھے دوبارہ کہنا پڑتا ہے کہ جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے، اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا گیا حالانکہ حکومت نے کمیشن کی سفارشات کو اصولی طور پر منظور کر لیا تھا۔ اس بے عملی کے نتائج نے ہمیں آج ایک دردناک کیفیت سے دوچار کر دیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس نقصان کا ازالہ کیا جا سکتا ہے اور صورتِ حال کی اصلاح ممکن ہے؟

میں ان خوش فہم لوگوں میں سے ہوں، جن کا یہ پختہ ایمان ہے کہ اصلاح ممکن ہے اور

اصلاح ہونی چاہیے۔ آپ یقیناً مجھ سے یہ استفسار کرینگے کہ کیسے؟

میری ناقص رائے میں پہلا اور سب سے اہم کام یہ ہے کہ نظریۂ پاکستان کی کوئی واضح تعریف کی جائے۔ آج کے نوجوان قیام پاکستان کے وقت یا تو اپنے پنگھوڑوں میں تھے یا ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ نہ تو اس تاریخی پس منظر سے اور نہ ہی ان اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالات سے واقف ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کو اپنے لئے ایک جُداگانہ وطن کا مطالبہ کرنے پر مجبور کیا۔ وہ ان ناانصافیوں اور مظالم سے قطعاً بے خبر ہیں، جو ہندو اکثریتی صوبوں کی کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں سے روا رکھے۔ وہ ان مشکلات سے بھی آگاہ نہیں، جن کا مسلمانوں کو اپنے اکثریتی صوبوں میں بھی سامنا تھا۔ انہیں اس صورتِ حال کے صحیح پس منظر سے آگاہ کرنا چاہیے، جو متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے انصاف حاصل کرنے کی تمام کوششوں کی ناکامی کے بعد برصغیر کی تقسیم پر منتج ہوئی۔ جب تک ہم یہ نہیں کرتے، نظریۂ پاکستان کا صحیح احساس اور اہمیت سامنے نہیں آسکتی۔ محض عمومی باتیں اب نہیں چل سکتیں، ہمیں اپنے اغراض و مقاصد کا واضح طور پر تعیّن کرنا چاہیے۔

نظریۂ پاکستان کی تعریف اور وضاحت کے بعد دوسرا اقدام ایک ملت ہونے کا احساس اور قومی افتخار کی روح پیدا کرنا ہے۔ یہاں پاکستان کے مختلف حصوں کے لوگوں میں نسلی، ثقافتی اور لسانی اختلافات کے بارے میں وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا کیا گیا لیکن ان میں مماثلتوں اور یکسانیت کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا۔ برصغیر کے تمام مسلمان ہندوؤں سے مسلمان ہونے والوں ہی کی اولاد نہیں۔ ایک بڑی تعداد عرب، ایران، افغان، ترک اور مغل اجداد کی اولاد ہیں۔ آپ کو سلہٹ اور چٹاگانگ میں ایک بڑی

تعداد ایسے افراد کی ملے گی، جن کی رنگت کھلی ہوئی، قامت لمبی، جسم کی ساخت مضبوط ہے، جن کے خدو خال تیز اور ناک لمبی ہے۔ ان کے خدو خال میں کوئی بھی چیز دراوڑوں یا منگولوں کی نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈھاکے کے "کُتّی" KUTTIES مغلوں کی اولاد ہیں۔ اسی طرح مشرقی پاکستان کے دوسرے حصوں میں بھی کئی ایک ایسے خاندان ہیں نسل کے لحاظ سے جن کی کئی شاخیں مغربی پاکستان میں بھی ہیں۔ ثقافتی طور پر بھی ان کے لباس، خوراک، عام طرزِ عمل حتٰی کہ روزمرہ کے استعمال کی اشیا میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ان مسلمانوں میں، جو مغربی لباس سے دُور رہے، شیروانی اور پاجامہ ایک مشترکہ لباس ہے۔ ہندو کی دھوتی کو مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے بھی کبھی اختیار نہیں کیا۔ لفظ لنگی، جسے پنجاب میں دھوتی کہا جاتا ہے، اپنی اصلیت کے لحاظ سے فارسی ہے، جس کے معنے "ستر پوشی" کے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کی لنگی اور پنجاب کے مسلمانوں کی دھوتی بندھے ایک سی نظر آتی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں اس سے صرف اتنی چیز مختلف ہے کہ اسے سامنے کی طرف سے لٹکایا جاتا ہے، جب کہ پنجاب میں ایسا نہیں ہوتا۔

خوراک کی بھی کئی اشیا مشترک ہیں۔ پراٹھا، پلاؤ، زردہ، فیرنی، شامی اور سیخ کباب ہر جگہ یکساں ہیں۔ ان میں اگر کوئی اختلاف ہے تو وہ طبعی عناصر کی وجہ سے ہے اور اس کا تعلق کسی ثقافتی طرزِ عمل میں تبدیلی کی شعوری خواہش سے قطعاً نہیں ہے۔ اسی طرح مشرق میں مچھلی اور چاول کا زیادہ استعمال اس لیے ہوتا ہے کہ وہاں گندم نہیں ہوتی اور مچھلی بکثرت ہوتی ہے۔ دُور افتادہ دیہات کے مسلم شہریوں میں بھی مسلمانوں کی گوشت کھانے کی عادت کی بنا پر آج بھی ہفتے میں ایک یا دو بار گائے یا بکری کو ملی احساس کے تحت ذبح کرنے کی روایت باقی ہے۔

ایک مسلمان کبھی بھی کیلے کے پتے پر رکھ کر کھانا نہیں کھائے گا یا وہ "گھونٹ" سے پانی کو اپنے گلے سے نیچے نہیں اتارے گا، حتیٰ کہ غریب ترین مسلمان کے پاس المونیم یا شیشے کا گلاس اور پلیٹ موجود ہے اور جہاں یہ میسر نہ ہوں، وہاں مٹی کی پلیٹیں اور گلاس استعمال کئے جاتے ہیں مختصر یہ کہ اس قسم کی بہت مشابہتیں ہیں لیکن میں جو نکتہ بیان کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اب ہمیں ان مشابہتوں اور یکسانیت پر زور دینا چاہیے تاکہ اس جھوٹے پروپیگنڈے کو ختم کیا جا سکے کہ ہمارے درمیان کوئی قدر مشترک یا رابطہ نہیں اور ہم مختلف النوع افراد ہیں جنہیں ایک قوم کے طور پر متحد رکھنے کا مشترک واسطہ صرف دین ہے۔

ہمیں اس نظریے کو بھی رد کر دینا چاہیے کہ جب تک علاقہ ایک نہ ہو اور زبان یکساں نہ ہو، قوم وجود میں نہیں آ سکتی۔ کیا اطالوی، فن، جرمن، سلوویک، آئرش، انگلش، سکاچ، یونانی اور فرانسیسی ایک امریکی قوم کو جنم دینے کے لیے متحد نہیں ہو گئے؟ کیا الاسکا کی ریاست، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی دوسری ریاستوں کی مشترکہ حدود کے اندر ہے؟ کیا ریڈ انڈین، نیگرو اور اسکیمو کا تعلق اسی نسل سے ہے، جس سے دوسرے امریکیوں کا ہے؟ کیا کینیڈا کی دو دو سرکاری زبانیں نہیں ہیں یعنی فرانسیسی اور انگریزی۔ اور وہ سوئٹزرلینڈ کی تین زبانیں نہیں ہیں: فرانسیسی، جرمن اور اطالوی؟ اگر وہ ایک قوم ہو سکتے ہیں، تو ہم کیوں نہیں ہو سکتے؟ آخر ایسی کون سی ناقابلِ تسخیر خلیج حائل ہے؟ میرے خیال میں ایسی کوئی خلیج حائل نہیں بلکہ ہم میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔

حال ہی میں میں نے اخبارات میں مشرقی پاکستان کے ایک ممتاز سیاستدان کی یہ تجویز دیکھی ہے کہ ملک کے دو بازوؤں میں حائل لسانی خلیج کو اس طرح پاٹا جا سکتا ہے

کہ اردو کو مشرقی پاکستان میں اور بنگالی کو مغربی پاکستان میں لازمی قرار دیا جائے۔ طلبا کے مسائل اور بہبود سے متعلق کمیشن کی بھی یہی رائے تھی لیکن یہ وقت کی حکومت کی تائید حاصل نہ کر سکی۔ حالانکہ اس پر عملدرآمد میں کوئی خاص مشکل حائل نہیں تھی۔

آپ یہ جان کر یقیناً متحیر ہوں گے کہ دونوں زبانوں میں الفاظ کی ایک بڑی تعداد مشترک ہے۔ کچھ عرصہ قبل رائٹرز گلڈ نے مشترک الفاظ کی ایک فرہنگ شائع کی تھی جس میں اردو اور بنگالی کے قریباً تین ہزار الفاظ شامل تھے اور ۱۹۶۸ء میں ترقی بنگالی کے مرکزی بورڈ نے پانچ ہزار ایک سو چھیاسی ایسے الفاظ کی ایک لغت شائع کی تھی جو اپنی اصل کے لحاظ سے عربی، فارسی ہیں اور بنگالی میں عام استعمال ہوتے ہیں۔ اس لغت کے مرتب نے خود اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ یہ فہرست قطعی نہیں بلکہ اس میں ۳۹۳۴ الفاظ کو مزید شامل کیا جا سکتا ہے، لیکن انہیں محض اس لیے شامل نہیں کیا گیا کہ ان کی املا قدرے مختلف ہے۔ لہٰذا ایک مشترک فہرست موجود ہے اور اس میں آسانی سے اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

اب جہاں تک مغربی پاکستانیوں کے بنگالی سیکھنے کا مسئلہ ہے، یہ بھی اس وقت کوئی مشکل نہیں ہو گا، جب مختلف رسم الخط کے مسئلے پر قابو پا لیا جائے۔ اس سلسلے میں انجمن حروف القرآن، مشرقی پاکستان نے غیر بنگالیوں کو عربی رسم الخط میں بنگالی سکھانے کا طریق کار ایجاد کر کے ایک گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ میرے پاس ان کی کچھ مطبوعات ہیں، جن سے آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس طریقے سے بنگالی سیکھنا کتنا آسان ہے۔

آخر میں میں یہ کہوں گا کہ اگر پورے ملک میں انگریزی کے بجائے ایک مشترکہ زبان کو رواج دینا ہے تو عربی رسم الخط بنگالی اور اردو کے مشترکہ الفاظ پر مشتمل مشترکہ زبان

کے لیے ایک مشترک رسم الخط کی حیثیت سے اختیار کیا جا سکتا ہے اور بنگالی اور اردو کے ان الفاظ میں انگریزی کی ان فنی اصطلاحات کو بھی شامل کر لیا جائے، جو کہ دونوں زبانوں میں بڑی حد تک مروج ہیں۔ عربی کے ساتھ ہماری اس واقفیت سے ہمیں ایک اور فائدہ ہوگا کہ ہم دوسرے مسلم ممالک کے قریب تر آجائیں گے، جہاں عربی عام بولی جاتی ہے۔ اس قسم کی مشترکہ زبان سکولوں میں السنۂ مشرقیہ کے ساتھ ایک فاضل زبان کی طرح اسی طرح پڑھائی جا سکتی ہے، جس طرح آج کل انگریزی کو پڑھایا جا رہا ہے۔

یہ وہ چند اہم اقدامات ہیں، جنہیں میں پاکستانی عوام کے نظریے کے استحکام اور قومی یک جہتی کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ آپ ایسی نصابی کتابیں مرتب کریں جو ان مقاصد کو پورا کریں۔ میں یہ جان کر خوش ہوا ہوں کہ آپ نے اس سلسلے میں کام شروع کر دیا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ کی رفتار تیز تر ہو جائے اور آپ کامیاب رہیں۔ آمین۔

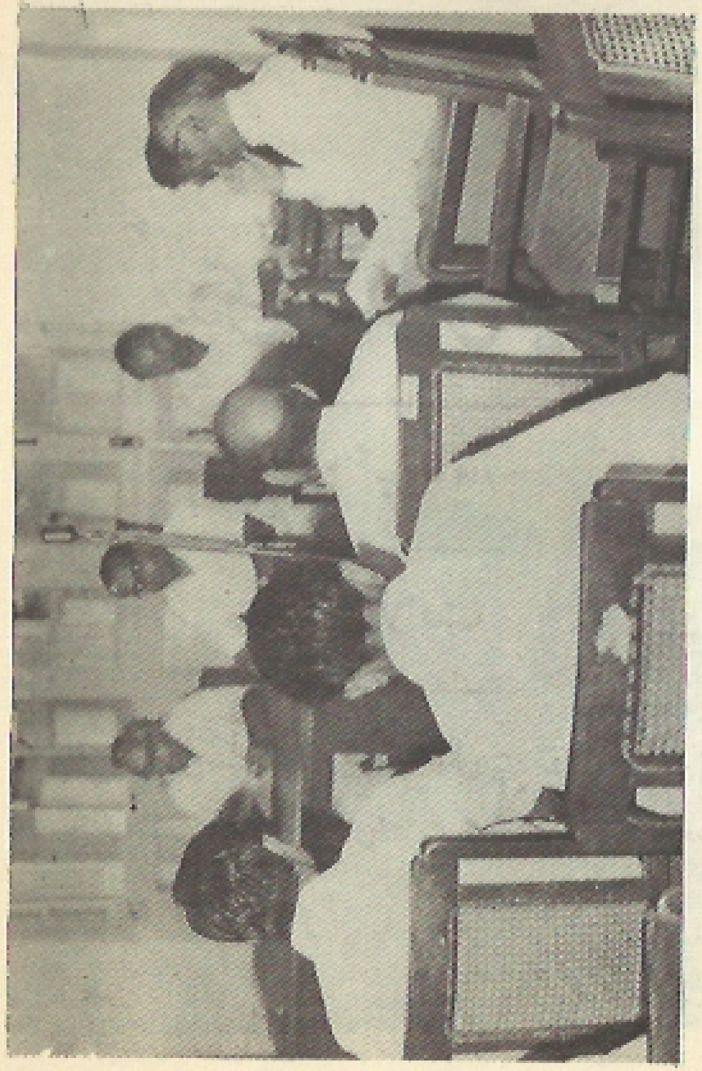

ڈاکٹر عبدالشکور احسن ۲۸-ستمبر ۱۹۷۱ء کو گروہی بحث کی صدارت کر رہے ہیں۔

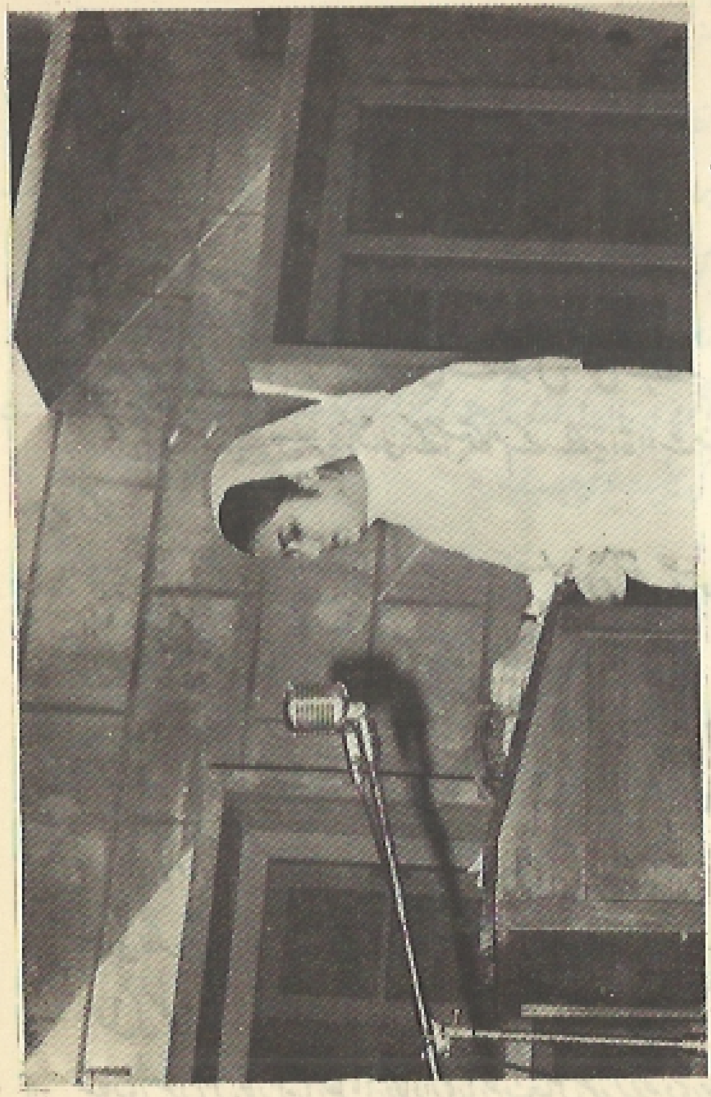

مس شکیلہ شریف گروہی بحث کی رپورٹ پڑھ رہی ہیں

گروہی بحث کی رپورٹیں

۲۸ ستمبر ۱۹۷۱ء

سوالات

۱. نظریۂ پاکستان کے استحکام میں کن عوامل سے مدد مل سکتی ہے ؟

۲. نظریۂ پاکستان کے حامیوں کو کن خطرات کا سدِ باب کرنا چاہیے اور کیسے ؟

گروہی بحث کی رپورٹ

گروپ الف

نظریۂ پاکستان کے استحکام میں کن عوامل سے مدد مل سکتی ہے۔

گروہی بحث کے نتیجے میں نظریۂ پاکستان کے استحکام کے لئے یہ اقدامات ضروری قرار دیے گئے۔

۱۔ نظریۂ پاکستان کے لئے بچوں کی نصابی کتابوں پر خاص توجہ دی جائے اور ان کے موضوعات کو نظریۂ پاکستان کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔

۲۔ ابلاغ عامہ کے ذرائع نظریۂ پاکستان کے استحکام کا قابل اعتماد وسیلہ بن سکتے ہیں۔

۳۔ اساتذہ کے مقام اور مرتبہ پر خاص توجہ دی جائے تاکہ وہ اپنے کردار اور ابلاغ اور معلومات عامہ کے ذریعہ طلباء تک نظریۂ پاکستان کو کامیابی سے پہنچا سکیں۔

۴۔ والدین کا کردار بھی نظریۂ پاکستان کے استحکام کے لئے اہم معاون ہو سکتا ہے۔

۵۔ ماحول کی علمی فضا سے بھی نظریۂ پاکستان کے استحکام میں مدد مل سکتی ہے۔

۶۔ سرکاری شعبوں میں ملازمین کی نظریاتی وفاداری کی طرف خاص طور پر توجہ دی جائے۔

نظریۂ پاکستان کے حامیوں کو کن خطرات کا سدباب کرنا چاہیے اور کیسے؟

گروپ کی متفقہ رائے کے مطابق

۱۔ پاکستان کے نظریے کے منافی تصورات کی درآمد اور ترویج کو روکا جائے اور اس ضمن میں نوعمر طالب علموں کی بالخصوص نگہداشت کی جائے۔

۲۔ نظریاتی سنسرشپ کا ابلاغ عامہ کے ذرائع پر اطلاق ہونا چاہیئے۔

۳۔ ہمارے تعلیمی امور، تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے متعلق غیر ملکی ماہرین کی رائے کو قبول نہ کیا جائے۔

۴۔ تمام غیر ملکی تعلیمی اداروں کو فوری طور پر بند کر دیا جائے۔

۵۔ انگریزی زبان کی لازمی حیثیت کو ختم کر دیا جائے اور اسے ایک اختیاری مضمون کی حیثیت دی جائے۔

صدر: ڈاکٹر نذیر احمد

سیکرٹری: مس رشید قمر

گروہی بحث کی رپورٹ

گروپ ب

نظریۂ پاکستان کے استحکام میں کن عوامل سے مدد مل سکتی ہے ؟

مثبت اقدام - عوام سے جو ۸۰ فی صد دیہات میں رہتے ہیں رابطہ قائم کیا جائے اور ان کو نظریۂ پاکستان سے متعارف کرایا جائے - اس سلسلے میں ریڈیو، تعلیم بالغاں کے مراکز، اخبارات اور مدارس و مساجد سے بھی کام لیا جا سکتا ہے ۔

۲- اساتذہ کو آمادہ کیا جائے کہ وہ نظریۂ پاکستان طلبا میں راسخ کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔ ان کے تربیتی نصابوں میں بھی نظریۂ پاکستان شامل کیا جائے - اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے اساتذہ پر ریفریشر کورس کے ذریعے نظریۂ پاکستان کی حقیقت واضح کی جائے ۔

۳۔ اساتذہ کے تقرر کے وقت اس بات کو مدِ نظر رکھا جائے کہ وہ نظریۂ پاکستان سے COMMITTED ہیں۔

۴۔ وہ اساتذہ جو نظریۂ پاکستان کی کھلم کھلا یا درونِ خانہ مخالفت کرتے ہیں ان کے لئے ان ریفریشر کورسز میں خاص اہتمام کیا جائے لیکن اگر وہ پھر بھی اپنی روش کو درست نہ کر سکیں تو ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے ۔

۵۔ علمائے دین کے رول کو پوری اہمیت اور مقام دینا ضروری ہے ۔ اور علما کے لئے

بھی خصوصی انتظام ہو کہ وہ نظریۂ پاکستان کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور سمجھا سکیں ۔

۶۔ آزادیٔ افکار ہو لیکن اس کے لئے چند حدود و قیود ضروری ہیں۔

۷۔ پرائمری تعلیم بھی اتنی ہی ضروری ہے، جتنی کہ اعلیٰ تعلیم ۔

۸۔ طویل تعطیلات کے دوران اساتذہ اور اعلیٰ جماعتوں کے طلبا دیہاتوں میں جا کر نظریۂ پاکستان کی اشاعت کے لئے کام کریں اور انہیں اس کے وسائل مہیا کئے جائیں۔

نظریۂ پاکستان کے حامیوں کو کن خطرات کا سدِ باب کرنا چاہیئے ؟

۱۔ اپنے ملی ورثہ کی تمیز کے لئے نظریۂ پاکستان کے منافی تحریکات، افکار اور لٹریچر کا سدِ باب کیا جائے ۔

۲۔ باہر سے آنے والے ہپّی اور اس قسم کے اشخاص کے داخلے پر پابندی لگائی جائے ۔

۳۔ ابلاغِ عامہ کے اداروں پر خصوصی احتساب لگایا جائے کہ وہ نظریۂ پاکستان کے منافی امور سے گریز کریں بلکہ اس نظریے کے فروغ کے لئے مثبت کام کریں۔

صدر :- حافظ نذر احمد پرنسپل شبلی کالج، لاہور

سیکرٹری :- ڈاکٹر ایم اسلم قریشی نیو کیمپس، لاہور

گروہی بحث کی رپورٹ

گروپ ج

نظریۂ پاکستان کے استحکام میں کن عوامل سے مدد مل سکتی ہے؟

اسلام پر زور دیا جائے۔ اسلام کی محبت اور پابندی عوام میں پیدا کی جائے۔

ایک صاحب کے نزدیک اسلام ایک روحانی، سیاسی اور معاشرتی نظام ہے جب تک ہم اسے عمل میں نہیں لائیں گے اس وقت تک کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسوہ حسنہ کو رائج کرنا نظریۂ پاکستان کے استحکام کے لئے ضروری ہے۔

قائدِ اعظمؒ کے نظریات سے استفادہ کیا جائے اور بچوں میں یہ چیز پیدا کی جائے کہ وہ قائد کے نقشِ قدم پر چلیں۔

اس بات کو اس نظریے کے استحکام میں ضرور شامل کرنا چاہیئے کہ ہم اپنے قومی مفادات کو ذاتی مفادات پر ترجیح دیں۔ مسلمانوں کو اپنا ظاہر اور باطن الگ الگ نہیں رکھنا چاہیئے۔

نظریۂ پاکستان کے استحکام کے لئے تمام منفی قسم کے نظریات کی روک تھام کی پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کے لئے غیر ملکی نظریات کی نشر و اشاعت کی روک تھام بہت ضروری ہے اور اسلام کو ایک زندہ اور متحرک مذہب کی حیثیت سے آگے لانے کی ضرورت ہے اور اس ضمن میں اسلامی معاشی نظام کو رائج کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

تمام زبانوں کو ملا کر ایک پاکستانی زبان اور تمام رسم الخط کو ملا کر ایک رسم الخط رائج کیا جائے۔

اسی طرح تمام علاقائی ثقافتوں کو ختم کر کے ایک ہی قسم کی ثقافت کو فروغ دیا جائے اور ابلاغِ عامہ کے ذرائع پر بھی کنٹرول کیا جائے اور ان کے ذریعے نظریۂ پاکستان کی نشر و اشاعت کی جائے۔

مختصر یہ کہ اسلام کے نظریات اور تعلیمات کو فروغ دیا جائے اور اس کے لئے نصاب اور تدریس میں بھی انقلاب لانا بے حد ضروری ہے۔ اسی طرح ماحول کو بھی درست کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید براں معماران قوم یعنی اساتذہ کو درست کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

اسی طرح والدین کو بھی نظریۂ پاکستان کی تعلیم دی جانی چاہیے۔

نظریۂ پاکستان کے حامیوں کو کن خطرات کا سدباب کرنا چاہیے؟

اگر کسی بات میں خدا کی نفی ہوتی ہے تو ایسے رجحان کو ختم کرنا چاہیے، اس لئے تمام نصابِ تعلیم کی تطہیر ضروری ہے۔ اسی طرح وہ غیر ملکی لٹریچر جو بے دینی اور دہریت کی تبلیغ کرتا ہو، اس پہ پابندی بڑی ضروری ہے۔ اس وقت قوم کو کچھ خطرات درپیش ہیں یہ خطرات دو قسم کے ہیں، داخلی اور خارجی، انفرادی اور اجتماعی۔ گو ہم ایک آزاد قوم ہیں لیکن معاشرتی اور فکری اعتبار سے ہم اب بھی مغربی تہذیب کے غلام ہیں۔

جب تک ہم اس جوئے کو اتار نہ پھینکیں، اس وقت تک نظریۂ پاکستان کا استحکام ممکن نہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے ادارے ہونے چاہئیں، جو غیر ملکی لٹریچر کے ذریعے پھیلائے ہوئے زہر کا تریاق تلاش کر سکیں۔ چند ایک ایسی لائبریریوں کا قیام ضروری ہے، جن میں نظریۂ پاکستان کے خلاف لکھی ہوئی تمام کتابیں موجود ہوں تاکہ ہمارے مفکرین وہاں جا کر ان کا جواب لکھیں۔ تاہم سکولوں میں ہر قسم کا لٹریچر نہیں جانا چاہیے البتہ ہائی کلاسز میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہاں پہنچنے پر طالب علم کا ذہن ترقی یافتہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ذہن کے مسموم

ہونے کا احتمال نہیں تھا۔ ماضی میں بہت زیادہ چھٹی دی گئی ہے اور جس شخص کے جو جی میں آئے کہنے کا موقع دیا گیا ہے لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اپنی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کی جائے۔

بچوں کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے اور ان کے ذہنوں کو مسموم ہونے سے بچایا جائے۔

علاقائی تعصب اور مغربی تہذیب کی تقلید ایسے خطرات ہیں جن کا نظریۂ پاکستان کے حامیوں کو سدِباب کرنا چاہیئے۔

غیر ملکی تنظیموں، ایجنسیوں اور کلبوں پر پابندی لگائی جائے۔

صدر: مس بلقیس شاد

سیکرٹری: جناب محمد اسلم

گروہی بحث کی رپورٹ

گروپ د

۱۔ ہر قسم کے لسانی، علاقائی اور معاشرتی تعصبات کو ختم کرکے اس کے خلاف ایک محاذ قائم کیا جائے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات عام کی جائیں اور نظام حیات کو کلی طور پر اسلامی عقائد پر ڈھالا جائے۔

۲۔ بچوں کو خاص طور پر اسلامی تعلیمات دی جائیں اور نصاب کی کتب میں ان تعلیمات کو شامل کیا جائے۔

۳۔ بچوں میں جذبۂ حب الوطنی پیدا کیا جائے۔

۴۔ ہر شخص کے قول و فعل میں تضاد ہے، ہر شخص اپنا محاسبہ خود کرے اور جو بات کہے اس پر عمل کرے تاکہ بچوں کے لئے اچھا نمونہ ثابت ہو۔

۵۔ محکمہ تعلیم میں ایک ایسی احتسابی کمیٹی بنے جو استادوں کے عمل کو جانچے۔

۶۔ مڈل سکول کی سطح پر ایسا نصاب قائم کیا جائے جس سے بچے یہ سمجھ سکیں کہ پاکستان کیوں بنا، کن قربانیوں کے بعد ہمیں یہ ملا اور اس کا تحفظ کیوں ضروری ہے۔

پھر ان کتب کا ترجمہ بنگالی میں کیا جائے اور بنگالی اہل قلم کو بھی ترغیب دی جائے کہ وہ بھی اس موضوع پر کچھ لکھیں۔

۷۔ استاد اور طلبا میں ایسا قریبی رشتہ ہو کہ وہ پاکستان کی آئیڈیالوجی طلبا کو سمجھا سکیں۔ خود استاد اس نصب العین پر عمل کریں اور طلبا کو عمل کی تلقین کریں۔

۸۔ ٹیلیویژن، ریڈیو اور اخباروں وغیرہ سے ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ اس سے بچوں کا بہتر کردار بن سکے۔

۹۔ اسلامی عقائد کی اشاعت پرائیویٹ اور سرکاری سطح پر ہو۔

۱۰۔ گورنمنٹ کا، فرد کا، استاد کا، والدین کا محاسبہ کیا جائے۔

۱۱۔ نظریۂ پاکستان خالص اسلامی نظریہ ہے لہٰذا کوئی غیر اسلامی نظریہ جو ملک میں پیدا ہو، اس کا قلع قمع کیا جائے۔

علم کو عام کیا جائے تاکہ ذہنی پختگی پیدا ہو اور ہر فرد اچھے بُرے کا امتیاز خود کر سکے۔

ایک صاحب نے کہا۔ کہ نظریۂ پاکستان کو جن عوامل سے مدد مل سکتی ہے ان کے لئے حکومت وسائل مہیا کرے تاکہ وہ کام کر سکیں۔

نصابات و درسی کتب میں اسلامی نظریات کی وضاحت کی جائے اور جو استاد انہیں پڑھانے کے اہل ہیں، وہ انہیں پڑھائیں۔

یوم والدین منایا جائے تاکہ دونوں کے نظریات ایک دوسرے سے ملیں اور بچے کے سامنے صحیح نصب العین قائم ہو سکے اور اسے منزل تک پہنچنے میں ماں باپ اور استاد کے تعاون سے مدد ملے۔

مشرقی اور مغربی پاکستان میں یکساں قومی نصاب قائم کیا جائے۔

ماہرین ہمارے مقاصد تعلیم کا تعین کریں اور پھر اس پر عمل کیا جائے۔

اساتذہ کے ریفریشر کورسز ہونے چاہئیں تاکہ گاہ بگاہ اساتذہ کو ان کا نصب العین یاد رہے اور ان میں عمل کی شدت پیدا ہو۔

معاشرتی ناہمواریوں سے، لادینی سے، فیشن سے اور غلط قسم کی جدیدیت سے جو خطرات

نئی نسل کو ہو سکتے ہیں ان کا قلع قمع کیا جائے۔

فلم سنسر بورڈ میں اساتذہ کی نمائندگی بھی ہونی چاہیے تاکہ فلم سے جو مسموم اثرات بچوں پر ہوتے ہیں وہ ان سے بچ سکیں۔

خارجی اور داخلی عوامل جو اسلامی ممالک سے ہمیں ملتے ہیں ان کا زیادہ اثر یہاں ہونا چاہیے۔ ان سے تعلقات بہتر ہوں۔

ثقافتی اعتبار سے جو ہمارے لئے مشترک حصے ہیں انہیں تلاش کیا جائے اور انہیں مضبوط کیا جائے۔

صدر:۔ مسز امتیاز حسن۔ لاہور کالج فار ویمن، لاہور

سیکرٹری:۔ مسز عبادت۔ گورنمنٹ کالج سمن آباد، لاہور

گروہی بحث کی رپورٹ

گروپ ۵

نظریۂ پاکستان کے استحکام میں کن عوامل سے مدد مل سکتی ہے؟

۱۔ اساتذہ کو پاکستانی نظریے سے جو دراصل اسلامی نظریۂ حیات ہے مکمل واقفیت حاصل ہونی چاہیئے۔ اساتذہ کو پس منظر سے بھی پوری پوری واقفیت ہونی چاہیئے۔

۲۔ اساتذہ کے باقاعدہ تربیتی کورس ہونے چاہئیں جن میں انہیں نظریۂ پاکستان سے مکمل واقفیت بہم پہنچائی جائے۔

۳۔ رہنمائے اساتذہ شائع ہونے چاہئیں۔ ان میں نظریۂ پاکستان کی پوری پوری وضاحت ہو۔ ممکن ہو تو اشتیاق حسین قریشی صاحب کا مقالہ شامل کر دیا جائے۔

۴۔ اساتذہ کو اخلاقی قدریں اپنانی چاہئیں تاکہ وہ طلبا کے سامنے نمونہ بن سکیں۔

نظریۂ پاکستان کے حامیوں کو کن خطرات کا سدِّباب کرنا چاہیئے اور کیسے؟

۱۔ قومی یک جہتی اور تعاون پیدا کرنے کے لئے آبادی کا تبادلہ ہونا چاہیئے، جن میں اساتذہ، کاشتکار اور ملازمین شامل ہوں۔

۲۔ زبان کے مسئلہ کو اس طرح طے کرنا چاہیئے کہ بنگالی یہاں لازمی ہو اور اردو مشرقی پاکستان میں فوری طور پر لازمی کر دی جائے۔

۳۔ ہماری نصابی کتب میں اسلاف کے کارناموں کا ذکر ہونا چاہیئے۔

۴۔ طلبہ میں پاکستان کے قدرتی وسائل سے محبت پیدا کرنی چاہیئے۔

۵۔ بچوں کی سرگرمیوں پر خاص توجہ دینی چاہیئے۔ اسلامی موضوعات پر گروہی بحثیں اور مناظرے ہوں۔

۶۔ بنگلہ ادیبوں اور شاعروں کے خیالات کا ترجمہ کیا جائے۔

۷۔ ٹیکسٹ بک بورڈ کی یہ کوشش لائقِ ستائش ہے کہ انہوں نے کتب میں قرآن مجید کی آیات شامل کی ہیں تاکہ ابتدا ٹھیک اور واضح ہو۔

۸۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے فائدہ اٹھایا جائے۔

صدر:۔ مسز نزہت منظور، مرکز توسیع تعلیم، لاہور

سیکرٹری:۔ ملک بشیر الدین

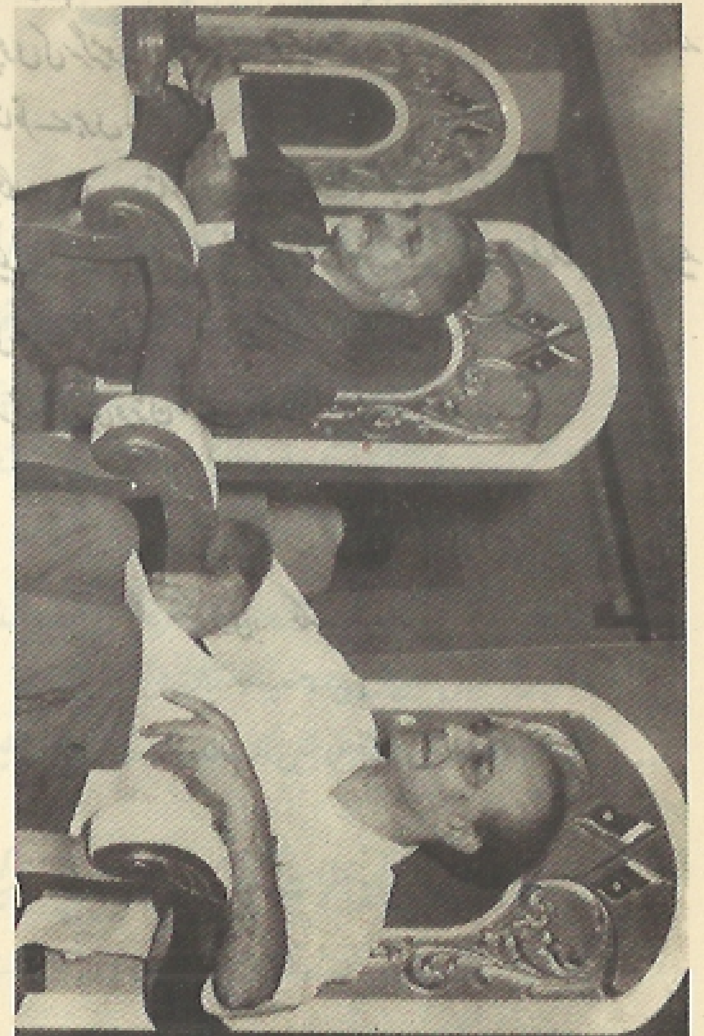

پروفیسر علاؤالدین صدیقی نشست کی صدارت کر رہے ہیں

خطبۂ صدارت

پروفیسر علاؤالدین صدیقی

خواتین و حضرات!

چوں نوبتے بہ ماشد آتش بجام کردند

صبح سے اتنی مفید باتیں سن چکا ہوں کہ کم از کم اتنا یقین ہے کہ جو گھر سے لے کر آیا تھا، اس سے متعلق تو دماغ صاف ہو گیا۔ اب یہ ہے کہ یہاں پہ اتنا مفید مواد حاصل ہوا کہ مجھے اگر آٹھ دن کی چھٹی دے دی جاتی تو میں آج کی کارروائی کی ایک اچھی رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا۔ یوں باتوں کو دہرا دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بعض اوقات فائدہ بھی ہوتا ہے کہ باتیں یاد رہ جاتی ہیں لیکن باتوں کو ساتھ ساتھ سمیٹتے چلے جانا چاہیے۔ اس وقت ہم جن گردہی بحثوں سے بحث کر رہے ہیں، وہ دو تھیں۔ نظریہ پاکستان کے استحکام میں کن عوامل سے مدد مل سکتی ہے؟ نظریہ پاکستان کے حامیوں کو کن خطرات کا سدباب کرنا چاہیے؟ نظریہ پاکستان پر پروفیسر اشتیاق حسین قریشی کی کل کی تقریر اتنی واضح، اتنی دلکش اور اتنی دلفریب تھی کہ میرے خیال میں نظریہ پاکستان کے متعلق اس کے بعد کوئی شکوک باقی نہ رہنے چاہئیں تھے اور نہ رہے ہوں گے لیکن چونکہ بحث نظریہ پاکستان ہی کی کرنی ہے، اس واسطے پہلے سمجھنا چاہتا ہوں کہ یہ پاکستان تو ایک چیز ہوئی، اس کا جغرافیہ نقشے کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظریہ پاکستان کیا چیز ہے؟ میں خود سوال کر رہا ہوں، اس واسطے کہ ہر روز سوال کیا جاتا ہے اور ہر

بار جواب دینے میں کچھ اپنے ہاں بھی تبدیلی ہوتی ہے، کچھ دوسرے کے سوال میں بھی تبدیلی ہوتی ہے لیکن اس وقت تک تیقن سے ہم صحیح منزل تک نہیں پہنچے کہ نظریۂ پاکستان کیا ہے؛ ہمارے فکر کی رفتار اس کشتی کی طرح ہے جس کے متعلق شاعر نے کہا تھا کہ

وہ کشتی ہی کیا جو کسی کے سہارے — چلے اور وہ بھی کنارے کنارے

ہواؤں کی تندی سے کشتی کی منزل — کبھی اِس کنارے کبھی اُس کنارے

ہم نے آج تک اپنے تجربات کبھی اس کنارے، کبھی اُس کنارے کی صورت میں ہی حاصل کیے ہیں۔ تعلیمی بحثیں اور پاکستان ایک سیاسی بات ہے۔ نظریۂ پاکستان سب سیاستوں کی جڑ ہے، بنیاد ہے، احساس ہے اور میں آپ کی اجازت سے اگرچہ میں پہلے وضاحت کر دوں کہ تا دیر آپ کو نہیں روکے رکھوں گا، نظریۂ پاکستان کی تاریخ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ دنیا میں مختلف مذاہب ہیں اور ان مذاہب میں بعض کو الہامی ہونے کا دعوے ہے۔ بعض حقیقی طور پر الہامی کتابیں بھی رکھتے ہیں اگرچہ ان کی صورتیں انہوں نے مسخ کی ہوئی ہیں۔ ان تمام مذاہب میں سے کسی مذہب نے وہ دعاوی پیش نہیں کیے، جو اسلام نے پیش کیے ہیں۔ ہم جس وقت لفظ "اسلام" استعمال کرتے ہیں، تو دو معنوں میں آتا ہے۔ ایک تو مسلمانوں کا یہ تصور کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین اسلام تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم تک اسلام ہی کی دنیا میں تبلیغ ہوئی اور انبیاء علیہم السلام اسلام سکھاتے رہے اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعے جس وقت نسل انسانی ایک مکمل، مضبوط، مجموعی حیثیت سے نظریاتِ دینی کو قبول کر سکتی تھی، اس وقت اسلام نے آکر خدائی ہدایت کا ایک مکمل مجموعہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ میں یہ جو کچھ کہہ

رہا ہوں، اس کی تفصیل تو بڑی لمبی ہو سکتی ہے لیکن اختصار سے تقابلِ ادیان کے ایک طالب علم اور ایک حقیر سے طالب علم کی حیثیت سے اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ کسی دوسرے مذہب نے نہ آخری ہونے کا دعوے کیا ہے، نہ جامع ہونے کا دعوے کیا ہے، نہ مکمل ہونے کا دعوے کیا ہے، نہ عالمی ہونے کا دعوے کیا ہے۔ میں تمام مذاہب کی تاریخ کو چیلنج کر رہا ہوں، خطرے میں کھڑا ہوں لیکن اگر وقت ہوتا تو اس کی مثالیں بھی آپ کے سامنے پیش کر دیتا کہ آج دنیا کی تاریخ میں، مذاہب کی تاریخ میں صرف ایک ہی مذہب ہے، جو اپنی اصل پر قائم ہے، جو پوری زندگی پر حاوی ہے، جو زمان و مکان کی قیود پر غالب ہے، جو تمام نسلِ انسانی کے لیے ہے، جو تمام زمانوں کے واسطے ہے، جو دُنیا کی ہدایت کی آخری سرحد ہے۔ یہ میں نے اس لیے دُہرایا ہے کہ جو قوم جس طرح کا نظریہ رکھتی ہے، اس کے اعمال اسی طرح کے نظریئے پر مرتب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر کسی قوم نے ایک چھوٹی سی وادی کو آباد کرنا ہی اپنے پیشِ نظر رکھا ہو تو اس کے کاروبار، اس کے فکر کا اندازہ، اس کے فعل کی صورتیں تمام کی تمام محدود ہوں گی۔ اگر کسی نے شہر بسانے کا ارادہ کیا ہو تو وہ اور طرح کے وسائل و ذرائع استعمال کرے گا۔ اگر کسی نے شہروں کے انتظام سے ملکوں کے انتظام تک جانا ہو تو اس کے لیے ظاہر ہے کہ تیاری کی صورت بھی اور ہو گی، اصول بھی اور ہوں گے، انتظام بھی اور ہو گا، انتظام کا اہتمام کرنے والے گُر بھی اور ہوں گے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو تمام نسلِ انسانی کو مخاطب کر سکے اور صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو تمام نسلِ انسانی کو مخاطب کرتے ہوئے "یا ایہا الناس"

کہتا ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں ہے — O HUMANITY—O MAN KIND "کیا جاسکتا ہے ۔" اے افرادِ نسلِ انسانی! یعنی بار بار افرادِ نسل انسانی کو مخاطب کرنے والا مذہب اور ہے اور چند افراد کے ایک مجموعے نسلی یا قومی یا جغرافیائی یا تاریخی حصّے کو مخاطب کرنے والا مذہب اور ہے ۔ اسلام یہ احساس برتری پیدا کرتا ہے کہ وہ دنیا کے سامنے ہدایت کا آخری نسخہ، ہدایت کا مکمل اور دائمی نسخہ لے کر آیا ہے ۔ اصل میں نظریۂ پاکستان اس تصور پر مبنی ہے کہ اسلام دوسرے ادیان کے برابر بھی نہیں کھڑا کیا جاسکتا، اس میں بھی اس کے مقام کی توہین ہے ۔ یہ ان کے مساوی بھی نہیں ٹھہرایا جاسکتا، اس میں اس کے مقام کی ناقدر شناسی ہے ۔ اس کو ماننا پڑے گا اور دنیا کو منوانا پڑے گا کہ یہ دنیا کی آخری دولت ہے، ہمہ گیر دولت ہے، جہاں گیر دولت ہے، عالمگیر دولت ہے ۔ اس تصور نے مسلمان بڑھ کر یہ تصور لے کر کہ میں دنیا پر چھا جانے والا ہوں، اپنی سند اپنی بغل میں دبا کر کہ

"وکنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر"

(کہ جو قومیں اٹھائی گئیں، ان میں تم بہترین قوم ہو ۔ تم دنیا کو بھلائی سکھاؤ گے ۔ تم نیکی کا حکم دو گے ۔ برائی سے روکو گے ۔ تم بھلائی دنیا میں پھیلایا کرو گے)

یہ پیغام، یہ نسخہ، یہ سند کسی دوسرے کے استناد کے سامان میں موجود نہیں ہے ۔ اس لیے بجا ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو اس دنیا میں رہتے ہوئے، چلتے پھرتے

انسانوں کے ساتھ چلتے پھرتے ہوئے انسان کی حیثیت سے اگر دوسروں سے مختلف سمجھے تو اس کے درست اور JUSTIFIED ہونے کی دلیل میں نے پہلے پیش کر دی ہے ۔ نہ کسی کو حتمیت اور آخریت کا دعوے ہے، نہ کسی کے پاس آخری سامان ہے، نہ کسی کے پاس لایا ہوا سامان ہدایت محفوظ ہے اور پھر اس سامان ہدایت سے نتیجہ کیا ہے؟

نتیجہ یہاں پیش کیا گیا

"اولئک علی ھدی من ربھم و اولئک ھم المفلحون"

(یہ لوگ جو اس طرح خدائے بزرگ و برتر کو مانتے ہیں، وہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور وہی فلاح پانے والوں سے ہیں)

دنیا میں حاجت، دنیا میں محتاجی، دنیا میں نقائص، دنیا میں قصور، دنیا میں غلطیاں، دنیا میں لغزشیں رہ جائیں گی، اگر پرانے نصابوں کے مطابق زندگی بسر کی جائے ۔ اس لیے ایک ہی نصاب ایسا ہو سکتا ہے جو تمام عالم کو مخاطب کرے اور وہ نصاب اسلام ہے ۔ اب اس اسلام کو لے کر مسلمان کبھی اونٹوں پر، کبھی پیدل، کبھی گھوڑے پر سوار، کبھی سیّاح کی صورت میں، کبھی تاجر کی صورت میں، کبھی صوفی کی صورت میں، کبھی مجاہد کی صورت میں دنیا میں پھیلتا رہا ہے اور آواز ایک ہی تھی کہ "آؤ اس چیز کی طرف" جو تم سب کے واسطے سامان ہدایت ہے ۔ یہ کرنے والا مسلمان وہ تھا جس کی بدولت آج دنیا میں ہماری ایک وسیع تعداد موجود ہے ۔ اگرچہ وسیع تعداد کے متعلق بھی غالباً ایک سیمینار کرانے کی ضرورت ہے کہ انگریز جب لکھتا ہے، مسلمان کو ۲۵ کروڑ لکھتا ہے اور مسلمان جب تقریر کرتا ہے (مجھے بھی پچاس سال ہو گئے سنتے ہوئے) ۸۰ کروڑ ہی کہتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمان ۸۰ کروڑ کے برابر دنیا کے اندر پایا جاتا ہے ۔ یہ

۸۰ کروڑ مسلمان دنیا میں صرف اس احساس بہتری کا نتیجہ ہے ۔ اس احساس برتری کا نتیجہ ہے کہ میرے پاس اچھی چیزیں ہیں ۔ ان اچھی چیزوں کو خود بھی اختیار کرنا چاہیئے اور دوسروں تک بھی پہنچانا چاہیئے ۔

زاں کہ در تکبیر رازِ بودِ تست
حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست ،

(اللہ کے نام کو بلند کرنا ہی تیری زندگی ہے اور لا الٰہ الا اللہ کی حفاظت اور نشر و اشاعت کرنا ہی تیری زندگی کا مقصد ہے)

پس مسلمانوں کو حضرت علامہ اقبال ؒ کہتے ہیں کہ ۔

تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے
گر مسلمانی نیاسائی دمے

(جب تک کہ دنیا کے ، کائنات کے ذرّے ذرّے سے حق کی آواز بلند نہ ہو جائے ۔ اگر تم مسلمان ہو ، تو ایک لمحہ بھی آرام سے نہ بیٹھنا)

یہ وہ تڑپ تھی جو مسلمان کے ساتھ چلتی تھی یا مسلمان آگے بڑھتا چلا جاتا تھا یا اگر کہیں رکتا تھا تو یہ تڑپ اس کو بلند و بالا رکھتی تھی ۔ یہ تڑپ آ کے ہندوستان کے امتزاجِ حق و باطل میں کمزور ہو گئی ۔ ہم نے دیکھا کہ ہندوستان کے اندر ایک ایسی تہذیب و تمدن موجود ہے جس نے مگرمچھ کی طرح منہ کھولا ہوا تھا ، تہذیبوں کو کھانے کے واسطے ان کے نزدیک انسانیت کی تقسیم یہ تھی کہ اس نسل کے لوگ شریف اور باقی تمام کے تمام پلید اور اچھوت ہیں وہ پلیدوں اور اچھوتوں کو ختم کر دیتے تھے ، ستیاناس کر دیتے تھے ۔ ڈاکٹر مونجے دعوے کرتا ہے کہ ہم نے بیسیوں تہذیبوں کو ہضم کیا ہے لیکن ایک تمدن

جو ان سے ہضم نہ ہو سکا تھا ، تاریخ ہند کے اندر وہ اسلام کا تمدن اور اسلام کی تہذیب تھی ۔ بھائی پرمانند نے لکھا تھا کہ ہندو کی تعریف یہ ہے کہ جو شخص بھارت میں رہے اور ہندو کہلانے کے لیے تیار ہو جائے ، وہ ہندو ہوتا ہے ۔ ہم یہ نہیں پوچھیں گے کہ وہ ایک خدا کو مانتا ہے ، ۱۰ کو مانتا ہے ، ۲۰ کو مانتا ہے یا ۲۲ کروڑ کو مانتا ہے یا نہیں مانتا ، یہ ہم نہیں پوچھیں گے ۔ ہمارے نزدیک ہندو وہ ہے جو ہندوستان میں رہے بھارت دیش میں رہے اور ہندو کہلائے ۔ میں اب اس دوست ، جس نے سوال کیا تھا کہ کیا فرق تھا ان دونوں میں اور دو قوموں کا نظریہ کس طرح چلا تھا ؟ ان سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام جب ہندوستان میں آیا یا کسی اور جگہ گیا وہیں یہ نظریاتی اختلاف پیدا ہو جاتے رہے ۔ ایک نظریہ اسلام کا اپنا ہوتا ہے جسے مسلمان پلے باندھ کے چلتا تھا ۔ اس کو اپنی دنیا اور آخرت کا کفیل سمجھتا تھا اور پھر اس کے مقابلے میں وہ نظریات ہوتے تھے جو پہلے سے وہاں پر رائج ہوتے تھے ۔ مسلمان کو سکھایا یہ گیا تھا کہ

" ادعو الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن "

(تیرا کام دنیا میں پھرنا ہے ، تو پکارتا چلا جا انسانوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف)

" ادعو الی سبیل ربک بالحکمۃ "

(حکمت سے ، دانائی سے ، دانش سے ، فلسفے سے دوسروں کو دعوت دیتا چلا جا اور ان کو ساتھ ملاتا چلا جا)

" بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ "

(اور میٹھی میٹھی نصیحتیں بھی کر اور پیاری پیاری باتیں بھی سنا۔ ان کی زندگیوں کو سنوار۔ اس طرح ان کو اپنے ساتھ ملاتا چلا جا)

"وجادلھم بالتی ھی احسن"

(اگر مقابلہ ہی آ پڑے۔ مجادلے کی صورت پیدا ہو جائے تو پھر احسن طریق پر ان سے مجادلہ کر۔ ایسے طریق پر گفتگو کر کہ تیری گفتگو ان کے سینے میں گھر کر لے)

یہ طریقِ تبلیغ سیکھ کر مسلمان دنیا میں آیا۔ ادھر اُدھر پھرا، ہندوستان میں بھی آیا۔ ہندوستان میں ایک بڑی سخت قوم کے ساتھ اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ اس قوم کا تصور یہ تھا کہ انسان تو تین طرح کے ہیں۔

ایک برہما دیوتا کے منہ سے نکلے ہوئے برہمن۔

ایک برہما دیوتا کے بازوؤں سے نکلے ہوئے کھشتری۔

اور ایک برہما دیوتا کی رانوں سے نکلے ہوئے ویش۔

اور تیسری شق پر اپنے نظام کو ختم کر دیا۔ باقی جو کچھ بھی تھا، وہ برہما دیوتا کے پاؤں کے نیچے کی میل تھی۔ اب اس قوم سے اسلام کو یہاں واسطہ پڑا۔ وہ اسلام، جو خدائے بزرگ و برتر کی ساری مخلوق کو "یاایھا الناس" کہہ کر پکارتا ہے۔ اس اسلام کو یہاں پر ایک ایسی تہذیب و تمدن کے ساتھ ٹکر لینی پڑی، جس کے اندر انسانیت کو گرایا جاتا تھا (UN TOUCHABLE) اچھوت ہی نہیں تھے ان کے ہاں کے لفظ بلکہ UNLOOKABLE بھی ان میں تھے۔ نہ صرف وہ لوگ موجود تھے جن کو چھوا نہیں جا سکتا تھا بلکہ وہ لوگ بھی تھے، جنہیں دیکھا بھی نہیں جاتا تھا۔ اونچی جاتی والے دیکھتے نہیں تھے۔ قریبی زمانے تک

جنوبی ہند کے اندر کھلے بازاروں کے ساتھ دونوں طرف جو مکان ہوتے، ان کے پیچھے تنگ گلیاں ہوتیں، جن کے اندر وہ بدبخت اور منحوس انسان، اس زمانے کی نحوست سے آلودہ چلتے تھے اور ہاتھ میں ایک گھنٹی لے کر چلا کرتے تھے تاکہ ان کی آواز سے اونچی جاتی والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی ایسا آ رہا ہے، جس کو میں نے دیکھنا نہیں۔ ایک طرف وہ مسلمان جس کو چار دانگ عالم میں خدا کا نام پھیلانے اور انسانیت کی برتری، انسانیت کی یکسانیت اور انسانیت کی مساوات اور اخوت سکھانے کے لیے بھیجا گیا۔ اس کے مقابلے پر یہاں پر یہ قوم تھی جس کی ایک عرصے تک رگڑ رہی۔ یہاں پر ہم نے وہ دریا دل اکبرِ اعظم بھی پیدا کئے، جنہوں نے اس رگڑ کو کم کرنے کی کوشش کی لیکن کیا ذکر کروں کہ باوجود ایک ہندو رانی کے راجہ ہونے کے، اچھوت کے اچھوت ہی رہے۔ کھانا ان کے ساتھ نہیں کھا سکتے تھے۔ یہ وہ تمدن تھا کہ جس تمدن نے پھر آ کر ہمارے رگ و ریشے پر اثر کرنا شروع کیا اور اقبالؒ کہتے ہیں کہ اس کا آخری نتیجہ یہ ہو گیا کہ

"خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ"

مسلمان جو خالص سونا تھا، وہ یہاں آ کر مٹی میں ملا۔ اس نے دوسرے کا رنگ اختیار کرنا چاہا اور اپنے رنگ کو بگاڑنا چاہا۔ میں اب اختصار کے ساتھ اس بات کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے نتیجے میں ہر دور میں بزرگ پیدا ہوتے رہے جو یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے۔ اپنی فلاسفی آف لائف یا فلسفۂ زندگی، اپنی آئیڈیالوجی کو عمل میں لائے اور دوسروں تک پہنچائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مجددالف ثانیؒ اسی کام کے لیے مامور ہوئے اور انہوں نے مسلمان قوم کے تشخص اور مسلمان قوم کی علیحدہ شخصیت کا سبق دیا اور مسلمانوں کو ہندوؤں میں مدغم ہو جانے سے

بچانے کی تحریک جاری کی - یہ تحریک ہندوستان میں عام ہوئی - باوجود اس کے کہ بادشاہ کفر کے ساتھ جوڑ جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے - یہ کوششیں علما کی، اولیا کی، صوفیا کی یہ کوششیں اسں چیز کی طرف لے گئیں کہ مسلمان اپنے قدموں پر کھڑا رہے اور اپنے آپ کو قائم رکھ سکے - اسی کوشش میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی مسلمان کو یہ بتایا کہ تو ان میں کا نہیں، تو ان میں مل کر بگڑنے کے لیے نہیں آیا ہوا بلکہ تجھے ان کو سنوارنا تھا تیرے ذمے ان کا سنوارنا تھا - تیرا بگاڑ تیری انتہائی غفلت اور لغزش کا نتیجہ ہے - اس کے بعد پھر تاریخ نے اور بہت سے لوگ دیکھے تا آں کہ سرسید احمد اسی آواز کو لے کر اٹھے کہ اے مسلمان تو طائر سدرہ نشین ہے - تیرا مقام یہ نہیں ہے کہ ان کے ساتھ مل کر اس طرح کھپ ہو جائے - چنانچہ انہوں نے بھی مسلمانوں کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کا سبق دیا - دارالعلوم دیوبند میں، اور رنگ میں، دینی رنگ میں یہی سبق دیا گیا کہ مسلمان کو مسلمان بنایا جائے تاکہ اپنی اصلیت پر قائم ہو کر دنیا میں نتیجہ خیز ہو سکے - میں اس "نتیجہ خیز" لفظ پر آپ کو لانا چاہتا تھا کہ مسلمان ملکوں کا بھوکا نہیں تھا بلکہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی صداقت اور خدا کی طرف سے پہنچے ہوئے حق کو وہ چاہتا تھا کہ دنیا کے اندر عام ہو جائے اور خدا نے اس کو تسکین کے طور پر کہا تھا۔

"ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مؤمنين"

(کہ تم غم نہ کرو - تم ہو تو پرواہ نہیں ہے - پریشان نہ ہو جاؤ - سست نہ پڑو - تم ہی غالب آؤ گے، اگر تم مومن ہو)

اب "مومن" کیا ہے؟ مومن ایمان سے ہے اور ایمان علم، یقین اور ارادے کی مجموعی کیفیت کو کہا جاتا ہے - مومن وہ ہوتا ہے جسے اسلام کا یقین ہو، اس کی

درستی کا یقین ہو اور اس کے مطابق چلنے کا ارادہ ہو، اسے مومن کہا جاتا ہے - یہ تعریف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ہے کہ ایمان علم، یقین اور ارادے کی مجموعی کیفیت ہے - آج ہم ایمان کے اس حصے میں ہیں جس کا تعلق علم اور یقین سے ہے اور اس حصے کو ہم نے درست کر لیا تو ہم اپنے ارادوں کو بھی درست کر لیں گے - مسلمان کی فضیلت دنیا میں اسں چیز میں نہیں کہ یہ زیادہ اچھے کھانے کھاتا ہے یا کھانوں کے نام گنوا سکتا ہے یا اچھے کپڑے پہنتا ہے، طمطراق دکھاتا ہے، تزک و احتشام دکھاتا ہے نہیں بلکہ مسلمان خدا کا ہرکارہ ہے اور اس کا ایک پیغام لے کر دنیا کے اندر پھرتا رہتا ہے جب تک کہ :-

"تا نہ خیزد بانگ حق از عالمے
گر مسلمانی نیاسائی دمے"

(جب تک کہ کائنات کے ذرے ذرے کو مسلمان نہیں کر لو گے، اس وقت تک تمہیں بیٹھنا نہیں چاہیئے - اگر بیٹھ گئے تو تمہارے اسلام میں کمزوری ہے)

چنانچہ پاکستان جس وقت بنایا گیا تھا تو پاکستان کوئی ملک یا زمین یا جغرافیہ یا تاریخ کا کوئی ورق کاٹ کر علیحدہ کرنا مقصود نہ تھا - بلکہ جس طرح علامہ اقبالؒ نے ڈاکٹر نکلسن کو کہا تھا - جب انہوں نے کہا کہ آپ نے مخاطب مسلمانوں کو کیا ہے اور قدریں عالمی پیش کرتے ہیں، UNIVERSAL VALUES پیش کرتے ہیں اور مخاطب ایک محدود جماعت کو کرتے ہیں تو حضرت علامہ اقبالؒ نے ان کے خط کے جواب میں یہ لکھا تھا کہ میں اسلام کی جو ازلی، ابدی، عالمی، دائمی قدریں ہیں، ان کو دنیا کے سامنے پیش

کرتا ہوں لیکن مسلمان کو اس لیے مخاطب کرتا ہوں کہ دنیا میں مجھے ایک یہی قوم اپنی روایات کے لحاظ سے ایسی دکھائی دیتی ہے جو ان عالمی قدروں کو اپنا سکے ، انہیں سنبھال سکے ، انہیں عمل میں لا سکے اور انہیں دنیا تک پہنچا سکے ۔ حضرت علامہ اقبالؒ کے اس خط کے اس حصے سے ثابت ہو گیا کہ مسلمان دنیا کے اندر جُوع الارضی کا شکار نہیں ہے اسے زمین کی بھوک نہیں بلکہ یہ ایک پیغام رساں ہے ۔ ایک پیغامبر ہے ۔ اس پیغام کو لے کر یہ دنیا میں چلتا پھرتا رہتا ہے اور دنیا کی قوتوں کو جگاتا رہتا ہے تاکہ وہ نیکی پر آ سکیں ، بھلائی اختیار کر سکیں ، برائی سے بچ سکیں ۔ یہ کام ہمارے بڑوں نے کیا لیکن ہندوستان سے باہر ۔ یہ کام ہمارے بڑوں نے ہندوستان میں بھی کیا لیکن بقدر ولچسپ اکثر بادشاہت اور سلطنت کی طرف توجہ رہی ۔ نتیجہ اس کا یہ رہا کہ اسلام کی جو VALUES تھیں جو MORAL یا روحانی قدریں تھیں ، جن کی بنا پر اسلام آگے چلتا تھا ، یہاں پر ٹھنڈی ہونے لگیں ۔ جس وقت اس چیز کو ہمارے بزرگوں نے دیکھا کہ سلطنت بھی چلی گئی اور دینی روایات کی حیثیت اور اس کی حمایت ، یہ دونوں بھی چلی گئیں تو پھر حضرت علامہ اقبالؒ نے کہا کہ :-

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

(دو صدیوں کی غلامی سے ان کا دل ٹوٹ گیا ۔ ان میں وہ امنگ نہیں رہی کہ ہم اونچے ہیں ، ہم اونچے ہونے والے ہیں ، ہم دوسروں کو اونچا کر سکتے ہیں ۔ ہم اللہ تعالیٰ کی محبوب ملت ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے محبوبؐ کی امت ہیں)

" او رسلؐ را ختم و ما اقوام را "

(وہ رسولوں میں خاتم المرسلین اور ہم اقوام میں خاتم الاقوام ہیں)

ہم دنیا کے اندر آخری بڑی قوم ہیں ، جس کو دنیا میں ہدایت کے لیے پیش کیا گیا ۔ علامہ اقبالؒ نے شعر میں تو یوں کہا لیکن ان کی پریشان نظری کا دارو یہ سوچا کہ کچھ عرصہ ان کو ان سے علیحدہ کر دیا جائے جو ان کی خرابی کا باعث ہو رہے ہیں ۔ صحبتِ زاغ کو شاہین بچے سے علیحدہ کیا جائے اور شاہین بچے کو صحبتِ زاغ سے علیحدہ کیا جائے اس کو کہا جاتا ہے " پاکستان " ۔ پاکستان نہ نوکریوں کے واسطے تھا ، نہ پاکستان اقتصادی بدحالی کے دور کرنے کے واسطے تھا ، نہ پاکستان ہماری غربت کے علاج کے طور پر پیش ہو رہا تھا ۔ حقیقت میں پاکستان کا اعلیٰ ترین مقصد تو اسلام کو دنیا میں عمل میں لا کر دکھانا تھا ۔ باقی چیزیں جو تھیں وہ جس طرح تنخواہ کے ساتھ TA/DA مل جاتا ہے وہ تو مسلمان کی TA/DA میں باقی کی چیزیں آ جایا کرتی ہیں ۔ مسلمان کو یہاں پر بلند کرنے کے واسطے کہ یہ اپنی شان دکھا سکے اور دنیا کے سامنے اس رونق کو دوبالا کر دے جو رونق کہ اسلام کی تھی تاکہ دنیا والے ادھر آئیں ۔ اس کے واسطے حضرت قائداعظمؒ نے فرمایا کہ PAKISTAN IS GOING TO BE A LABORATORY FOR EXPERIMENTING ISLAMIC VALUES پاکستان ایک لیبارٹری یا معمل بننے والا ہے ، اسلامی قدروں کے دوبارہ تجربہ کرنے کا اب یہاں پر سے پاکستان کی تاریخ شروع ہو جاتی ہے اور جس کی تعریف کل سے آپ سنتے رہے ہیں ۔ ہم کہاں پر ہیں ، ہماری لیبارٹری کہاں ہے ، ہمارے EXPERIMENTS کہاں ہیں اور ہمارے تجربوں کا نتیجہ کیا ہے ؟ یہ حاصل کرنا ، دوبارہ حاصل کرنا گویا کہ

نظریۂ پاکستان کو زندہ کرنا ہے۔ نظریۂ پاکستان اس چیز کا نام ہے کہ اس سرزمین کے اندر اسلام رائج ہو، افراد پر بھی اور جماعتوں پر بھی اور حکومت پر بھی اور تمام قوتوں سے قوی تر قوت یہاں پر اسلام ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو جس کام کے لیے جس دعوے کے ساتھ آپ اٹھے تھے، وہ دعوے پورا نہیں ہوا۔ اب ہم دور نکل آئے، ربع صدی کے قریب ہم نے غفلت کی ہے۔ ہم نے اس کام کو جاری نہیں رکھا جس کام کے ذریعے سے اس کو صحیح طور پر معمل بنانا تھا، ایک لیبارٹری بنانا تھا، ایک کارگاہ بنانا تھا، وہ نہیں بنا سکے۔ آج بھی ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ میں مبارک باد پیش کرتا ہوں ٹیکسٹ بک بورڈ کو اس چیز پر کہ "مچٹکل" طور پر (مجھے معاف رکھیے اس لفظ کے استعمال پر) کتابیں لکھتے رہے لکھنے والے لیکن نہ کوئی زائچہ اور نہ کوئی نقشہ اور نہ کوئی پورا اس کا پروگرام بنایا گیا بلکہ کبھی کبھار تھوڑی سی جس طرح ہم کھانا پکائیں میٹھا اور اوپر چاندی کا ورق لگا لیتے ہیں۔ اسی طرح جو کچھ دل میں آئے وہ لکھ لکھا کر، اس کے اوپر اسلام کا نام لکھ کر اکثر یہاں پر چلتا رہا۔ اب باقاعدگی کے ساتھ اس چیز کی ریسرچ ہونی چاہیئے اور ٹیکسٹ بک بورڈ کے اندر تو غالباً پہلے سے ہو گا (مجھے چونکہ اس کی پوری ہیئت کا علم نہیں ہے۔ یقین رکھتا ہوں کہ ہو گا۔ اگر نہیں ہے تو یقین رکھتا ہوں کہ ہو جائے گا) ایک ایسا "احتسابی سیل" ہونا چاہیئے جو اسلام کے متعلق جو لٹریچر اس ملک کے اندر آتا چلا جاتا ہے، اس کا ساتھ ساتھ ہی جائزہ لے کر اس کی تردیدی کتابوں کی اشاعت کر سکے۔ یہ سب سے بڑا کام ہے۔ اس وقت مسلمان مر رہا ہے۔ پیاسا بھی ہے، پانی چاہتا ہے۔ پانی کی جگہ پر اسے زہراب دیا جاتا ہے اور یہ کوئی نہیں جانتا کہ اس زہراب میں سے زہر کو آپ کس طرح علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا

خطرہ ہمارے واسطے یہ ہے کہ ہم فارن ٹیکنیکس استعمال کر رہے ہیں، فارن آئیڈیالوجیز استعمال کر رہے ہیں، فارن فلاسفیز استعمال کر رہے ہیں۔ وقت ہوتا تو اس کی تشریح کرتا۔ میں صرف اجنبی فلسفے ہی کا ذکر کر دوں کہ اس وقت جو فلسفہ، اس کی چھوٹی کتاب لے کر بڑی کتاب تک اور بڑی کتاب سے انسائیکلوپیڈیا اور فلاسفی تک ہے، یہ فلسفہ کس تصورِ زندگی پر مبنی ہے۔ اس تصورِ زندگی پر کہ آدم سے گناہ ہوا تھا اور آدم کو خدا نے دھتکار دیا تھا اور آدم کی اولاد کو گناہ گار ٹھہرا دیا تھا۔ جاؤ، تمہارا بیٹا، تمہارے بیٹے کا بیٹا اور اس کے بیٹے کا بیٹا جب تک میں تمہیں واپس نہیں لوٹاتا، تم تمام کے تمام گناہ گار ہو۔

یعنی انسان کی کہانی یہ ہے کہ انسان پیدا ہی گناہ گار ہوا ہے، پلید پیدا ہوا ہے۔ اس کو ORIGINAL SIN کہا جاتا ہے۔ یہ تصور ہے کہ یہودیت اٹھی، یہی تصور ہے کہ عیسائیت اٹھی اور یہی تصور ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے تمام فلسفی، جنہیں بعض اوقات انکار کرنا پڑا اپنے مذہبوں کا ٹکریں مارتے ہوئے لیکن اس غلط انداز کے فلسفے پر مبنی زندگی بھی غلط سے غلط تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر آپ کے پاس یہاں آنے کی اجازت ہے تو آپ کھلے بندوں چل کر آئیں گے، عزت سے آئیں گے، استقبال کرائیں گے، آپ کو بلایا جائے گا، بٹھایا جائے گا، عزت سے پیش آیا جائے گا اور اگر خدا نہ کرے، خدانہ کرے، کوئی چور ہو، جس کو یہاں پہنچنے کا حق حاصل نہیں ہے تو وہ کس طرح آئے گا۔ چور دروازے سے آئے گا، چھپ چھپا کے آئے گا، اندھیرے سے آئے گا، ٹھوکریں کھاتا ہوا آئے گا۔ اسلام کے ماننے والوں کی اور باقی کے تمام ادیان کے ماننے والوں کی مثال یہ ہے کہ وہ

چوروں کی طرح گھر میں گھستے ہیں، ڈرتے ہوئے گھستے ہیں، اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے ہیں اور راستہ نہیں ملتا اور اسلام صحیح راستہ دیتا ہے، صحیح روشنی دیتا ہے لیکن افسوس کہ اس کی روشنی اس وقت اس کے اپنے ماننے والوں کو بجائے راستہ دکھانے کے چُندھیا رہی ہے۔ اگر ہم نظریۂ پاکستان کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ایک لفظ میں کہہ سکتا ہوں کہ " فوقیتِ اسلام " نظریۂ پاکستان ہے۔

اس ملک کے اندر آپ فکر میں، عمل میں، تجارت میں، زراعت میں، سیاست میں، تہذیب میں، تمدن میں، نظامِ مملکت میں، نظامِ دین داری میں اگر اسلام کی برتری اور اسلام کی فوقیت کو مُسلّم کرا دیں، تو پاکستان بن جاتا ہے ورنہ نام رکھنے کو تو بڑے بڑے نام رکھ لیے جاتے ہیں۔ بچارے کا قد ساڑھے تین فٹ ہوتا ہے تو وہ سربلند خان نام رکھ لیتا ہے، کوئی اسے روک تو نہیں سکتا۔ اگر آپ پاکستان میں پاکستان کے نام سے غلط مال بیچنا چاہیں تو دکان کچھ دن تو چلے گی لیکن معلوم ہوگا کہ یا آپ نے دھوکا کیا یا دوسرے نے دھوکا کھایا۔

تو میں اپنی گزارشات کو جو زیادہ طور پر جذباتی تھیں، ختم کرتا ہوں اور ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جن کے خیالات کو سننے کے بعد میرے دل میں یہ خیالات پیدا ہوئے جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر سکا ہوں۔ میں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں اور وہ ٹیکسٹ بک بورڈ کی اتھارٹیز کی خدمت میں نہایت ہی احترام کے ساتھ کہ جہاں وہ اتنے مفید کام کر رہے ہیں ان کو ایک " اسلامک ریسرچ سیل " یقیناً بنانا چاہیئے اور فوری طور پر بنانا چاہیئے اور کتابوں کا محاسبہ زبان کے اعتبار سے، طرزِ پیشکش کے اعتبار سے، نفسِ مضمون کے اعتبار سے، ہر طرح اپنی کتابوں کا بھی محاسبہ وہ کر رہے ہیں،

کرتے رہتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ باہر سے آئی والی کتابوں کا بھی محاسبہ کیا جائے تاکہ ملک کو ایسی غذا نہ ملے جو ہمیں زندگی کی بجائے موت کے گھاٹ اتار دے۔

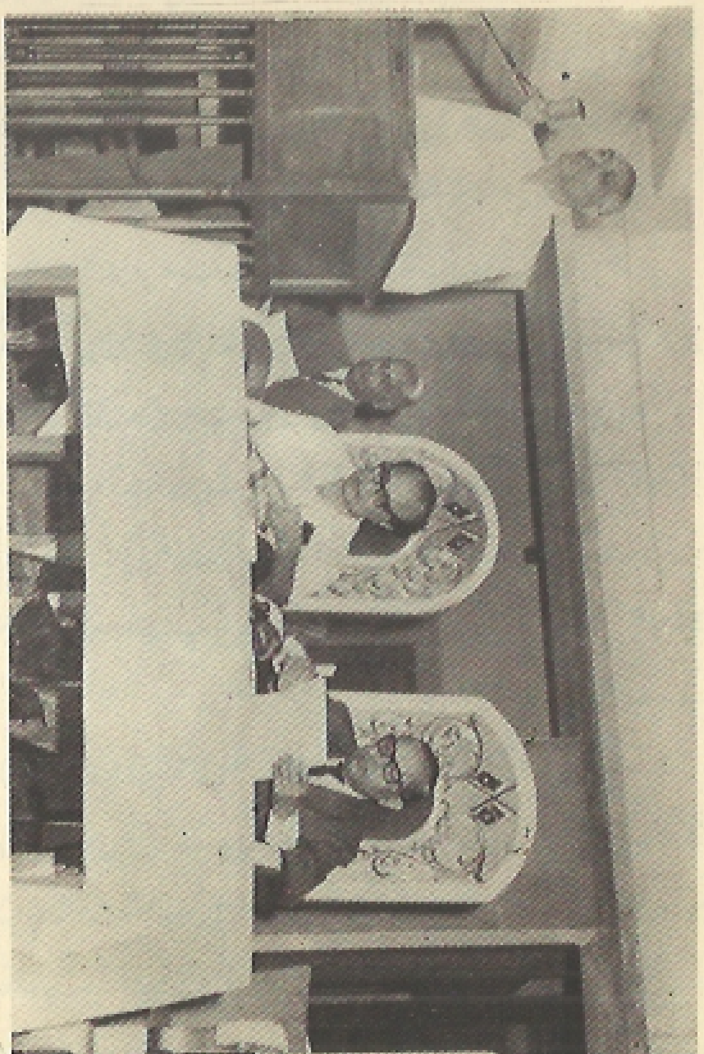

بورڈ کے ڈائریکٹر ریسرچ ڈاکٹر عبدالحمید مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر میاں نامدار خان کر رہے ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

موجودہ نصابی کتب نظریۂ پاکستان کی کہاں تک مظہر ہیں؟

ڈاکٹر عبدالحمید

یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ ہر نظامِ تعلیم ایک خاص معاشرتی اور اقتصادی ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اور ایک مخصوص فلسفۂ زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس کے مدرسوں میں پڑھائی جانے والی کتابیں اشتراکیت کے پس منظر میں لکھی جاتی ہیں اور بچوں کے دلوں پر اس نظام کی عظمت کا سکہ بٹھاتی ہیں۔ اسی طرح امریکہ کی درسی کتب کا مقصد یہ ہے کہ امریکی طرزِ فکر اور امریکی اقدار پر طالب علموں کا ایمان پختہ کیا جائے۔ انگلستان کی مروجہ کتابوں پر نظر ڈالیے تو وہاں بھی یہی اصول کار فرما نظر آئے گا۔ ان کتابوں میں نئی نسل کو بتایا جاتا ہے کہ برطانوی جمہوری ادارے نہ صرف جزائر برطانیہ کے شہریوں کے لیے باعث فخر ہیں بلکہ دُنیا کے ایک بڑے حصّے نے قبول کر رکھے ہیں۔ اعلیٰ علمی اور تحقیقاتی کتابوں کو چھوڑ دیجیے تو شاید ہی دُنیا کا کوئی ملک اپنے بچّوں کو غیر ملکی مصنفوں کی کتابیں پڑھاتا ہو کیونکہ اگر یُوں ہو تو اس سے تعلیم کا ایک بہت بڑا مقصد فوت ہو جائے۔ دُنیا کی تاریخ میں بہت سی ایسی مثالیں بھی مل جائیں گی جہاں سیاسی انقلابوں کے بعد نظامِ تعلیم کو یکسر بدل دیا جاتا ہے۔ جنوری ۱۹۳۳ء میں جب جرمنی میں ہٹلر برسرِ اقتدار آیا تو دوسرے مضامین کی کتابوں کے علاوہ، حساب کی کتابوں میں اس طرح کے سوال شامل کئے جانے لگے: "ایک بمبار کی رفتار ۲۵۰ میل فی گھنٹہ ہے تو بتایئے

کر وہ تین گھنٹے چالیس منٹ اور پچاس سیکنڈ میں کتنا فاصلہ طے کرے گا۔ "یا ایک بمبار ایک سیکنڈ میں اتنے سو پونڈ آتش گیر مادہ دشمن کے ہوائی اڈے پر پھینک کر اتنے مربع فٹ زمین کو صاف کر سکتا ہے۔ تو حساب لگا کر بتایئے کہ جس اڈے کا رقبہ اتنا ہو اُسے تباہ کرنے میں کتنا وقت لگے گا۔" وغیرہ وغیرہ۔

مارچ ۱۹۲۴ء میں اتاترک نے خلافت کے قدیم ادارے کو منسوخ کیا تو تاریخ اور ادب کی کتابوں میں بہت سی قطع و برید کی گئی۔ آزادی حاصل ہونے کے بعد ہمارے ہاں بھی "انگریزی راج کی برکتیں" اور "یا رب رہے سلامت فرمانروا ہمارا" جیسے مضمون اور نظمیں نصابی کتابوں سے خارج کر دی گئیں۔ ان دنوں بھی جبکہ عالمی شہرت اور بین الاقوامیت کے تصورات پر ہر طرف زور دیا جا رہا ہے، دُنیا کا کوئی مقتدر ملک اپنی تہذیبی اور قدرتی قدروں کو ہاتھ سے دینے اور اُٹھنے والی نسل کے ذہنوں کو غیر ملکی اثرات کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں معاملات کا رُخ کسی قدر مختلف ہے۔ میری ایک رفیق کار امریکن خاتون جو کسی زمانے میں ایف سی کالج لاہور میں شعبہ پولیٹکل سائنس کی صدر تھیں، ایک دفعہ بڑے دُکھ بھرے لہجے میں مجھ سے شکایت کر رہی تھیں کہ تمہارے طالب علم انگلستان اور امریکہ کے متعلق تو بہت کچھ جانتے ہیں لیکن اپنے ملک کے متعلق ان کا علم بہت کم ہے۔ YOUR STUDENTS KNOW A LOT ABOUT ENGLAND AND AMERICABUT HARDLY ANYTHING ABOUT THEIR OWN COUNTRY

اسی طرح جب پنجاب یونیورسٹی میں عمرانیات (SOCIOLOGY) کا شعبہ نیا نیا کھُلا تو ہر پرچے کی امتحانی ضروریات کے لیے امریکی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں (اکثر و بیشتر یہ صورت اب تک قائم ہے) ان کتابوں میں لازماً عمرانیات کے امریکی مسائل سے بحث کی جاتی

تھی اور تمام مواد امریکی تاریخ اور معاشرے سے حاصل کیا جاتا تھا۔ اپنے ملک کے وجود سے بے خبر ہمارے طالب علم انہی طویل اور دُور دراز مباحث کو حرزِ جان بنائے نہایت اعتماد کے ساتھ کمرۂ امتحان میں داخل ہوتے تھے۔ ٹھیک یاد نہیں ۱۹۵۸ء کا سال تھا یا اس سے اگلا، ایک ممتحن صاحب نے ایک پرچے میں مقررشدہ نصابی کتابوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تمام سوال پاکستان کے عمرانی مسائل کے متعلق دھر دیے۔ جو نتیجہ نکلا وہ بالکل ظاہر ہے۔ طالب علم ممتحن پر بُری طرح برسے۔ یہ کیا لغو پرچہ ہے۔ اس میں ایک سوال بھی کام کا نہیں۔ سوشیالوجی کے علمی مسائل کو پاکستان کے ساتھ کیا تعلق ہے! غرضیکہ ہر چھوٹے سے چھوٹا منہ بڑی سے بڑی بات بناتا تھا۔ یہ اندازِ گفتگو میرے لیے لمحۂ فکریہ ثابت ہوا۔ اس دن سے لے کر آج تک میں اسی عقیدے پر قائم ہوں کہ جن شخصوں کا علم اپنے ملک کے متعلق بہت محدود ہو جو غیروں کے اُگلے نگلے نظریوں کو بے سوچے قبول کر لینے کے عادی ہوں اور جو غیر ذرائع سے حاصل کیے ہوئے نظری علم کو ماحول کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کر سکتے ہوں، انہیں اپنے ملک سے کبھی کوئی لگاؤ پیدا نہ ہوگا۔ وطن سے محبت کرنا اور اس کی خاطر قربانی دینا تو بڑی بات ہے۔ اب ۱۹۷۱ء میں یہ بات ہم پر بہت اچھی طرح ظاہر ہو گئی ہے کہ قومی بقا اور قومی آزادی کی خاطر ہمیں بے حسی اور بے تعلقی کا پُرانا رویّہ ترک کرنا ہوگا، اور نہ صرف مملکت کی نظری بنیادوں سے پُوری طرح آگاہ ہونا ہوگا بلکہ ہماری ساخت کے بنیادی اصولوں سے جو نتیجے مرتب ہُوئے ہیں ان پر بھی عمل کرنا ہوگا جیسا کہ پولیٹکل سائنس کے ایک پختہ کار اُستاد نے کہا تھا۔ FREE, LIKE LOVE, HAS TO BE CONQUERED EVERY MINUTE OF OUR LIVES

یعنی قومی آزادی اور عجمیت دونوں کے بقا اور قیام کے لیے زندگی کے ہر لمحے میں جدّوجہد کرنا پڑتی ہے۔

اتنا کچھ کہہ چکنے کے بعد میں اس سوال کی طرف آتا ہوں کہ ہماری تاریخی اور نظریاتی بنیادیں کیا ہیں؟ میں اس کا علمی زبان میں کوئی جواب نہ دوں گا۔ کیونکہ پچھلے دو دن اس مذاکرے کا تمام تر سرمایہ گفتگو یہی رہا ہے۔ ہمارے معاشرے میں صدیوں سے اسلامی تصورات ہی نیکی اور بدی کو جانچنے کے پیمانے ہیں۔ "بے ایمان" کا لفظ ہمارے ہاں ایک گالی کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ کسی مسلمان کو سب سے زیادہ ذہنی کوفت اس بات سے ہوتی ہے کہ اسے اسلام سے منحرف قرار دیا جائے۔ یوں بھی اپنے گردوپیش اور روزمرہ کے واقعات پر نظر ڈالئے تو گلیوں، بازاروں، چائے خانوں اور کلبوں میں ہمارے شہری اپنے ملک کے متعلق بہت سی جا و بیجا نکتہ چینی کرنے کے عادی ہیں۔ اس قسم کی باتیں ہو رہی ہوں، تو حاضرین میں ہاں میں ہاں ملانے والے زیادہ اور ٹوکنے والے کم ہوں گے۔ لیکن ان ہی جگہوں میں اسلام کے متعلق گستاخی کرنے کی جرأت کسی کو نہ ہوگی۔ اگر کوئی ایسا کرے تو اکثریت اس کے پیچھے پڑ جائے گی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستانیوں کو اسلام اپنے وطن سے بھی زیادہ پیارا ہے اور دین کی گرفت ہمارے ذہنوں پر بہت مضبوط ہے۔ کئی سو سال سے برصغیر کے مسلمانوں کو اسلام سے گہری وابستگی اور دُنیائے اسلام سے بیحد عقیدت رہی ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے خلیفۂ وقت سے یمین الدّولہ کا خطاب پایا۔ التمش نے ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے بارگاہِ خلافت سے سند حاصل کی۔ فیروز شاہ تغلق نے خلیفۂ بغداد کے ایلچی کا شاہانہ استقبال کیا۔ ۱۲۵۸ء میں جب بغداد پر تباہی آئی تو اس کے بعد بھی مدّت تک خلیفہ کا

نام سلاطینِ دہلی کے سکوں پر ثبت ہوتا رہا۔ اس زمانے کا اسلامی معاشرہ کسی نہ کسی طرح کی وحدت ضرور تھی۔ ایک اسلامی ملک کا رہنے والا دوسرے اسلامی ملکوں میں بغیر ویزے اور پاسپورٹ کے بغیر سفر کر سکتا تھا، بلکہ بڑے بڑے عہدوں تک بھی رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ ابنِ بطوطہ طنجہ سے گھومتا ہوا جب دہلی میں پہنچا تو شہر کا قاضی بنا اور پھر ایک سفارتی مشن پر مامور ہوا۔ ایک ایرانی تارک الوطن مرزا غیاث صدرِ اعظم کے عہدے پر فائز ہوا۔ اس کی بیٹی مہر النسا، نور جہاں کا خطاب پا کر ملکۂ ہند بنی۔ موجودہ زمانے کی طرح کے "شہریت" کے قوانین کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہاں ترک، ایرانی اور افغان سب آئے۔ ان میں علماء تھے، سپاہی تھے اور طالع آزما بھی۔ لیکن کسی کو کبھی "غیر" یا "مہاجر" نہ کہا گیا۔ یہ سب باتیں ہماری روایات کا حصّہ ہیں۔ یہ دُرست ہے کہ مغل بادشاہوں کو خلافتِ عثمانی سے کوئی حسنِ ظن نہ تھا۔ لیکن پھر بھی مغلیہ دَور میں ترکوں اور ایرانیوں کا ایک تانتا بندھا رہا۔ مغلوں کی حکومت کے رُخصت ہونے اور برصغیر کے عہدِ جدید اور برطانوی عملداری میں داخل ہونے سے پہلے بھی اسلامی دُنیا کے معاملات میں ہندی مسلمانوں کی دلچسپی کی مثالیں موجود ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد کے دوران انگریزی سفیر متعینۂ استنبول نے خلیفۃ المسلمین سے اس مضمون کا فتویٰ حاصل کیا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف لڑنا جائز نہیں۔ ہنگامہ فرو ہوا تو قوم جدید تعلیم کی طرف مائل ہوئی لیکن لوگوں کو انگریزی معاشرت سے پُرانی چڑ باقی رہی۔ اگرچہ اس زمانے میں انگریزی جُوتے اکثر مسجدوں سے چُرا لئے جاتے تھے۔ لیکن علی گڑھ کے طالب علموں کے لئے ترکی ٹوپی اور ترکی فراک کوٹ کی یونیفارم مقرر کی گئی۔ کئی سال تک مسلمان شرفا یہی لباس پہنتے رہے۔ یہ ترکوں سے عقیدت کی ایک نشانی تھی۔ ۱۹۱۱ء کے بعد جب ترکوں

پر مصائب کا طوفان ٹوٹا تو مسلمانوں کی مسجدوں، گھروں اور اخباروں میں صرف ایک ہی مضمون پر گفتگو ہوتی تھی اور وہ مضمون ترکیہ تھا۔ ترکیہ اور دُوسرے اسلامی ملکوں کی ابتلا نے ہمارے لٹریچر پر بھی گہرا اثر چھوڑا۔ ابو الکلام آزاد کی بہت سی تحریریں، ظفر علی خان کی نظم و نثر اور اقبال کی شاعری کا ایک حصّہ اسی جذبۂ یگانگت کی یاد دلاتا ہے۔ مصطفٰے کمال کی کامیابیوں سے جو مسرت کی لہر یہاں دوڑی تھی وہ میرے بچپن کی ایک ناقابلِ فراموش یادداشت ہے۔ ۱۹۲۸ء میں جب امانُ اللہ خان کے خلاف بغاوت ہوئی تو ہمارے اخبار شروع سے لے کر آخر تک افغانستان کے ذکر سے بھرے پڑے تھے۔ اس زمانے کے ہندو اور مسلمان اخباروں کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں قوموں کی دُنیا الگ الگ تھی۔ ان کی اور ہماری دلچسپیوں اور ہمدردیوں میں کوئی چیز بھی مشترک نہ تھی۔ غرضیکہ برصغیر کے مسلمان انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک اسلامی دُنیا کے معاملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ رف RIFF ہو یا فلسطین، انڈونیشیا ہو یا حجاز کے معاملات۔ کوئی ملک ان کی ہمدردیوں سے باہر نہ تھا۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بہت سے کتابی اسباب بتائے جاتے ہیں۔ لیکن مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ان تمام عوامل میں جو تحریکِ پاکستان کے کامیاب اختتام پر منتج ہوئے یہ بات بہت اہم ہے کہ ہمارے معاشرے کو دُنیائے اسلام کے ساتھ بہت محبت تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ ہم بھی آزاد اسلامی ملکوں کی برادری میں شامل ہو جائیں اور دُکھ سکھ کے وقت ان کے کام آسکیں۔ اس تصور پہ ہمارے ملک نے اس طرح عملدرآمد کیا ہے کہ اقوام متحدہ میں ہمارے نمائندوں نے عرب اور اسلامی ملکوں کی بھرپور حمایت کی ہے۔ اس بات کی خاصی وضاحت کر چکا ہوں کہ قیامِ پاکستان

دُنیائے اسلام کے ساتھ ہماری دیرینہ ہمدردیوں کا ثمر ہے۔ یہ بات یاد رکھئے کہ ہماری حکومت اور ہمارے عوام اسلام کے متعلق بہت حساس ہیں۔ مذہب اور تاریخ پر جو کتابیں بیرونی ملکوں سے منگوائی جاتی ہیں، ان کی خوب چھان پھٹک کی جاتی ہے۔ اگر ان میں اسلام یا بانیٔ اسلامؐ کی شان میں کوئی نامناسب بات نظر آجائے تو کتاب قابلِ ضبطی قرار پاتی ہے۔ لوگ احتجاجی جلسے کرتے ہیں اور بعض دفعہ حکومتی سطح پر بیرونی حکومتوں کو لوگوں کے جذبات سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح بعض ایسی کتابیں جو بیرونی دُنیا کی نظروں میں معیاری قرار پا چکی ہیں، ہماری لائبریریوں میں نہیں رکھی جا سکتیں۔ اس قسم کی صرف دو مثالیں دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔ ایک ایچ۔ جی۔ ویلز کی OUT LINE OF WORLD HISTORY ہے اور دُوسرے HITTI کی عربوں کی تاریخ۔ ایک عجیب تر مثال یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء کی تعلیمی اصلاحات کے مرتب کرنے والوں نے بی ایس سی کے طالبعلموں کے لئے دُنیا کی تمدنی تاریخ کا ایک پرچہ لازمی قرار دیا۔ ساتھ ہی اس پرچے کی تدریس کے لیے ایک کتاب بھی مقرر کر دی۔ کتابوں کے تاجروں نے یہ کتاب براہِ راست امریکہ سے درآمد کی۔ جب یہ کتاب گاہکوں کے ہاتھوں میں پہنچی تو اس کے ہر نسخے میں سے اسلام کے باب کے چوبیس پچیس صفحے غائب پائے گئے۔ غالباً یہ عمل کسٹم ہاؤس میں مکمل کیا گیا تھا۔

ظاہر ہے جس قوم نے اس طرح کا ذہن پایا ہو وہ اپنی نصابی کتابوں کے معاملے میں کس درجہ محتاط اور اپنی آئیڈیالوجی کی حفاظت کے لئے کس قدر مستعد ہوگی۔ ۱۴۵۳ء کی فتحِ قسطنطنیہ کے بعد پاکستان کا معرضِ وجود میں آنا دُنیائے اسلام کی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ اگرچہ پاکستان بننے کے ساتھ ہی تعلیم و تعلّم کے موضوع پر بحث مباحثے

شروع ہو گئے تھے اور دسمبر ۱۹۴۷ء کے ماحول میں قائدِ اعظم کی ہدایت پر کراچی میں منعقد ہونے والی تعلیمی کانفرنس اس جذبے کا واضح ثبوت ہے۔ لیکن بعض حالات کی وجہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، تعلیمی اصلاحات کے سوال کو اکتوبر ۱۹۵۸ء میں قائم ہونے والی حکومت نے پہلے پہل اپنے ہاتھ میں لیا۔ طول طویل مباحثے ہوئے، رپورٹیں مرتب ہوئیں، سلیبس بنائے گئے اور اصلاحات کی گاڑی چلی۔ انہی اصلاحات کے تحت انگریزی، سائنس اور تاریخ کی کتابیں خود مرکزی حکومت کی نگرانی میں لکھوائی گئیں۔ دوسرے مضامین کی کتابیں ثانوی بورڈوں یا محکمۂ تعلیم نے لکھوائیں۔ اس کے بعد، دونوں صوبوں میں ٹیکسٹ بک بورڈ قائم ہوئے اور کتابوں کی آیندہ تیاری اور اشاعت کا کام ان کے سپرد ہوا۔

نظریۂ پاکستان کی عکاسی کے لیے چار مضمون خاص طور پر موزوں ہیں۔ اُن کے نام یہ ہیں۔ انگریزی، اُردو، سوشل سٹڈیز اور دینیات اس لیے اب میں اُن سے متعلق کتابوں کا "فرداً فرداً" ذکر کروں گا۔ انگریزی کی کتابیں لکھنے کے لیے مشرقی اور مغربی پاکستان کے اساتذہ کی جو ٹیم مقرر کی گئی اس کے مشیر مسٹر مارگن برٹش کونسل میں لسانی ماہر کے عہدے پر فائز تھے۔ میری اطلاع یہ ہے کہ اس کام کے دوران مسٹر مارگن کی رائے کو بہت وقعت حاصل تھی۔ ان کے پاکستانی رفقائے کار مسٹر مارگن کی قابلیت سے متاثر اور ان کی فنی صلاحیت سے مرعوب تھے۔ بہُت سا کام راتوں کو بیٹھ کر مسٹر مارگن خود کرتے اور اگلی صبح کمیٹی کی نشست میں پیش کر دیتے۔ معمولی سی افہام و تفہیم اور ردّ و کد کے بعد ان کے تیار کیے ہوئے سبق منظور کر لیے جاتے۔ میں نے بعض انگریزوں اور اینگلو سیکسن طرزِ فکر کے حامیوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ یہ کتابیں بالکل غیر نزاعی یعنی NON-CONTROVERSIAL ہیں۔ بات دُرست ہوگی لیکن پاکستان جیسی نظریاتی مملکت میں رسمی

کتابی مواد کافی نہیں، بلکہ وہ باتیں بیحد ضروری ہیں جو ہماری اپنی روایات اور اقدار کو واشگاف طور پر بیان کرتی ہوں۔ ہر چند کہ بچّوں کی کتابوں میں اس نقطۂ نظر کو داخل کرنے کے لیے بہُت سی فنی مہارت اور چابکدستی کی ضرورت ہے۔ لیکن جو شخص ہماری تہذیبی اقدار سے آشنا نہ ہو وہ نظریاتی مملکت کے تقاضوں سے انصاف نہیں کر سکتا۔ تکنیکی لحاظ سے یہ کتابیں یقیناً بہُت اعلےٰ ہوں گی لیکن نظریاتی اعتبار سے اتنی جاندار نظر نہیں آتیں۔

تاریخ کے مضمون کو بھی حکومت بہت اہمیت دیتی تھی۔ اس پر کتابیں لکھنے کے لئے بھی ماہرین کا بورڈ بنا جس کے سربراہ ملک کے ممتاز مورخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے۔ پاکستان میں تاریخ نویسی کے بُنیادی اصُول طے کئے گئے۔ کتابوں کی تدوین کا کام شروع ہوا۔ اس کام کا ایک بڑا حصّہ تو بہُت قابلِ قدر تھا اور اس میں مروّجہ تاریخوں کی پٹی ہُوئی راہوں سے نہایت خوشگوار انحراف نظر آتا ہے۔ لیکن کچھ وقت کی قلت کی اور کچھ نامکمل ایڈیٹری کی وجہ سے ایک کتاب کا پہلا حصّہ تو بالکل پرانی ڈگر پر لکھا گیا اور دوسرے حصّے کا ایک معقول حصّہ اخباری تراشوں کی مدد سے مرتب کیا گیا۔ یہ کتاب جلد ہی ناکام قرار دے دی گئی اور اس کے بہت سے مواد کو اگلے ایڈیشن سے خارج کرنا پڑا۔ بورڈ کی یہ توقع کہ پاکستان کی تاریخ، تاریخ ہند کا شاخسانہ OFF-SHORT نظر نہ آئے پُوری نہ ہو سکی۔ خاص کر پاکستانی علاقوں کی تاریخ کو اتنی جگہ نہ مل سکی جو طے پائی تھی۔

سوشل سٹڈیز کا مضمون پہلی دفعہ نصاب میں شامل ہوا۔ غالباً یہ غیر ملکی مشیروں کے اثر و رسوخ کا نتیجہ تھا۔ اس نے تاریخ اور جغرافیے کی روایتی حد بندیوں کو توڑ کر ایک ایسے مضمون کی بنیاد رکھی تھی، جس میں تاریخ، جغرافیہ اور شہریت ایک مربوط صورت میں

پیش کیے جائیں۔ خیال بڑا ٹھیک تھا لیکن اس میں دو قباحتیں ہوئیں۔ پہلے تو یہ کہ آٹھویں جماعت تک تاریخ اور جغرافیہ جیسے اہم مضمونوں کی جداگانہ حیثیت ختم کر دی گئی اور دوسرے نصاب سازی کے وقت تاریخ، جغرافیہ اور شہریت میں ربط پیدا کرنے کی طرف توجہ نہ دی جا سکی۔ قرار پایا کہ چالیس فیصد تاریخ، چالیس فیصد جغرافیہ اور بیس فی صد شہریت کو ملا دیا جائے تو سوشل سٹڈیز بن جاتا ہے۔ جو کتابیں لکھی گئیں وہ ایسے متفرقات سے بھری پڑی تھیں کہ طالب علموں کے لیے الجھن کا باعث بن گئیں۔ ان میں پاکستانی شہریت کی بجائے عالمی شہریت کا زیادہ خیال رکھا گیا تھا۔ تیار شدہ کتابوں کے بہت سے ابواب پہلے سال ہی نصاب سے خارج کرنے پڑے۔ ۱۹۶۶ء میں حکومت مغربی پاکستان نے ایک نیا سلیبس بنوا کر اور نئی کتابیں لکھوا کر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ نیا سلیبس پہلے سے کہیں بہتر تھا۔ اپنی موجودہ صورت میں اس مضمون کی بنیادیں ریت پر اٹھائی گئیں ہیں کیونکہ ان کتابوں سے بھی معاشرتی علوم کی واضح تصویر ہمارے سامنے نہیں آتی۔

دینیات کا مضمون اس نظریاتی مملکت کے لیے بے حد اہم ہے لیکن اس میں غیر متوقع مشکلات پیش آ گئیں۔ ہمارے ہاں خیری اور فطیری کی بحث شروع ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ سلیبس بنانے کے لیے مختلف الخیال لوگوں کو اتفاق کی لڑی میں پرونا پہلا کام ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ مغربی پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ کی کوششوں سے ایسی کتابیں مرتب ہو گئیں، جن پر مختلف مکاتیبِ فکر کے علما نے تصدیق کی مہریں ثبت کر دیں اور ایک اہم مسئلہ طے پا گیا۔ ان کتابوں میں قرآنی احکام، سیرت، نماز، روزہ اور دوسرے مسائل موجود ہیں۔ کتابیں آپ کے سامنے حاضر ہیں۔ ان کو ملاحظہ فرما کر ان کی افادیت کے متعلق آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن مذہب، سائنس اور جدید فلسفے میں افہام و تفہیم پیدا کرنے کا معاملہ

بہت نازک ہے۔ اس کے لیے غزالی اور اقبال جیسے دل و دماغ کے علما کی ضرورت ہے حکومتِ پاکستان کی ایک حالیہ رپورٹ میں اس مشکل کی طرف واضح طور پر اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ اس موقع پر میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جُوں جُوں ہماری یونیورسٹیوں کے اسلامیات کے شعبے اور اسی قسم کے دوسرے ادارے ان مسائل کی طرف توجہ دیں گے اور ان کی تحقیقات کے نتائج منظرِ عام پر آئیں گے، ٹیکسٹ بک بورڈ ان سے پورا پورا استفادہ کرے گا۔

بات پوری کرنے کے لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بعض فروعی اختلافات نے حال ہی میں یہ صورت پیدا کر دی تھی کہ دینیات کے نصابی مسائل کو مرکزی حکومت نے براہ راست اپنی نگرانی میں لے لیا۔ جناب علاء الدین صدیقی کی سرکردگی میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے اساتذہ اور علمائے دین کی ایک کمیٹی کی چند نشستیں پچھلے سال لاہور میں منعقد ہوئیں۔ سلیبس بنے اور وزارت تعلیم کے پاس بھیج دیے گئے۔ نتائج کا انتظار ہے۔

بیان کردہ تفصیل کا ماحصل یہ ہے کہ چند تبدیلیوں کو چھوڑ کر انگریزی، اردو اور دینیات کی موجودہ کتابیں بنیادی طور پر وہی ہیں، جو ۱۹۵۸-۶۱ء تک کی فضا میں قومی تاریخ کے ایک خاص موڑ پر لکھی گئی تھیں۔ وحدتِ مغربی پاکستان کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اردو کی کتابوں میں خوشحال خاں خٹک اور شاہ عبد اللطیف جیسے مضمون بھی شامل کیے گئے تاکہ تمام علاقوں کے بچوں کی دلچسپی کا باعث بن سکیں۔ انہی کتابوں میں محکمہ تعلیم کی ہدایت کے مطابق وقتاً فوقتاً اضافے ہوتے رہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد بہادروں اور شہیدوں کے کارناموں کو بچوں کے علم میں لانے کے لیے اضافی کتابیں تیار ہوئیں۔ حکومت کے محکموں اور دوسرے خود مختار یا نیم خود مختار اداروں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ہماری کارروائیوں کو کتابی سبقوں کی صورت میں لایا جائے۔ یہ محکمے صحت، امدادِ باہمی، قومی بچت،

زراعت وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ ان تمام مطالبوں پر بہت ہمدردی سے غور کرتا ہے لیکن ہماری سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ نصاب سازی ہمارے اختیار میں نہیں۔ آٹھویں جماعت تک کی کتابوں کے سلیبس محکمہ ہائے تعلیم بناتے ہیں اور سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری جماعتوں کے سلیبس سیکنڈری بورڈوں کی کمیٹیاں بناتی ہیں۔ جب یہ سلیبس ہمارے پاس آتے ہیں تو مصنفوں، ایڈیٹروں اور پرنٹروں کو مقرر کرنا ہمارا کام ہے۔ اگرچہ اب اس معاملے میں سیکنڈری بورڈوں اور ٹیکسٹ بک بورڈ کے درمیان بہت سا رابطہ قائم ہو چکا ہے تاہم ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہمارے پاس ہر ہفتے بہت سے خطوط اس مضمون کے آتے ہیں کہ آپ کی کتابوں میں فلاں بات ہونی چاہیئے اور فلاں بات نہیں۔ یہ مشورے اپنی جگہ پر نہایت قابلِ قدر ہوتے ہیں لیکن لکھنے والوں کے علم میں یہ بات نہیں ہوتی کہ سلیبس بنانے کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی۔

آج سے ستر سال پہلے کی بات ہے کہ مولانا الطاف حسین حالی نے سرسید کی سوانح عمری حیاتِ جاوید کے نام سے لکھ کر شائع کرائی۔ اس کی ابتدا میں ہی انہوں نے اپنے خاص انکسار کے انداز میں یہ بات لکھی کہ یہ عظیم کام کسی اور کے کرنے کا تھا لیکن جب کسی طرف سے آمادگی نہ پائی تو میں نے خود اس پر کمر ہمت باندھی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک نرم سے فقرے میں قوم کی ذہنیت کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہر چند کہ قوم میں لائق آدمیوں کی کوئی کمی نہیں جو ہر لکھی ہوئی کتاب پر نکتہ چینی کرنے کی اعلےٰ درجے کی قابلیت رکھتے ہیں لیکن قوم میں مزدوروں کا گھاٹا ہے۔ یہ بات غالباً اس وقت سے لے کر آج تک برابر درست چلی آرہی ہے۔ یہاں نکتہ چینیوں کی کمی ہے نہ نکتہ چینی کر اچھالنے والوں کی۔ یہ بات درست ہے کہ نکتہ چینی کرنے والا ایک اونچے پلیٹ فارم سے اپنے

تاثرات بیان کرتا ہے اور اس کو مصنف پر خواہ مخواہ ایک اخلاقی برتری حاصل ہو جاتی ہے۔ بہت سال ہوئے ہمارے ایک نامور صحافی نے بڑے دکھ کے ساتھ یہ بات کہی تھی کہ قوم کی DISLIKES کا تو آسانی سے پتہ چل جاتا ہے لیکن قوم چاہتی کیا ہے؟ اس کا سراغ لگانا بیحد مشکل ہے۔ جہاں الفاظ کی فراوانی اور عمل کا فقدان ہو وہاں ہر شہری ہر قسم کی واجب اور ناواجب نکتہ چینی کر چکنے کے بعد اپنے آپ کو اپنے شہری فرائض سے سبکدوش قرار دے دیتا ہے۔ کسی معاشرتی یا تعلیمی مسئلے کی نفی کرنا نسبتاً آسان ہے اور کوئی نئی راہِ عمل دکھانا دوسری بات ہے اور ملک کی حقیقی خیر خواہی۔ ٹیکسٹ بک بورڈ کے کارکنوں کو بھی شدت سے اصلاح کا احساس ہے۔ کتابوں اور ان کے مندرجات پر وقتاً فوقتاً جو آرا ہمارے پاس پہنچی ہیں، ان میں جو بہت سی کام کی باتیں ہوتی ہیں جن کو بلا تامل قبول کر لیا جاتا ہے۔ ہمارے ایسے کرم فرماؤں کی تعداد کم نہیں جو ایک کتاب کو شروع سے لے کر آخر تک نہایت توجہ سے پڑھتے اور اس کی زبان، محاورہ اور حقائق کی غلطیوں کو نہایت دِل نشین انداز میں ہم پر واضح کرتے ہیں۔ ہم ان کے تہِ دل سے ممنون ہیں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ بہت سی نکتہ چینی صرف برائے نکتہ چینی نظر آتی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سی نکتہ چینی کا محرک قومی ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہوگا لیکن سُنی سُنائی باتوں پر انحصار نہ کرنا اور تمام باتوں کو خود پڑھ کر اپنی بے لاگ رائے قائم کرنا ہمارے لئے ہمیشہ تقویت کا باعث ہوگا۔ معاشرے کا ہر ذمہ دار کارکن اس بات کو اچھی طرح سے سمجھتا ہے کہ مدح سرائی کرنے والے مداحوں کی نسبت، نیک نیتی سے ہمارے معائب دکھانے والے لوگ ہمارے صحیح دوست ہوتے ہیں۔ عام طور پر اس بات کا ذکر بڑے شد و مد سے کیا جاتا ہے کہ ہماری شائع کردہ نصابی کتابوں میں تحریکِ پاکستان

کے متعلق زیادہ مواد نہیں پایا جاتا، بچوں کو دین سے محبت کرنا نہیں سکھایا جاتا۔ نصابی کتابیں پڑھنے کے بعد بچے تاریخ اسلام سے ناآشنا رہتے ہیں اور ان کا نظریۂ پاکستان سے رابطہ پیدا نہیں ہوتا۔ ایک مشہور ماہرِ تعلیم نے ایک پبلک پلیٹ فارم پر اس بات کا اعلان فرمایا تھا کہ بچوں کی اخلاقی تربیت کے لیے ہمارے مشاہیر کا تذکرہ کتابوں میں ہونا ضروری ہے اور بورڈ کی کتابوں میں یہ ایک بہت بڑی کمی ہے۔ انہوں نے خاص طور پر صلاح الدین ایوبی کا نام لیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ بات تحقیق کے بغیر ہی کہہ دی تھی۔ ہمارے ایک نامور ادیب نے ایک بہت طویل مضمون کے دوران اس بات کا شکوہ کیا کہ ہم پرانی ڈگر پر قائم ہیں اور پاکستان بننے کے بعد اُردو کے نصابی تقاضوں سے ابھی تک ناواقف ہیں۔ ان کے مضمون کا مرکزی اعتراض یہ تھا کہ ہم پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے کے لکھے ہوئے "رواداری" مضامین کو خالص اسلامی موضوعوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے۔ اسی طرح بعض سمتوں سے یہ آواز بھی سنائی دیتی ہے کہ ہماری کتابوں میں اسلاف کے کارناموں کی روشنی میں بچوں کو جوش دلانے اور ان کے جذبات کو اُبھارنے والی باتیں نظر نہیں آتیں۔ ایسی باتیں ٹیکسٹ بک کے اصل مقام سے ناواقفیت کی غمازی کرتی ہیں۔ جہاں تک میری سمجھ کا تعلق ہے کتابوں کا کام اصل جذبات کی عقلی اور نظریاتی بنیادوں کو مستحکم کرنا ہے۔ معلم اور آتش بیان واعظ کے اغراض اور طریق کار جُدا جُدا ہیں۔

کتابوں میں نظریۂ پاکستان کی عدم موجودگی کا الزام ہمارے لیے بہت تکلیف دہ تھا اس لیے ایک محدود سروے کرایا گیا جس کے نتائج حسب ذیل ہیں۔

پہلی جماعت سے لے کر آٹھویں تک اُردو کی نصابی کتب میں نظریاتی اسباق کا پڑھایا جانا

ہے۔ ہر کتاب کا مزاج اسلامی اور پاکستانی ہے۔ نظریۂ پاکستان، اسلامی تعلیمات، ثقافت، اخلاق و آداب اور عقائد پر مبنی اسباق کافی تعداد میں موجود ہیں۔ تیسری اور چوتھی میں کم اور باقی جماعتوں میں زیادہ۔ تجزیہ میرے پاس موجود ہے۔ اعداد و شمار کی زبان میں یوں بات کی جا سکتی ہے کہ پہلی سے لے کر آٹھویں جماعت تک اُردو کی کتابوں کو ملا کر دیکھا جائے تو ان میں نظریۂ پاکستان پر ۶۰ اور اسلامی تعلیمات اور اسلامی اقدار و اخلاق پر ۴۵ سبق ہیں۔ اور یہ کل مواد کا ۸۵٪ بنتا ہے۔

جہاں تک اسلامیات کا تعلق ہے اسلامی اخلاق اور سیرت نبوی پر چوتھی جماعت میں ۳۲ فیصد، پانچویں جماعت میں ۴۰ فیصد، چھٹی جماعت میں ۴۵ فیصد، ساتویں جماعت میں ۵۵ فیصد اور آٹھویں جماعت میں ۶۵ فیصد اسباق ہیں۔ اسی طرح معاشرتی علوم میں اسلامی ہند کی تاریخ اور تاریخ اسلام پر چھٹی جماعت میں ۴۲ فیصد، ساتویں جماعت میں ۵۷ فیصد اور آٹھویں جماعت میں ۸۰ فیصد مواد موجود ہے۔ ان اعداد میں نثری اور درسی کتابوں کو شامل نہیں کیا گیا لیکن ان کلاسوں میں بھی بحیثیت مجموعی حالت بہت مختلف نہ ہوگی۔

اس صورتِ حال کی موجودگی میں پریشانی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی لیکن پھر بھی بعض اطراف و جوانب سے یہی کہا جائے گا کہ یہ کتابیں نظریۂ پاکستان کی عکاسی نہیں کرتیں۔ ہرچند ہم کہیں کہ "ہے" لیکن وہاں سے "نہیں ہے" کی صدائے بازگشت آئے گی۔ میں نے اس بات پر کسی قدر غور کیا ہے اور مجھے چند باتیں نظر آتی ہیں، جو شاید اس مسئلے کے حل میں مدد دے سکیں اور ہماری مبینہ ناکامی کی وجوہات پر روشنی ڈال سکیں۔

پہلی وجہ تو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اگر کتابوں کو غور سے پڑھ کر ان کا تجزیہ کیا جائے اور کتابوں میں نظریۂ پاکستان کے ہونے یا نہ ہونے کے متعلق خود اطمینان کر لیا جائے تو شاید نکتہ چینی کا انداز مختلف ہو۔ کتابوں کو پڑھے بغیر نکتہ چینی کرنے والے افراد ہماری مشکلوں

میں اضافہ تو نہیں کرتے لیکن اپنے لیے تضیع اوقات کا سبب ضرور بنتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تحریک پاکستان اور نظریۂ پاکستان پر مستند کتابوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ یہ مطالبہ کہ یہ دونوں موضوع تعلیم کے ہر سٹیج پر داخل نصاب ہوں، درست اور جائز ہے۔ لیکن ہم میسر اور حاضر مواد کے بغیر آگے بڑھنے سے معذور ہیں۔ جوں جوں ہماری یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے ان مضامین میں نئی باتیں اور تنوع پیدا کریں گے، ہمارے مصنف اور ایڈیٹر خود بخود ان سے استفادہ کرتے چلے جائیں گے۔ اس ضمن میں ریسرچ سکالر پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یونیورسٹیوں میں تحقیق و تدقیق کی تیز رفتاری ہمیں اس کام میں نہ صرف مدد دے گی بلکہ ہمارے بہت سے بنیادی تقاضے بھی پورے کرے گی۔ انگریزی زبان کا یہ مقولہ کہ ندی اپنے منبع سے اونچا بہنے کی قدرت نہیں رکھتی، یہاں بھی بالکل صادق آتا ہے۔ یونیورسٹیاں علوم و فنون کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے نظریات ابتدائی جماعتوں سے لے کر انتہائی درجوں تک تعلیم کے خدوخال کو متاثر کرتے ہیں۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس پر ایک اور بات کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہم پچھلے ایک سو سال سے یہ شکایت کرتے چلے آئے ہیں کہ انگریز اور ان کے حلیف ہندو مورخوں نے اسلامی ہند کی تاریخ کے ساتھ انتہائی تعصب برتا ہے۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد قلم ہمارے ہاتھ میں بھی ہے لیکن مجھے معلوم نہیں کہ ان دھبّوں کو دھونے کے لیے کتنی کتابیں ایسی لکھی گئی ہیں، جنہوں نے بین الاقوامی دنیا میں اپنا مقام پیدا کیا ہو۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ان کی تعداد صرف ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ کئی سال تک میرا یہ مشغلہ تھا کہ قائدِ اعظمؒ پر اخباروں کے جو سپلیمنٹ اور خاص نمبر شائع ہوا کرتے تھے، ان کو بڑے غور سے پڑھا کرتا تھا۔ ایک

مرحلے پر آ کر میرے ذوق و شوق میں نمایاں کمی آ گئی۔ کیونکہ ہر دفعہ وہی پرانی داستان مانوس الفاظ میں دہرائی جاتی ہے۔ اس سے جہاں اور بہت سے مہلک نتیجے نکلتے ہیں، وہاں موضوع کی اہمیت میں بھی واضح کمی واقع ہوتی ہے۔

تیسری وجہ جو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ہماری کتابوں میں بعض دفعہ ضرورت سے زیادہ INFORMATION دی جاتی ہے۔ سرسید احمد خاں، سید امیر علی، علامہ اقبال کا ذکر جہاں جہاں آیا ہے، وہاں شبہ ہوتا ہے کہ شاید ان رہنماؤں کا BIO-DATA دیا گیا ہے۔ بچپن، تعلیم، جوانی، روزگار، تصنیفات، بیماری اور وفات، تمام باتیں انسائیکلوپیڈیائی انداز میں یکجا کر دی جاتی ہیں۔ لیکن موضوع ذکر کی ہماری قومی زندگی میں جو اہمیت ہے اس کو کم ہی واضح کیا جاتا ہے۔ بہت سے حقائق کو تھوڑی سی جگہ میں سمیٹنے کی کوشش کی جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اقبال کی تمام تصانیف کے نام تو غالباً چوتھی یا پانچویں جماعت کی کتاب میں بھی مل جائیں گے لیکن ان کی تعلیم کیا تھی اور ہماری قومی زندگی میں انہوں نے سرسید اور قائدِ اعظمؒ کے درمیانی عرصے میں جس خلا کو پر کیا اس کا ذکر کہیں نہیں ملے گا۔ سید امیر علی کے متعلق ان کے ولایتی وظیفہ پانے سے لے کر پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کی ممبری تک سب جزئیات دی جاتی ہیں لیکن مفکر اور مورخ کی حیثیت کو یا تو بالکل چھوڑ دیا جاتا ہے یا محض دو تین سطروں میں مضمون کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ سرسید کا کام انقلابی نوعیت کا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے حالات و واقعات بیان کرنے کے بعد ان کو انقلاب پسند کا خطاب دیا ہے۔ اقبال نے ان کو مذہب پر INDEPENDENT CRITICISM کا بانی ہونے کی حیثیت سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ موضوع کی نزاکت کے باوجود بھی اعلیٰ جماعتوں کے طالب علموں کو اس مسئلے سے متعارف کرایا جا سکتا ہے۔ سرسید کو نہایت غلط طور پر دو

قومی نظریے کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ نظریہ نیا نظریہ ہی نہ تھا بلکہ ایک محسوس تاریخی حقیقت تھی۔ لیکن اگر آپ نظریے کی حیثیت سے ہی اس کا مطالعہ کریں تو مجدّدِ الفِ ثانیؒ اور سیّد احمد شہیدؒ کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا شاہ ولی اللہ کے ضمن میں یہ بات بتانا نہایت ضروری ہو گا کہ انہوں نے بہت سے نزاعی مسائل کی افہام و تفہیم میں میانہ روی اختیار کی اور ایسے ایسے حل پیش کئے جو عامۃ المسلمین کے لیئے قابلِ قبول ہوں۔ انہوں نے زوال پذیر معاشرے کی خصوصیات گنوائیں اور سلطنت کے انحطاط کی معاشی اور معاشرتی وجوہ پر زور دیا۔ یہ اور اس قسم کی کئی اور باتیں نہ مکمل کر بیان کی جاتی ہیں اور نہ ہی کتابوں میں جگہ پاتی ہیں۔ اسلوبِ بیان کی شگفتگی بھی کتاب کی کشش میں اضافہ کرتی ہے۔ ہمارے ہاں آزاد، حالی اور شبلی پر حرف گیری کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن ان کے اندازِ بیان کی گرد کو پہنچنے والے بھی کم ہیں۔ خاکم بدہن میں موجودہ دور کے صاحبِ طرز ادیبوں کے کمالات کا منکر نہیں لیکن وہ اس میدان میں نہیں اُترے۔ شاید اقبال کی کہی ہوئی بات کہ "گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے" ابھی تک دُرست چل آ رہی ہو۔

آخری بات میرے خیال میں یہ ہے کہ ہماری تعلیم کچھ اس ڈھب پر ہوئی ہے اور جاری ہے جس میں اینگلوسیکسن ANGLO-SAXON طرزِ فکر نے ہمارے دِل و دماغ میں جگہ حاصل کر لی ہے۔ عمرانیات، تاریخ اور سیاست کے طالبِ علم برسوں تک انگریز اور امریکی مصنفوں کی کتابیں پڑھتے پڑھتے ان کے نظریوں کو اپنے نظریے سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ تصویر کا دُوسرا رُخ کبھی ہمارے سامنے نہیں آتا۔ ترکیہ، فرانس، جرمنی اور روس اِن سب ملکوں کا عالمی تاریخ کے متعلق اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے لیکن ہم اس سے بیشتر ناواقف

ہیں اور ہمارا نقطۂ نظر وہی ہے جو ہم نے انگریز اور امریکی مصنفوں کی لکھی ہوئی نصابی کتابوں میں پڑھا ہے۔ اور ہم دُنیا کے واقعات کو انہی کے پیدا کئے ہوئے تعصبات کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارا جمہوریت اور جمہوری اداروں کے متعلق وہی تصور ہے جو ہم نے انگریز اور امریکی مفکروں سے حاصل کیا ہے۔ طرزِ کہن پہ قائم رہنا آسان اور اپنے لئے نئی راہ نکالنا دشوار ہے۔ لیکن اگر ہم اس مشکل راستے پر چلنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں تو یقیناً نظریاتی مملکت کے تقاضوں سے ناواقف ہیں۔ مجھے وہ پاکستانی نوجوان کبھی نہ بھولے گا جو روز ویلٹ ثانی کی موت کو دُنیا کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ تصور کرتا تھا۔ اور جو اس کا سوگ بالکل اسی طرح منا رہا تھا جیسے اپنے کسی خاندانی بزرگ کا۔ نہ ہی میں کبھی اس فاضل پروفیسر کو فراموش کر سکتا ہوں جو ۱۹۵۸ء کے عراقی انقلاب کی خبر سُن کر بے اختیار کہہ اُٹھا I AM SORRY FOR MR. DULLES,HE MUST BE THE MOST WORRIED MAN TODAY. دُنیا کے واقعات کو دُوسروں کی عینک سے دیکھنے کی عادت ایک خطرناک رجحان کو ظاہر کرتی ہے۔ اس لئے شاید یہ بات بھی ضروری ہو کہ کتابوں کے مصنفوں کو "نظریۂ پاکستان" سے پُوری طرح آشنا کرنے کے لئے مناسب تدبیریں اختیار کی جائیں۔

ڈاکٹر اصغر علی شیخ مقالہ پیش رہے ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نصابی کتب میں نظریۂ پاکستان کو پیش کرنے کے بارے میں تجاویز

ڈاکٹر اصغر علی شیخ

چار دن پہلے کی بات ہے، میں چند دوستوں کے ساتھ ایک جگہ کھانے پر مدعو تھا۔ کھانے کے بعد صاحبِ خانہ نے ٹیلی ویژن سے تواضع کی۔ ادھر ٹیلیویژن پر اشتہار نمائی ہو رہی تھی ادھر احباب میں یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا کہ بچوں کے دل و دماغ میں نظریۂ پاکستان، درسی کتابوں کے ذریعے کیوں کر راسخ کیا جائے۔ دراصل اس بحث کا محرک میں ہی تھا۔ کیونکہ اس طرح توقع تھی کہ فاضل دوستوں سے کچھ ایسے نکات مل جائیں گے، جنہیں اس مذاکرہ میں پیش کیا جا سکے۔ ابھی بحث زیادہ دور نہیں نکلی تھی کہ ٹیلی ویژن پہ ایک نووارد فلم کا خاصا طویل اشتہار دعوتِ نظر دینے لگا۔ اس کے مناظر ہماری بچی کھچی روایات و اقدار کے اعتبار سے بھی کم از کم حیا سوز کہے جا سکتے ہیں۔ پاکستانی فلم اور ولایتی کلبوں کی بے باک رقاصی! ——— ایک دوست نے فرمایا۔ یہ لیجئے نظریۂ پاکستان کی وہ تعبیر، جو ابلاغِ عامہ کے ادارے ہر گھر میں پہنچا رہے ہیں۔ حقیقی اور دلفریب! ——— دوسرے دوست نے تائید کی، جب تک ٹیلی ویژن فرنگی تہذیب اور لادینی نظریات

کی ترجمانی کرتا ہے گا۔ درسی کتابوں میں نظریۂ پاکستان کے وعظ بے اثر ہوں گے میں نے پوچھا، کیوں؟ بولے۔ کتاب کی نسبت ٹیلی ویژن زیادہ موثر ذریعۂ ابلاغ ہے۔ کتاب تو محض نظریات ذہن تک پہنچاتی ہے لیکن ٹیلیویژن ایک ایسی پُرتاثیر سمعی بصری اعانت ہے جو خیالات و نظریات کو دل و دماغ میں اتار سکتی ہے۔ کتاب سے اثرپذیری کے لئے خاص حد تک ذہنی پختگی اور چند مہارتوں کی ضرورت ہے لیکن ٹیلی ویژن سے "اکتسابِ فیض" تو ہر سادہ بچہ بھی کر سکتا ہے اور مطلق اَن پڑھ شخص بھی۔ اس کا دائرہ وسیع، اس کا عمل وقیع!! بات دُرست تھی اور مدلّل —— مانے بغیر چارہ نہ تھا، لیکن ایک اور دوست نے سہارا دیا کہ اس گفتگو سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ اساتذہ اپنی تدریس میں اور مولفین اپنی کتابوں میں ان نظریات کا پرچار نہ کریں جو ہمارے لیے ایمان کا درجہ رکھتے ہیں، جن پہ ہمارے وطن عزیز کی بنیادیں استوار ہیں۔ بلکہ اس سے تو اس خیال کو اور بھی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ ان حالات میں جب تبلیغ و اشاعت کے موثر آلات و ذرائع منفی اقدار و رجحانات کی ترویج میں مصروف ہیں ہم عملِ تدریس اور درسی کتب میں ان کی تکفیر و تکذیب کا زیادہ اہتمام کریں اور مثبت انداز میں ان محرکات و اساسیات کی وضاحت کریں جو پاکستان کے قیام کا سبب ہیں۔ لہٰذا یہ لازم ہے کہ درسی کتابیں ہماری قومی اور دینی اقدار و روایات کی ترجمانی کریں۔ درسی کتاب کا کام محض چند معلومات بہم پہنچانا نہیں بلکہ اسے بچوں کے ذہنوں کی تعمیر اور سیرت و کردار کی تشکیل میں ایک موثر آلۂ کار ثابت ہونا چاہیئے —— تعلیم کا سب سے بڑا فریضہ یہی ہے کہ وہ بچے کو اپنے معاشرے میں کامیاب اور مفید زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کرے اور تعلیمی عمل میں

درسی کتاب نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کتاب انسانی اخلاق کو سنوارتی بھی ہے اور بگاڑتی بھی ہے لہٰذا ہم یقیناً ایسی درسی کتابوں کی حمایت کریں گے جو ہماری ملت کی اخلاقی و روحانی اقدار کے احیا میں معاون ہوں۔

اس پر ایک دوست نے اعتراض کیا کہ درسی کتابوں کو مخصوص نظریات کی اشاعت کے لئے استعمال کرنا دُرست نہیں۔ درسی کتاب کو صرف علم کی ترسیل کا فرض پُورا کرنا چاہیئے۔ اسے عقائد و نظریات کا مبلغ نہیں بننا چاہیئے —— بظاہر یہ بات بھی دل کو لگتی ہے لیکن احباب نے متفقہ طور پر اس سے اختلاف کیا۔ ان کا ارشاد تھا کہ اوّل تو تعلیم کا مقصد محض معلومات بہم پہنچانا ہے ہی نہیں، تعلیم کا اوّلین مقصد تو شخصیت کی تعمیر کرنا ہے۔ دُوسرے تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے جس کا کام نظریاتی اقدار کو محفوظ رکھنا اور نسلاً بعد نسلٍ آگے منتقل کرتے رہنا ہے۔ یہ مقصد اسی صُورت میں حاصل ہو سکتا ہے، جب درسی کتابیں اسی نقطۂ نظر سے لکھی جائیں۔ مزید برآں دُنیا میں جتنے بھی مُعاشرتی نظام موجُود ہیں، ان کی حامل ریاستیں اپنے نصاب اور درسی کتب میں اپنے مخصوص نظام کی اساسیات کو کھُلے دِل سے پیش کرتی ہیں۔ بحث میں روس اور چین کا ذکر آیا جہاں ایک مخصوص رجحان اور نظریہ پُوری تعلیم پر حاوی رہتا ہے۔ امریکی درسی کتابوں کا حوالہ دیا گیا جو جمہوریت کے عمل اور اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بچّوں کو تیار کرتی ہیں۔ انگلستان کی درسی کتب جمہوریت و شاہ پرستی کی آئینہ دار ہیں۔ ایران کی کتابیں شاہ پسندی کے رجحانات کو نمایاں کرتی ہیں —— جب باقی ممالک کا یہ عالم ہے تو پاکستان تو خالصتاً نظریاتی مملکت ہے بلکہ ایسی مملکت جس کا اساسی نظریۂ حیات پہلے وجُود میں آیا اور اس کے

جغرافیائی خدوخال بعد میں اُبھرے — ایسی مملکت کے لئے تو اور بھی ضروری ہے کہ وُہ اپنے نظریات وعقائد کو تعلیمی عمل میں مرکزی حیثیت دے۔

جب ہم نظریۂ پاکستان کی بات کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ذہنوں میں ابھی تک کچھ ابہام سا موجود ہے، یا کم از کم نظریۂ پاکستان کے خدوخال اور نقوش زیادہ واضح اور روشن نہیں۔ یہ بات واقعی حیرت افزا ہے۔ آخر یہ ابہام کیوں ہے؟— جب ہم تسلیم کرتے ہیں کہ نظریۂ پاکستان اسلامی طرزِ فکر اور اسلامی ضابطۂ حیات سے عبارت ہے تو ہم واضح طور پر اس کا اعلان کرتے ہوئے شرماتے کیوں ہیں؟ ہم ایسے اقدامات سے کیوں گریز کرتے ہیں، جن سے وُہ طرزِ زندگی اپنانے میں مدد ملے جو اسلام کو مطلوب ہے۔ قائدِ اعظمؒ کے اس واضح اعلان کے باوجود کہ پاکستان کا قیام فی الحقیقت اس وقت عمل میں آگیا تھا جب برِ صغیر میں پہلا شخص مسلمان ہوا تھا، ہم نظریۂ پاکستان کو اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی عوامل میں کیوں اُلجھا دیتے ہیں۔ اس حقیقت سے تو ہمارا کوئی دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ محض اس لئے کیا تھا کہ ہم مُسلمان تھے، مسلمان رہنا چاہتے تھے اور ہم ایسا خطۂ زمین چاہتے تھے جہاں اسلام ایک زندہ اور متحرک معاشرے کی حیثیت سے موجُود ہو۔ کیا یہ دُرست نہیں کہ قیامِ پاکستان کی بنیاد لا الٰہ الا اللہ قرار پائی تھی؟ کیا یہ دُرست نہیں کہ ہر وُہ فکری، عملی اور اخلاقی اسلوبِ حیات جو ہمیں اسلام نے عطا کیا اور جو ہمیں بہ حیثیت مسلمان دُوسری قوموں سے ممتاز کرتا ہے، نظریہ پاکستان کا جزو لاینفک ہے — اگر یہ سب کچھ دُرست ہے — اور یقیناً درست ہے — تو ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اپنی نئی پود کو نظریۂ پاکستان یا بالفاظِ دیگر اسلامی ضابطۂ حیات سے روشناس کرانے

کے لئے اپنے نصاب اور اپنی درسی کتابوں میں مناسب تبدیلیاں کریں۔ اور اپنے تدریسی مواد کو اس طرح پیش کریں کہ ہمارے بچوں کی سیرت میں وہ تمام نقوش اُبھر آئیں جو ایک سچے مسلمان اور قابلِ فخر پاکستانی کا طرۂ امتیاز ہونے چاہییں۔

سامعینِ کرام!

پچھلے دو دن میں آپ کو اعلیٰ پائے کے علمی مقالات سُننے کا موقع ملا اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ آپ نظریۂ پاکستان کے ترکیبی عناصر سے بخُوبی آگاہ ہو چکے ہیں۔ مَیں نہایت اختصار سے نظریۂ پاکستان کی ان اساسیات کا تکرار کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کیونکہ اس طرح یہ بات زیادہ واضح ہو جائے گی کہ ہم اپنی درسی کتابوں میں کون سے موضوعات اور پیشکش کا کیا طریقہ اختیار کریں کہ ہمارے بچے نہ صرف نظریۂ پاکستان کو سمجھ لیں بلکہ اسے اپنا بھی سکیں۔

نظریۂ پاکستان میں جس خیال کو خشتِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے وُہ اسلامی قومیت کا تصور ہے۔ یعنی اسلام کے نام لیوا دُنیا کی دُوسری تمام قوموں سے منفرد اور ممتاز ہیں، ان کی اپنی قومیت ہے اور الگ تہذیب اور الگ تمدن ہے۔ اس قومیت کی بنا نہ اتحادِ وطن ہے، نہ رنگ ونسل اور زبان کا اشتراک۔ مسلمانوں کو جو چیز متحد قوم بناتی ہے وُہ اُن کا دین ہے۔ خدائے لاشریک اور نبیِ آخر الزماںؐ پر اُن کا ایمان۔

نظریۂ پاکستان کی دُوسری اساس یہ ہے کہ مسلمانوں کا نظامِ حیات صرف اسلام کے تابع ہے۔ ان کی معیشت ہو کہ معاشرت، تہذیب ہو کہ ثقافت، حکُومت ہو کہ سیاست وہ اسلام ہی سے ہدایت پاتی ہے۔ چنانچہ پاکستانیوں کے لئے جو چیز مابہ الامتیاز ہے وُہ خٹک ناچ ہے نہ بھنگڑا، لُڈی ہے نہ کلاسیکی رقص۔ پاکستانی تہذیب

کے سوتے گندھارا آرٹ اور بدھ کے مجسموں سے نہیں پھوٹتے بلکہ اس کی ثقافت کے دھارے یثرب و بطحا کی سرزمین سے نکلتے ہیں اور پورے عالمِ اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

پاکستانیوں کے لیے جو چیز سرمایۂ افتخار بن سکتی ہے وہ موہن جو داڑو یا ہڑپہ کے دھندلے نقوش نہیں بلکہ وہ اسوۂ حسنہ ہے جو آفتاب نصف النہار کی طرح درخشندہ و تابندہ ہے۔

نظریۂ پاکستان کا تیسرا بنیادی پتھر جمہوریت ہے۔ اسلام کا مزاج جمہوری اور شورائی ہے۔ اس میں آمریت اور استبداد کی کوئی گنجائش نہیں لہٰذا پاکستان میں ہمیں اسلامی تعلیمات کے مطابق جمہوری اقدار کو فروغ دینا ہے۔

نظریۂ پاکستان کا چوتھا بنیادی اصول اسلامی حکومت کا قیام ہے۔ اس کا مطلب پورے نظامِ زندگی کو اسلام کے مطابق رواں دواں کرنا ہے۔ لہٰذا ہمیں کھلے دل سے پورے اسلامی نظام کو یعنی انفرادی زندگی سے لے کر ملکی قوانین اور سیاسی ضابطوں تک اسلام کے مطابق رائج کرنا ہے اور اس مبہم کیفیت کو ختم کرنا ہے جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسلام نہیں بلکہ اسلام کی دی ہوئی چند اقدار مثلاً حُبّ الوطنی، دیانت، اتحاد وغیرہ کو اختیار کر لیا جائے۔ اس طرح کی پہلو دار تاویلات ختم ہونی چاہئیں۔

احترامِ آدمیت نظریۂ پاکستان کی پانچویں اینٹ کہی جا سکتی ہے۔ اسلام نے انسان کو قابلِ تکریم بنایا ہے۔ ولقد کرمنا بنی آدم۔ یہ تکریم عام ہے۔ ہر انسان خواہ وہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، اس کا رنگ کچھ ہی ہو، اس کا عقیدہ کیسا ہی ہو، معاشی اعتبار سے متمول ہو یا مفلس، وہ محض انسان ہونے کی حیثیت سے قابلِ احترام ہے۔ البتہ اللہ کے نزدیک قابلِ عزت وہی ہے جو متقی ہے۔ انّ اکرمکم عند اللہ اتقٰکم

نظریۂ پاکستان کا چھٹا بنیادی اصول بقائے باہمی ہے۔ پاکستان ایک امن پسند ملک ہے۔ وہ خود امن سے رہنا چاہتا ہے اور دوسروں کو بھی امن و سکون کی زندگی بسر کرتے دیکھنا چاہتا ہے۔ پاکستان کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ مسلمان پُر امن زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ قائدِ اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے خطبوں میں یہ بات بارہا واضح کی گئی ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد پڑوسی ممالک میں زیادہ پُر امن تعلقات استوار ہوں گے۔ پاکستان آج تک اس اصول پر قائم ہے۔ کاش کہ ہمارا ہمسایہ بھی اس اصول پر عمل کرتا۔ پاکستان بین الاقوامی روابط میں بھی امنِ عالم کے فروغ کا خواہاں ہے۔

عدل و انصاف کا قیام نظریۂ پاکستان کا ایک اہم جزو ہے۔ ہم بحیثیت مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ پوری دنیا میں عدل و انصاف کا بول بالا ہو۔ بڑی طاقتیں چھوٹی طاقتوں کی کمزوری سے فائدہ نہ اٹھائیں اور کمزور ممالک کو یہ یقین ہو کہ طاقتور دشمن کے مقابلے میں امن پسند ممالک اس کے حامی ہوں گے۔

نظریۂ پاکستان کی ایک اور اہم بنیاد عہد و پیمان کی پابندی ہے۔ یہ عہد و پیمان افراد کے درمیان ہو یا اقوام کے مابین اس کا تقدس اس کی پابندی کا تقاضا کرتا ہے۔ قرآن نے "اَوفُوا بالعُقُود" کہہ کر اسے ایک فرض قرار دے دیا ہے۔

یہ ہیں وہ چند بنیادی اصول جن سے نظریۂ پاکستان کو واضح شکل دی جا سکتی ہے۔ نظریۂ پاکستان کی سلامتی اور اس کا تحفظ اس بات میں مضمر ہے کہ ہم ان اصولوں کی حفاظت کریں۔ ان کی بقا کی ضمانت دیں، ان کی ترویج و اشاعت کی کوشش کریں۔

ان کی ترویج و اشاعت میں بہت بڑا حصّہ تعلیم و تدریس کا ہے۔

سامعینِ گرامی قدر!

اب تک کی بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ نظریۂ پاکستان کوئی مبہم شے نہیں جسے سمجھا اور سمجھایا نہ جا سکے۔ یہ کوئی ایسا مجرّد اور نازک خیال نہیں جو الفاظ کے جامے میں سما نہ سکے یہ ایک ٹھوس متحرک اور جاندار تحریک سے عبارت ہے جس کے مظاہر واضح اور عناصرِ ترکیبی مشہور ہیں۔ ان کو سمجھنے سمجھانے کے لئے کسی حکمتِ لقمانی یا مکالماتِ افلاطونی کا مرہونِ منت ہونا ضروری نہیں۔ یہ بات بھی طے ہو چکی ہے کہ درسی کتابوں میں قومی نظریات کی تعلیم و ترغیب کوئی عیب ہے نہ جرم بلکہ یہ ایک ایسا حق ہے جو ہر قوم اور ہر نظریاتی مملکت نے ہمیشہ استعمال کیا ہے۔ سپارٹا اور قدیم یونانی تہذیب سے لے کر عصرِ حاضر تک عمل تعلیم کے ذریعے سب قوموں نے اپنے مخصوص نظریے کو عام کیا اور آئندہ نسلوں کو یہ ورثہ منتقل کیا ہے۔

لہٰذا اب جو مسئلہ ہمارے زیرِ غور ہے وہ یہ کہ ہم ان نظریات کو درسی کتابوں میں کس طرح سموئیں کہ اس میں مختلف درجاتِ تعلیم کا لحاظ بھی ہو نفسِ مضمون اور نصاب کے تقاضے بھی پورے ہوں، کتاب میں دلچسپی اور سلاست کی خوبیاں بھی موجود ہوں اور بچوں میں اسلامی اخلاق اور روحانی اقدار بھی پرورش پائیں۔

سب سے پہلے مسلم قومیت کے تصور ہی کو لیجیے۔ ہمارے قومی شاعر علامہ اقبالؒ اس کے زبردست حامی تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس خیال کو انہوں نے فلسفیانہ بنیاد دیں عطا کیں اور برصغیر کے مسلمانوں نے یہ سبق انہی سے سیکھا۔ لیکن یہ ایک عجیب سانحہ ہے کہ ایم۔ اے کی سطح سے نیچے کسی درجہ پر اقبالؒ کو اس حیثیت سے پڑھایا ہی نہیں جاتا

مثلاً آٹھویں جماعت تک کی اردو کی کتابوں میں اقبال کا کہیں کہیں ذکر موجود ہے لیکن وہ یا تو ان کے مختصر حالاتِ زندگی تک محدود ہے یا پھر ان کی ایک آدھ نظم جو انہوں نے ابتدائی دور میں بچوں کے لئے لکھی تھی شاملِ نصاب ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبالؒ کے اصل خیالات ہمارے بچوں تک نہیں پہنچ رہے اور وہ اقبال کے ان عظیم نظریات سے ناواقف ہیں جن کی وجہ سے اقبال قومی اور اسلامی شاعر کہلاتے ہیں۔ کیا یہ علامہ کے ساتھ ناانصافی نہیں کہ ان کا وہ پیغام جو قیامِ پاکستان کا باعث بنا اور ان کا فلسفہ جو نظریۂ پاکستان کی اساس ہے وہ پاکستانی نژادِ نو تک نہیں پہنچ رہا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ پوری اسلامی دنیا انکے عظیم افکار و خیالات سے مستفید ہوتی لیکن حیف صد حیف کہ ہماری درسی کتابوں میں اقبال کو کچھ اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے گویا وہ محض پنجاب کا ایک شاعر ہے۔ اگر کسی ایک آدھ کتاب میں اقبال کو شامل کیا جاتا ہے تو ساتھ ہی دوسرے صوبوں کے شاعروں کو اس لئے بالمقابل بٹھایا جاتا ہے کہ اقبال کے فکرِ جمیل سے دوسری زبانوں کے لوگ خفا نہ ہو جائیں۔ حالانکہ اقبال عالمی اور آفاقی مفکر ہیں۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ کلامِ اقبال کے وہ حصّے الگ جمع کئے جائیں جن میں عالمگیر اسلامی اخوت کا نظریہ پیش کیا گیا ہے اور بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق ان خیالات کو نثر میں بیان کیا جائے اور بالخصوص انگریزی، اردو، معاشرتی علوم اور اسلامیات کی کتابوں میں شامل کیا جائے۔ اسی طرح سیّد جمال الدین افغانی وہ عظیم مفکر ہیں جنہوں نے بین الاسلامی اتحاد کا تصور پھیلایا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک تحریک بھی چلائی۔ ہماری درسی کتابوں میں جمال الدین افغانی کا نام بہت کم آتا ہے البتہ معاشرتی علوم کی کتب میں چند سطری تذکرہ مل جاتا ہے۔

عالمگیر اخوت اور برادری کا صحیح تصور دینے کے لئے اُردو، انگریزی، معاشرتی علوم اور اسلامیات کی کتابوں میں ایسے مضامین شامل کئے جاسکتے ہیں، جن میں اسلامی ممالک کے باہمی اتحاد کی اہمیت و افادیت کو نمایاں کیا گیا ہو۔ اسلامی رشتۂ اخوت کے علاوہ ان مادی، معاشرتی اور سیاسی فوائد کا بھی ذکر کیا جائے جو اس اتحاد سے حاصل ہو سکتے ہوں مثلاً اسلامی دُنیا کے مادی وسائل کتنے اہم اور کثیر ہیں کہ اگر یہ خود انہیں استعمال کریں اور باہم لین دین اور تجارت کریں تو نہ صرف اسلامی ممالک کی معیشت مستحکم ہو جائے گی۔ بلکہ اس سیاسی استحصال کا بھی خاتمہ ہو جائے گا جس کا اصل سبب اسلامی ممالک کی نا اتفاقی ہے۔

متحدہ اسلامی قومیت کے نظریے کو فروغ دینے کے لئے اسلامی تہذیب و تمدن کے سرچشموں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی طرف رجوع لازم ہے لیکن ہماری کتابیں ان کے شایان شان ذکر سے خالی ہیں۔ حالانکہ یہ وہ مقامات ہیں جو پوری اسلامی دُنیا کی عقیدت کا محور ہیں۔

درسی کتابوں میں اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے شامل ہونا چاہیئے۔ اسلامی قوانین اور اسلامی شعائر کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ اسلام محض چند عقائد و عبادات کا مجموعہ نظر نہ آئے بلکہ پوری زندگی کے ساتھ اس کا بھرپور رابطہ نمایاں ہو اور یہ محسوس ہونے لگے کہ اسلامی نظام حیات کو اختیار کرنے سے کوئی فرد کس طرح ایک مثالی انسان بن جاتا ہے۔ ہم طلبا کو ایسی کہانیاں اور واقعات سُنائیں جن سے یہ پتہ چلے کہ عربوں کی اسلام سے پہلے کیا حالت تھی اور قبولِ اسلام کے بعد ان کی زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب آگیا ——

—— مسدس حالی کے وہ حصے جہاں انہوں نے عربوں کی قبل از اسلام اور بعد از اسلام کیفیات کی تصویر پیش کی ہے، درسی کتابوں میں ضرور شامل ہونے چاہئیں۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ اور ائمہ کرام کی زندگیوں سے ایسے واقعات شامل نصاب ہونے چاہئیں جن میں اسلامی تمدن و معاشرت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی ہوتی ہو مثلاً تجارت کے اصول، دشمنوں سے سلوک، ہمسایوں سے رواداری، محنت اور مزدوری کی عادت، معاہدات کی پابندی، تمام دُنیاوی امور میں دینی احکام کا لحاظ وغیرہ ایسے واقعات ہیں۔ جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیم مکمل اور جامع ہے۔ وہ دُنیا کو بھی حسین بناتی ہے اور آخرت کو بھی کامیاب کرتی ہے۔

ہمیں درسی کتابوں میں اسلامی حکومت کے خدوخال واضح طریق سے پیش کرنے چاہئیں اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے ذہنی آمادگی کی فضا پیدا کرنی چاہیئے۔ کتابوں میں ایسا موادِ تدریس پیش کیا جائے کہ بچے اسلامی حکومت کی برکات سے واقف بھی ہو جائیں اور متفق بھی۔ کتنی بد نصیبی کی بات ہے کہ یہاں ابھی تک کچھ لوگ اسلامی حکومت کا کچھ ایسا بھیانک نقشہ پیش کرتے ہیں کہ نظریاتی طور پر اس سے اتفاق رکھنے والے لوگ بھی دل سے نہیں چاہتے کہ عملاً اسلامی حکومت قائم ہو۔ ہمیں نئی نسل کے سامنے اسلامی حکومت کی ایسی صحیح اور واضح تصویر پیش کرنی چاہیئے کہ ان کے دِلوں میں شکوک و شبہات راہ نہ پا سکیں۔ اسلامی تاریخ سے ایسی بیشمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے زیر سایہ ہر فرد بشر کو جان، مال اور آبرو کا تحفظ، فکر و نظر کی آزادی، عدل و انصاف اور ترقی کے بے شمار مواقع نصیب ہوتے ہیں۔ اسلام ایسے معاشرے کو جنم دیتا ہے جہاں چوری

ڈاکہ، قماربازی، رشوت، ناجائز دباؤ، بیجا سفارش، خویش پروری اور اس طرح کی دوسری معاشرتی برائیاں پیدا ہی نہیں ہو سکتیں۔ اسلامی معاشرہ ان تمام امتیازات کی نفی کرتا ہے، جو انسان کو دولت یا حسب و نسب کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں۔

اگر ہماری کتابوں میں صدارتی طرزِ حکومت، پارلیمانی نظام اور بنیادی جمہوریت کے فوائد بیان کیے جا سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہماری معاشرتی علوم اور اسلامیات کی کتابیں اسلامی طرزِ حکومت کے فیوض و برکات سے خالی ہیں۔ کیا ہم "اسلامی حکومت کی برکات" اس طرح بھی بیان نہیں کر سکتے، جس طرح کبھی ہم "انگریزی راج کی برکتوں" کو بیان کیا کرتے تھے۔

اسلام جمہوری اقدار کو رائج کرتا ہے لہٰذا درسی کتابوں میں جمہوری قدروں کا اس طرح ذکر کیا جائے گا کہ طلبا، جمہوریت کی اہمیت، اس کے فوائد اور تقاضوں سے کماحقہ آگاہ ہو جائیں۔ مقامِ افسوس ہے کہ ابھی ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ تک بھی جمہوریت کی صحیح روح سے روشناس نہیں ہوا۔ تا بدیگراں چہ رسد ــــ ہماری اکثریت آج بھی اپنے حقوق سے اور ذاتی مفادات سے واقف ہے لیکن ایک اسلامی اور جمہوری ملک کے شہری کی حیثیت سے جو فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کا شعور الا ماشاءاللہ مفقود کے برابر ہے۔

امریکی معاشرے میں جمہوریت مذہب کا درجہ رکھتی ہے اور وہاں کی درسی کتابوں میں جمہوری طرزِ زندگی کی خوب خوب اشاعت کی جاتی ہے۔ مدرسے کی تمام سرگرمیاں جمہوری طریق سے انجام پاتی ہیں۔ طلباء کی انجمنوں کے قیام اور مدرسے کے انتظام و انصرام میں طلباء کے اشتراک کے ذریعے بچوں کو جمہوری طرزِ عمل سے

روشناس کرایا جاتا ہے۔ ہم بھی اپنی درسی کتابوں میں ایسے مضامین اور کہانیاں اور سکول کے پروگرام میں ایسی سرگرمیاں شامل کر سکتے ہیں، جن سے جمہوری شعور میں پختگی پیدا ہو۔ مختلف معاملات میں مشورے کی اہمیت، دوسروں کی رائے کا احترام، دوسروں کی خواہشات اور ضرورت کا لحاظ، معاشرتی فرائض کی ادائیگی صرف جمہوریت کی کتاب کے موضوعات نہیں بلکہ انہیں اردو، انگریزی، معاشرتی علوم کی درسی کتابوں میں بطریقِ احسن سمویا جا سکتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ یہ اقدار مکالموں، ڈراموں، واقعات اور کہانیوں کی صورت میں پیش کیے جائیں مثلاً اردو کی کتابوں میں "وقت کا خیال" "ہمسائے کے نام خط" "باجہ بل گیا" قسم کے مضامین اس طرز کی عمدہ مثالیں ہیں۔

اسلامی جمہوریت کی عمدہ مثالیں اسلامی تاریخ کے ہر دور سے مل سکتی ہیں۔ خلفائے راشدین کا زمانہ تو مثالی ہے ہی، اسلامی ہند کے مسلمان بادشاہوں کے بیشمار واقعات ایسے ہیں جن سے ان کے جمہوری طرزِ عمل کی وضاحت ہوتی ہے۔ بادشاہوں کا یہ جمہوری مزاج ہی تو تھا کہ ایک ادنیٰ غلام ترقی کرتے کرتے بادشاہ بن سکتا تھا۔

اسی سلسلے میں اسلامی رواداری، اقلیتوں سے حسنِ سلوک اور دوسری اقوام سے فراخدلانہ تعلقات کی مثالیں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ عباسی خلفا کے ہاں غیر مسلم علما کا احترام، اورنگزیب عالمگیر کی فوجوں میں ہندو جرنیلوں کا تقرر، اسلامی رواداری کے ثبوت نہیں تو کیا ہیں!

احترامِ آدمیت

یوں تو اسلامی نظام کا نام ہی تمام برکات کا ضامن ہے لیکن احترامِ آدمیت کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کا الگ تذکرہ بھی لازم ہے۔ اقبال نے تو اسی عمل کو

تہذیب و انسانیت کا مترادف قرار دیا ہے۔

با خبر شو از مقامِ آدمی　　　آدمیت احترامِ آدمی

برتر از گردوں مقامِ آدم ست

اصلِ تہذیب احترامِ آدم ست

حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خطبۂ حجۃ الوداع بالخصوص ایک جامع منشور کی حیثیت رکھتا ہے جس میں احترامِ آدمیت کو نکھار کر پیش کیا گیا ہے یہ ایسا منشور ہے جس کا ہماری کتابوں میں بار بار ذکر آنا چاہیئے اور ہمارے طلبا کے ذہنوں پر اس کے گہرے نقوش ثبت ہونے چاہییں۔

اسلامی قوانینِ جنگ کے مطالعے سے یہ علم ہوتا ہے کہ اسلام میں انسانی جان و آبرو کو کس قدر محترم قرار دیا گیا ہے۔ عین حالتِ جنگ میں بھی بچوں، عورتوں، ضعیفوں، صلح کے خواہاں اشخاص کے ساتھ روا داری اور حسنِ سلوک کا درس دیا گیا۔ بدترین دشمن کی لاش کی بے حرمتی بھی منع کر دی گئی ہے۔

جہاں کتابوں میں احترامِ آدمیت کے تدریسی مواد کا شامل کرنا ضروری ہے، وہاں یہ بھی لازم ہے کہ استاد کا اپنا طرزِ عمل، اندازِ گفتگو اور طلباء سے روابط بھی اس احترام کے مطابق ہوں۔ گالی دینا، طعنہ زنی کرنا، جسمانی سزا دینا، بالخصوص کان پکڑوانا، ٹھڈے مارنا، دھکے مار کر کمرے سے باہر نکالنا، ذلت آمیز ناموں سے پکارنا ــــ احترامِ آدمیت کی نقیض ہیں۔ مدرسے کی نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں میں اس امر کا خاص اہتمام کیا جائے کہ طلبا کی انفرادیت جِلا پائے اور ان کا احترام مجروح نہ ہو۔

بقائے باہمی

اسلام افراد و اقوام کو باہم پُر امن زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے۔ طلبا کے کردار میں اس جذبے کو شامل کرنا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے تاریخی کہانیوں کے علاوہ فرضی حکایات بھی شاملِ نصاب کی جا سکتی ہیں۔ جس میں بقائے باہمی کے اصولوں کو اجاگر کیا گیا ہو اور آپس میں امن و امان سے رہنے کے فوائد واضح کئے گئے ہوں۔

مدینہ منورہ میں حضورؐ نے یہودیوں سے جو معاہدات کئے اور پھر ان کو جس حسن و خوبی سے نبھایا، منافقین تک سے جس طرح روا داری کا رویہ اختیار فرمایا وہ ایک نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔ کتابوں میں ایسی کہانیاں، ڈرامے اور مکالمے شامل ہوں جن سے بچوں کے دلوں میں دوسروں کے حقوق اور آزادی کے احترام کا احساس اُبھرے ــــ

لیکن بقائے باہمی کا مطلب کمزوری یا بزدلی نہیں۔ ظالم کو چھٹی دیئے رکھنا یا مظالم سہنا اس اصول کا تقاضا نہیں۔ اسلام اس سلسلے میں اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کا جامع اصول پیش کرتا ہے۔ لہٰذا بچوں میں باطل کے خلاف ڈٹ جانے اور حق کی خاطر جہاد کرنے کا جذبہ بھی بیدار کرنا چاہیئے۔ اس ضمن میں سعدی و رومی کی بہت سی کہانیاں مفید مطلب ثابت ہو سکتی ہیں۔

درسی کتابوں میں جس چیز کی کمی مجھے شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ ہمارے قومی مشاہیر و زعما کا تذکرہ یا تو سرے سے نہیں یا نہایت مختصر اور غیر مؤثر انداز میں ہے۔ جس سے نہ تو ان مشاہیر کی شخصیت نکھر کر سامنے آتی ہے اور نہ اس سے وہ تاثیر پیدا ہوتی ہے جو طلبا کے کردار میں تبدیلی کا ذریعہ بن سکے۔ قائدِ اعظمؒ پاکستان کے سب سے بڑے ہیرو اور رہنما ہیں۔ آپ ہی نے ہمیں دو قومی

نظریے سے روشناس کرایا اور انہی کی مسلسل اور پُرخلوص جدوجہد نے کاروانِ ملت کو پاکستان کی منزل پر پہنچایا۔ قائدِاعظمؒ کی زندگی بے شمار قابلِ ذکر اور لائقِ تقلید واقعات سے پُر ہے۔ لیکن درسی کتابوں میں قائدِاعظمؒ کی شخصیت اور زندگی کو بھی ایک عام واقعاتی رنگ میں بیان کیا گیا ہے، جس سے بچوں کی شخصیت پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

نظریۂ پاکستان کے اظہار کا تقاضا یہ ہے کہ قائدِاعظمؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو حسین انداز میں طلبا کے سامنے پیش کیا جائے۔ ان کے اقوال اور خطبات کے اقتباس جابجا پیش کئے جائیں اور کسی مضمون کی کتاب بھی اس سے خالی نہیں ہونی چاہیئے۔ اسی طرح علامہ اقبال کو مصورِ پاکستان کا نام تو دیا گیا ہے لیکن جو تصور اور تصویر انہوں نے بنائی تھی اس کے متعلق سرے سے کوئی مواد کتابوں میں نہیں۔

علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی کے کلام میں اسلامی قومیت کے تحفظ اور فرنگی تہذیب سے احتراز کا بے شمار مواد موجود ہے لیکن ہماری کتابیں اس سے خالی ہیں۔ کیا اس کا سبب یہ تو نہیں کہ ہم نے پاکستان بننے کے بعد فرنگی تہذیب سے سمجھوتا کر لیا ہے؟ کیا اکبر الہ آبادی نے صرف چند اخلاقی رباعیاں ہی لکھی ہیں؟ کیا ان کو لسان العصر بنانے والی نظمیں یہی ہیں، جو درسی کتابوں میں شامل ہیں؟ مثلاً "بیٹے کو لوگ کہتے ہیں آنکھوں کا نور ہے"۔ اکبر کی کلیات میں اور بھی بہت کچھ موجود ہے، جو سیرت سازی اور ملی اقتدار کے تحفظ کے لئے رہنمائی کا کام دے سکتا ہے۔

اقبالؒ نے مغربی تہذیب سے ملت کو محفوظ رکھنے کے لئے بہت کچھ کہا ہے۔ کیا آج ہمیں اس تہذیب سے کوئی خطرہ درپیش نہیں؟ یا اب ہم خدانخواستہ اقبال

کے اس کلام ہی کو فرسودہ سمجھنے لگے ہیں؟ ــــــ یہ درست ہے کہ ہر درجے کے طلبا اقبال کا کلام نہیں سمجھ سکتے لیکن اقبال کے پیغام کو بچوں کے لئے بچوں کی زبان میں پیش کرنا ناممکن نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہم اقبال، اکبر، ظفر علی خان، محمد علی جوہر اور حفیظ کو درسی کتابوں کے انتخابات میں اتنی جگہ نہیں دیتے جتنی دوسرے کلاسیکی شعرا کو مثلاً میر حسن اور نسیم لکھنوی کی مثنویوں کو۔ اس سے بھی افسوسناک بات یہ ہے کہ نظریۂ پاکستان میں ایمان رکھنے کے باوجود ہمارے اکثر ذرائع ابلاغ بالخصوص ٹیلی ویژن اور فلموں نے مغربی تہذیب کی ترویج میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ لارڈ میکالے مر گیا۔ لیکن اس کا فلسفہ ابھی زندہ ہے۔ اس نے اپنے نظامِ تعلیم سے INDIANS IN BLOOD AND COLOR BUT ENGLISH IN TASTES OPINIONS IN MORALS AND IN INTELLECT پیدا کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔ ہم نے بھی اپنے موجودہ نظامِ تعلیم میں اور بالخصوص ابلاغِ عامہ کے ذرائع سے اکثر پاکستانیوں کو ان کی رنگت کے سوا پورا انگریز بنا دیا ہے چنانچہ آج ہم مغرب ہی سے تخلیقی تحریک INSPIRATION حاصل کرتے ہیں۔ رسم و رواج، فیشن حتیٰ کہ نظریات تک مغرب سے ملتے ہیں۔ انگریزی درسی کتابوں میں علی، نسیمہ اور جمیل الفنسٹن سٹریٹ کی سیر کرتے ہیں، لندن کی سیاحت کرتے ہیں، سینما گھروں کا نظارہ کرتے ہیں، اگر نہیں جاتے تو مسجد میں۔ جمیل کا کعبۂ مقصود مکے کی بجائے لندن نظر آتا ہے۔ آخر ہم اپنی کتابوں میں اپنی ثقافت، اپنے دینی عقائد اور اپنے مقدس مقامات کا ذکر کرتے ہوئے شرماتے کیوں ہیں؟ انگریزی زبان سکھانے کے لئے کیا ضروری ہے کہ رہن سہن اور ماحول بھی عین مین لندن یا نیویارک کا ہو؟

دُوسری چیز جس کی کمی ہماری کتابوں میں کھٹکتی ہے، وُہ ہے تحریکِ پاکستان کے واقعات کا بیان ـــــ تحریکِ پاکستان کے اہم مراحل اور واقعات ہر درسی کتاب میں مناسب طریق سے بیان ہونے چاہئیں۔ علاوہ ازیں اضافی کتب کا ایک سلسلہ تحریکِ پاکستان ہی پر مشتمل ہونا چاہیئے جس میں پُوری تحریک وضاحت کے ساتھ سلیس اور مؤثر انداز میں پیش کی گئی ہو۔

تیسری چیز جس کی طرف میں اپنے معزز رفقا اور مصنفین کی توجّہ دلانا چاہتا ہوں، وُہ ہے اندازِ بیان ـــــ ہم اپنے قومی مشاہیر کے حالات اس طرح پیش کرتے ہیں، جیسے کسی تذکرے میں سوانحی خاکہ دیا ہو۔ بچّوں کے لئے یہ انداز قطعاً غیر دلچسپ اور سیرت سازی کے نقطۂ نظر سے غیر مؤثر ہے۔ تاریخی حقائق کو روکھے پھیکے انداز میں پیش کرنا امتحانی تیاری کے لیے مفید ہو تو ہو، اس سے کردار سازی کا کام نہیں لیا جا سکتا ـــــ ہمارے اکثر اسباق کے اندازِ پیشکش میں اس جذباتی کیفیت اور قلبی وابستگی کی کمی نظر آتی ہے جو تحریر میں تاثیر کا جادُو بھر دیتی ہے۔ نہ اخلاص کا جادُو نہ فن کا رکھ رکھاؤ۔ بس سپاٹ سا طرزِ بیان۔

اسی طرح کئی اصُولی باتیں منطقیانہ انداز سے بیان کر دی جاتی ہیں۔ لیکن ان اصُولوں کا بچّوں کی زندگی سے رابطہ و تعلق واضح نہیں ہوتا۔ اس کی مثال چھٹی جماعت کی اُردو کی کتاب میں ایک سبق "پرچم کی عزّت" ہے، جس میں اسلامی تاریخ کے تین واقعات الگ الگ بیان کر دیے گئے ہیں لیکن کسی جگہ بھی طلبا کو پاکستانی پرچم کی طرف متوجہ نہیں کیا گیا۔ حالانکہ یہ بات اتنی مشکل نہ تھی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ بعض دفعہ اصل متن میں ایسی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایسی صُورت میں سبق کے آخر دی ہُوئی مشقوں میں

طلبا کو اس طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس تو اس امر کا ہے کہ ہمارے مصنفین درسی کتابوں میں مشقوں اور جائزے کی اہمیت سے بہت کم واقف ہیں۔ عموماً ایسے سوالات کئے جاتے ہیں جن سے رٹائی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ مثلاً اسی سبق "پرچم کی عزّت" کے متعلق تمام سوالوں کے جوابات چند جملوں کو ہُو بہو دُہرا دینے سے پُورے ہو جاتے ہیں۔ مصنّف نے بچّوں کو یہاں بھی پاکستانی پرچم کی طرف توجّہ دلانا ضروری نہیں سمجھا ـــــ اگر طوالت اور موضوع سے دُور ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں چند مشقی سوالات تفننِ طبع اور عبرت آموزی کے لیے ضرور پیش کرتا۔

اس وقت سُوئے اتفاق سے ہمارا ملک ایک شدید بحران سے دوچار ہے۔ علاقائی اور لسانی تعصبات کو ہوا دی جا رہی ہے۔ بعض خود غرض عناصر ملک کی سالمیت پر ذاتی مفادات کو ترجیح دے رہے ہیں۔ ان حالات میں اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنی درسی کتابوں میں ایسی اقدار کا ذکر کریں جو محبّت و مؤدت اور اسلامی اخوت کی راہیں ہموار کریں۔ ان اقدار میں بُنیادی حیثیت تو بہر حال اسلام ہی کی ہے لیکن اس کے علاوہ دُوسری بُنیادیں بھی تلاش کی جائیں۔ مثلاً زبانوں کا احترام۔ ہمیں قومی اور علاقائی زبانوں کے صحیح مقام سے طلبا کو شناسا کرنا چاہیئے۔ انہیں ان زبانوں کے ان عناصر کی طرف بالخصوص زیادہ توجہ دلائیں جو زبانوں میں بھی اشتراک کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً ذخیرۂ الفاظ میں عربی فارسی الفاظ کا مشترک سرمایہ۔ علمی، ذہنی اور دینی پس منظر کی وحدت ـــــ اسلامی تہذیب کی آئینہ داری وغیرہ۔ بہتر یہی ہے کہ سارے ملک میں دونوں قومی زبانیں لازمی طور پر پڑھائی جائیں۔ لیکن جب تک ایسا ممکن نہ ہو، ان کی مشترک خصوصیات سے طلبا کو ضرور شناسا کرنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں مرکزی

اُردو بورڈ کی یہ کوشش قابلِ تحسین ہے کہ اُردو، بنگلہ، سندھی، پشتو، پنجابی، بلوچی اور کشمیری زبانوں کے مشترک متداول الفاظ پر مشتمل لغت تیار کی جائے۔

نظریۂ پاکستان کا تقاضا ہے کہ ہماری درسی کتب میں کوئی مواد ایسا نہ ہو جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ہمارے نظریات و عقائد سے متصادم ہو یا اس سے تضحیک کا پہلو نکلتا ہو، یا وطن کے کسی حصّے کے متعلق غلط فہمی کا سبب بن سکتا ہو، یا اس میں اسلام اور مسلمانوں کا تمسخر اڑایا گیا ہو۔ کتابوں سے ایسی کہانیاں یا افسانے بھی قلمزد ہو جانے چاہئیں جو جرائم اور بداعمالیوں کا جواز پیش کرتے ہوں، جن میں فرنگی تہذیب اور غیرملکی ثقافت کو پرکشش بنا کر پیش کیا گیا ہو جس سے ہمارے نوجوانوں کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو۔

درسی کتابوں میں جس معاشرت کے نمونے پیش کئے جائیں وُہ پاکستانی معاشرت ہونی چاہیئے۔ سبق کے کسی حِصّے سے ایسا مفہوم متبادر نہیں ہونا چاہیئے کہ طالبِ علم کسی اور معاشرت کو بہتر سمجھنے لگے ——— جہازوں اور کاروں پر سیر کرنے والوں کے واقعات بچّوں میں یا احساسِ کمتری پیدا کریں گے یا ناجائز ذرائع سے جلد از جلد دولت مند بننے کی خواہش کو جنم دیں گے۔

سامعینِ کرام!

مَیں اپنی گفتگو ختم کرنے سے پیشتر ایک دو ضروری باتوں کا اعادہ کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ پرسوں کے اجلاس میں جناب جسٹس ایس اے رحمان نے ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارا ایک نظریۂ پاکستان موجود ہے۔ لہٰذا اب کسی مفکّر یا مقرّر کا یہ کہنا کہ "آیا ہمارا کوئی نظریہ بھی ہے" درست نہیں۔ نظریۂ پاکستان کوئی متنازع مسئلہ نہیں ہے کہ اس

پر بحث کی گنجائش ہو۔ یہ اسی طرح برحق ہے جس طرح صداقت اور ایمان۔ لہٰذا نظریۂ پاکستان کے متعلق اس قسم کی بحث نہایت ناروا ہے کہ پاکستان کا محرک کوئی نظریہ تھا یا نہیں؟ یہ طے شدہ مسئلہ ہے۔ بالخصوص طلبا کے سامنے اس قسم کے مباحث یا موضوعات رکھنا ان کے حق میں سمِ قاتل سے کم نہیں۔

دوسری بات جو محترم جسٹس صاحب نے ارشاد فرمائی وُہ بھی نہایت بروقت اور اہم ہے کہ درسی کتابوں میں نظریۂ پاکستان کا بیان تو ضروری ہے ہی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھانے والا اُستاد اُن نظریات پر ایمان رکھتا ہو۔ کیونکہ استاد کا ذاتی نظریہ بہرطور طلبا پہ اثرانداز ہوگا۔ وُہ نظریۂ پاکستان پہ دیا ہوا سبق پڑھانے کے باوجود طلبا کو تشکیک کا مریض بنا سکتا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ خود اُستاد کو ایسی تربیت دی جائے کہ وُہ نظریۂ پاکستان کے مظاہر اور عناصرِ ترکیبی سے کما حقہٗ واقف بھی ہو اور ان پہ ایمان بھی رکھے۔

——— مَیں یہ بیان کرتے ہُوئے بے حد فخر محسوس کر رہا ہوں کہ اسی جذبے کے تحت مرکز توسیع تعلیم لاہور کے زیرِ اہتمام ۱۸ اکتوبر سے ایک ماہی کورس کا آغاز ہو رہا ہے، جس میں صُوبے کے چالیس اساتذہ شریک ہوں گے اور کورس کا موضوع "نظریۂ پاکستان" ہوگا۔ ——— خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ استاد کا اپنا طرزِ عمل اور طریقِ تدریس نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وُہ چاہے تو موجودہ درسی کتب ہی میں نظریۂ پاکستان کی وضاحت کے لئے مناسب مواقع نکال سکتا ہے۔ مثلاً ایسے اسباق میں جیسے حمد، دُعا، پرچم کی عزت، ہماری فضائیہ، میثاقِ استنبول، اسلام کی مجاہدات، مشرقی پاکستان کی سیر وغیرہ۔ یہ وُہ اسباق ہیں جن کی مشقوں میں بھی موجودہ

مصنفوں نے اس پہلو کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ البتہ استاد یہاں بات سے بات پیدا کر سکتا ہے ——— لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی کہ ہمارا اُستاد عام طور پر تخیل و تخلیق کی صلاحیتوں سے محروم ہے۔ وہ ایسی باتیں بہت کم سوچتا ہے اور یوں بھی وُہ اپنا بوجھ کم سے کم کرنا چاہتا ہے۔ جہاں مزید محنت کرنے کا سوال پیدا ہو وہاں سے بچ کر نکل جانے میں کمال رکھتا ہے۔ لہٰذا جہاں درسی کتابوں کے متن میں نظریۂ پاکستان سے متعلق مواد پیش کرنا ضروری ہے، وہاں اساتذہ کے لیے "رہنما کتابوں" کی بھی اشد ضرورت ہے۔ یہ خوشی کا مقام ہے کہ ٹیکسٹ بک بورڈ اس تجویز کو اصُولی طور پر قبول کر چکا ہے۔ توقع ہے کہ رہنما کتب یا معلّم ایڈیشن لکھنے والے مصنّف حضرات معلّموں کے لیے ہر سبق میں ایسے اشارات اور سرگرمیوں کی نشاندہی کر دیں گے، جن سے اُستاد کو نظریۂ پاکستان کے اجاگر کرنے میں مدد ملے۔

سامعینِ گرامی قدر!

اگرچہ ملکی فضا کے دُھندلکے کبھی کبھی مایوسی کا سبب بنتے ہیں لیکن انہیں میں سے امید و رجا کی حسین کرنیں چھن چھن کر دلوں کو منور کرتی رہتی ہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ کا یہ مذاکرہ انہی کرنوں میں سے ایک ہے۔ اس مذاکرے میں بلند پایہ مؤرخوں اور عالموں کی شمولیت بجائے خود اس کی وقعت کی زندہ شہادت ہے۔ اس موقع پر نظریۂ پاکستان کے متعلق جس ایمان و یقین کا اظہار کیا گیا ہے، وُہ یقیناً ایک نئے جذبۂ عمل کا محرک ثابت ہو گا اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اب یہ آواز بلند سے بلند تر ہوتی چلی جائے گی۔

مَیں صمیمِ قلب سے اس مذاکرے کے اربابِ انصرام کو ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ مفید اور قابلِ عمل اقدامات کے نفاذ میں یہ بورڈ حسبِ معمول

پیش قدمی کرے گا۔

ان الفاظ کے ساتھ، جناب صدر و سامعین کرام، مَیں آپ کی سمع خراشی کے لیے آپ سے معذرت چاہتا ہوں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے یہ طویل مختصر مقالہ صبر و سکون سے سماعت فرمایا۔ مَیں ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین جناب میر نسیم محمود اور ان کے رفقا کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھ ایسے کم علم انسان کو دانشوروں کے اس عظیم اجتماع میں اظہارِ خیال کی سعادت عطا فرمائی۔ شکریہ۔

سیمینار کے سامعین

نظریۂ پاکستان کی تعلیم کے چند نفسیاتی اصول

پروفیسر عبد الحیٔ علوی
شعبۂ اطلاقی نفسیات - یونیورسٹی آف دی پنجاب - لاہور

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے منتظمین مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نظریۂ پاکستان کے متعلق ایک سیمینار کے انعقاد سے ماہرین تعلیمات کے لیے سوچ بچار کی ایک نئی راہ کھول دی ہے۔ اس سے عوام کی بے چینی اور طلبہ کی اپنے تمدن سے بے خبری کے اسباب پر روشنی ڈالنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس سے نئی نسل کو ایسی راہ پر لگانے کا مؤثر علاج میسّر آجائے جس کی خواہش ہر درد مند پاکستانی کے دل میں موجود ہے۔

میرا خیال ہے کہ طلبا کو پاکستان کی تحریک اور نظریے سے روشناس کرانے میں نفسیات ایک اہم کردار سرانجام دے سکتی ہے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر میں چند نفسیاتی حقائق پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ نفسیات کا یہ پہلا اصول ہے کہ وہ کسی معاملے کا خصوصی حل پیش کرنے سے پہلے اس کا تجزیہ کرتی ہے تاکہ معاملے کی تہ تک پہنچے اور اصل اسباب کے سمجھنے میں مدد مل سکے۔ میرا مقصد یہاں صرف ان حالات پر روشنی ڈالنا ہے جن سے ایسا تجزیہ ممکن ہے۔

جب ہم نظریۂ پاکستان کا نام لیتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس سے ذہن میں ایک ایسا تصور آتا ہے جس کا مرکزی عنصر ہمارا وہ مخصوص کلچر ہے جس کی بنا پر مسلمان کو بحیثیت قوم ہر دوسری قوم پر فضیلت حاصل ہے۔ اس فضیلت کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ اس کے نزدیک

کلچر کا تصور دوسرے تمام کلچروں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں خدا اور اس کے رسولؐ کی ذات مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی کلچر خالص اسلامی کلچر کا دوسرا نام ہے، جس کا نصب العین اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ دُوسرے لفظوں میں اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے کلچر کو مذہب سے جُدا نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک پاکستان اپنی ابتدا سے حصُولِ مقصد تک دین اسلام پر مبنی رہی ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ نئی نسلوں کو نظریۂ پاکستان سے روشناس کرانے میں ایسے کلچر کی تعلیم دینی ہوگی جو اپنی قوت، نصب العین، عمل غرضیکہ ہر لحاظ سے اسلامی ہو۔

لیکن ہمیں اس حقیقت سے بھی مُنہ نہیں موڑنا چاہیے کہ ماحول کے بعض اثرات کی وجہ سے ہمارے کلچر کی مخصوص قدریں لاشعوری طور پر ختم ہوتی جا رہی ہیں اور بعض نئی قدریں ان کی جگہ لیتی جا رہی ہیں۔ ان دونوں کے تصادم کے نتیجے سے ذہنی اور عملی انتشار رونما ہو رہا ہے، جو ماہرین نفسیات کی فوری توجہ چاہتا ہے۔ کیونکہ اگر اس تصادم کا بروقت علاج نہ کیا گیا تو اس کا اجتماعی کردار پر بُرا اثر پڑے گا۔ بدلتی ہُوئی قدروں کا جائزہ لینے کے لیے دو آسان طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ایک میں طلبا کو چند نامکمل جملوں کے پُر کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ مثلاً

۱۔ لوگوں کو چاہیے کہ ....

۲۔ تمام انسان ....

۳۔ ہر پاکستانی کو ....

۴۔ ہمارے طالب علم .... وغیرہ وغیرہ۔

دُوسرے طریقے میں طالب علموں کو ایک مختصر سا پیراگراف لکھنے کی ہدایت کی جاتی

ہے، جس میں انہوں نے شمالی پاکستانی طالب علم کی صفات بیان کرنی ہوتی ہیں۔ اگر چند سالوں کے بعد اسی نوعیت کے طلبا پر اس تجربے کو دہرایا جائے تو قدروں کی تبدیلی کو آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً میرے ایک علاقے تک محدود مطالعہ کے نتائج کے مطابق پاکستان کے قیام کے کچھ ہی عرصہ بعد طلبا کے ایک گروہ کی قدریں اسلامی طرزِ زندگی، پابندیٔ فرائض، دیانتداری، حسنِ سلوک، اخوت وغیرہ تھیں لیکن انیس سال کے بعد قدریں بدل گئیں اور طلبہ ذاتی کارکردگی، حصول دولت، کامرانی وغیرہ کی صفات کے پیچھے لگ گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی قدروں کی بجائے انفرادی قدریں نمایاں ہو گئیں۔ اگر ایسے تجربوں کو وسعت دے کر ملک کے مختلف حصوں سے مناسب معلومات حاصل کی جائیں تو نتائج غالباً اس سے زیادہ مختلف نہ ہوں گے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ اگر ہمارا نظام تعلیم روایاتی قدروں پر مبنی ہونا چاہیے جو فی الحقیقت ہمارے کلچر اور نظریے کی نمائندگی کرتی ہیں تو اس مقصد کے لیے محض تلقین کافی نہیں بلکہ اور مؤثر ذرائع سے کام لینا ہوگا تاکہ طلبا کی جماعت ان قدروں کو اپنانے کے قابل ہو سکے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچے مخصُوص کلچر کو کس طرح اپناتے ہیں؟ اس سوال کا جواب اس لیے بھی اہم ہے کہ اگر ہم اپنے طلبا کو پاکستان کے تصور کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو ہمیں اس عمل کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، جس کے ذریعے سے مخصُوص کلچر زندگی کا لازمی جزو بنتا ہے اور جس سے مختلف شخصوں میں منفرد صفات پیدا ہوتی ہیں۔ بچوں کو معاشرت پسند بنانا ایک ایسا عمل ہے جس سے انہیں معاشرے کا مفید اور مؤثر رُکن بنانے میں مدد دی جاتی ہے۔ اس سے وہ اپنے معاشرے کی قدروں کو اپناتے

ہیں اور اس کی توقعات کی روشنی میں اپنی زندگی کو ڈھالتے ہیں۔ وُہ یہ سیکھ جاتے ہیں کہ معاشرے کا معیار کیا ہے۔ زندگی کو کسی خاص سانچے میں ڈھالنے کے لیے والدین کا کردار سب سے اہم ہے۔ کیونکہ بچّے نے اسی درس گاہ سے اپنے کلچر کی بنیادی باتوں کا سبق لینا ہے اور اسی سے اس نے پسندیدہ اور ناپسندیدہ اطوار میں فرق کرنا سیکھنا ہے۔ اگر اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھایا گیا تو وہ ایسے خیالات کو اپنانے پر مجبور ہو جائے گا جو اس پر اثرانداز ہوں۔ مختصراً کلچر کی تعلیم کی ابتدا گھر سے ہی ہوتی ہے۔ اس لیے گھر والوں پر چند فرائض عائد ہوتے ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے وُہ اپنے بچّوں کو پاکستانی بنانے کی طرف پہلا قدم بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔

ایک اور بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ کلچر کی تعلیم تعلّم کے عام قوانین سے مختلف نہیں۔ جس طرح بچّہ دوسری عادتیں سیکھتا ہے، اسی طرح وہ کلچر کی بنیادی باتیں اور مخصوص روایات سیکھتا ہے۔ تعلّم کی دو قسمیں ہیں، ایک شعوری اور دوسری غیر شعوری۔ پہلی قسم میں چند باتوں یا چند عادتوں کی خاص طور پر تعلیم دی جاتی ہے لیکن دوسری قسم میں عمداً ایسی کوئی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ بچّہ خود ہی اپنے ماحول سے مخصوص رویّوں کو حاصل کر لیتا ہے۔ کلچر کے تصادم کے باوجود ایک عام پاکستانی چونکہ دل سے پاکستانی ہے اس لئے بچّے کے لئے چند بنیادی اسلامی روایات کو بغیر کسی خاص کوشش کے حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ صرف ضرورت اس بات کی رہ جاتی ہے کہ ان تصورات کو مستحکم کرنے کے لئے ان کا وقتاً فوقتاً اعادہ ہوتا رہے تاکہ بچّہ بڑا ہونے پر انہی اصولوں کو اپنی زندگی کا رہبر بنا سکے۔

کلچر کے اکتساب کے قوانین بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان عوامل

کا سرسری ذکر کر دیا جائے جو معاشرت پسندی کی تعلیم دینے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ بچّوں کے متعلق چند باتیں ایسی ہیں جو تمام کلچروں میں مشترک ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہر بچّہ پیدائش کے وقت مجبور اور زندہ رہنے کے لئے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ کلچر کے اکتساب کی ابتدا بھی ان لوگوں کے ذریعے سے ہوتی ہے جن کا سہارا لینے پر وُہ مجبور ہوتا ہے۔ اس میں ماں کا کردار سب سے نمایاں ہوتا ہے۔ بچّہ وہی کچھ سیکھتا ہے جو اس کی ماں چاہتی ہے۔ اس لئے اس اصول سے روگردانی نہیں کی جا سکتی کہ اگر ہم نے بچّوں کی زندگی کو پاکستانی تہذیب میں ڈھالنا ہے تو اس کی ابتدا گھر سے ہی ہوگی۔ ہر بچّہ اپنے والدین کی لاشعوری طور پر تقلید کرتا ہے، جسے نفسیاتی اصطلاح میں مماثلت کہتے ہیں۔ مناسب رویّوں اور موزوں تصوّروں کی تحصیل میں یہ میکانیت خاص اہمیت رکھتی ہے۔

بچّے کو تہذیب سکھلانے میں والدین کے بعد معلّمین کا درجہ ہے۔ معلّمین اپنے فرائض اسی صورت میں سرانجام دے سکتے ہیں جب وُہ اپنے کلچر، اس کی بنیادوں اور اس کے اصولوں کے صرف زبانی قائل ہی نہ ہوں بلکہ ان پر سختی سے عمل پیرا بھی ہوں۔ تہذیبی ورثے کو جو ہمارا نہایت ہی قیمتی ورثہ ہے، آیندہ نسلوں میں منتقل کرنے کے صحیح اہل صرف معلّمین ہی ہو سکتے ہیں بشرطیکہ خود معلّمین کا ان پر ایمان ہو۔ اس لیے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کلچر کے منتقل ہونے کا عمل مؤثر طور پر جاری ہے یا نہیں، ہمیں معلّمین کے اپنے اعتقادات اور افکار و اعمال کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ پاکستان کے نظریے کی تعلیم اس وقت تک مؤثر ثابت نہیں ہو سکتی جب تک معلّمین کا اس پر پختہ ایمان نہ ہو اور وہ اس کی تاریخ اور اس کے نشیب و فراز سے پُورے طور پر آگاہ نہ ہوں۔ یہیں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ پاکستانی کلچر اور اس کی تاریخ تمام تربیتی اداروں کے نصاب کا لازمی

جزو ہو، تاکہ متعلمین ان ضروری باتوں کا علم حاصل کر سکیں۔ اس طرح سے کلچر کو بچوں کی زندگی کا اہم جزو بنانے میں بڑی مدد ملے گی اور وہ اپنی شخصیت میں اپنے کلچر سے متعلقہ جذبات اور عواطف کو شامل کرنے پر قادر ہو سکیں گے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ کوئی شخص بھی کلچر کے تمام پہلوؤں کو نہیں اپنا سکتا۔ وہ صرف چند ایسے پہلوؤں کو اپنا سکتا ہے، جو اس کی منفرد شخصیت میں شامل ہونے کے اہل ہوں۔ ایسے امتیاز اور انتخاب کا انحصار اس کے ذاتی تجربوں اور دُوسرے شخصی حالات پر ہے۔ بچے کی شخصیت کلچری اثرات سے صرف متاثر ہی نہیں ہوتی بلکہ ان پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ یعنی یہ دو طرفہ عمل ہے۔ ایک طرف شخصیت تبدیل ہوتی ہے اور دُوسری طرف وہ ماحول کے اثرات کو اپنی مرضی کے مطابق بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

جن اعمال کے ذریعے شخصیت متاثر ہوتی ہے انہیں "کرداری رجحانات" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس سے مراد وہ تمام صفات، عادات، جبلّات، احتیاجات، محرکات، دلچسپیاں، رویّے اور دوسرے نفسیاتی مظاہر ہیں، جو کسی نہ کسی شکل میں کلچر کو جذب کرانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کرداری رجحانات داخلی مہیجات کا نتیجہ بھی ہو سکتے ہیں اور خارجی مہیجات STIMULI کا بھی۔ ہمارے لیے یہ دوسرے قسم کے رجحانات خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ کیونکہ خارجی ہونے کے باعث انہیں کنٹرول میں لانا اور ان سے حسبِ منشا کام لینا آسان ہے۔ ایسے رجحانات میں تعجب کا اظہار، تجسّس، دست درازی، اشیاء کی نوعیت معلوم کرنے، تناؤ کم کرنے، اپنی ذات کو تسکین پہنچانے، دوسروں کی توجہ اپنی طرف جلب کرنے، شفقت اور جبّت کی طلب وغیرہ کے میلانات شامل ہیں۔ ان کے متعلق قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ کبھی بھی مکمل طور پر تسکین حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کی فعالیت ہمیشہ

باقی رہتی ہے۔ کلچر کی تعلیم دینے کے لئے اس فعالیت سے حسبِ منشا کام لیا جا سکتا ہے۔

میں یہ پہلے بیان کر چکا ہوں کہ کلچر اور کلچر سے متعلقہ تمام قدریں اور رویّے اکتساب کا نتیجہ ہیں۔ معلّمین کے لئے جن کے ذمے کلچر کے منتقل کرنے کا کام ہے، تعلم کے عمل اور اس کی اصلیت سے آگاہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ تعلم کا تجزیہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تعلم کی ایک اہم شرط کی طرف معلّمین کی توجہ مبذول کرائی جائے۔ یہ ضروری شرط "آمادگی" ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بغیر کسی قسم کا تعلم ممکن نہیں۔ اگر طلبا کسی چیز کے سیکھنے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوئے تو کوئی بھی طریقۂ تعلیم خواہ وہ کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، موثر ثابت نہیں ہو سکتا۔ آمادگی کا دارومدار ذہنی پختگی اور گزشتہ تجربوں پر ہے۔ بچوں کی نفسیات کے ماہرین بخوبی جانتے ہیں کہ ہر شے کے سیکھنے کے لئے ذہنی پختگی بڑی ضروری شرط ہے۔ انہوں نے بڑی محنت سے بچوں کی نشوونما کے مختلف مدارج معلوم کئے ہیں۔ ان مدارج کو تعلیم و تدریس میں مدِّنظر رکھنے سے معلم کا بہت سا کام آسان ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک عالم نے ایک تین سالہ بچے کو ایک لفظ کے معنی سکھانے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اسی لفظ کی تشریح جب اس نے ایک ساڑھے چار سالہ بچے کے سامنے کی تو اس نے کچھ عرصے کی مسلسل محنت کے بعد اس لفظ کے معنے سیکھ لئے۔ لیکن اس ماہر نے جب اس لفظ کے معنے ایک چھ سالہ بچے کے سامنے بیان کئے تو اسے اس کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ یہ سادہ لیکن دلچسپ مشاہدہ تعلم کے دوران میں بچوں کی نشوونما کی رفتار اور ان کے نشوونمائی مدارج کو ملحوظ رکھنے کی اہمیت بتاتا ہے۔ جب تک کوئی بچہ کسی تصور کے سیکھنے کی خاص عمر تک نہ پہنچ جائے اُسے اس تصور سے آشنا کرنا اور خیال کرنا کہ وہ اس سے مستفید ہوگا فضول ہے۔ قدروں اور رویّوں کی تعلیم بھی اس اصول سے مبرّا نہیں۔ اگر بچوں کے ذہن بعض

تصوروں کے سمجھنے کے قابل نہیں ہوئے تو ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ انہیں سمجھ جائیں گے اور ان کے مطابق عمل کریں گے عبث ہے۔ بچوں کی اکثر درسی کتابوں میں اس اصول کو مدِ نظر نہیں رکھا جاتا مثلاً پہلی جماعت کے طلبا کو پاکستانی جھنڈے کے احترام کی توجیہ کرنا یا گناہ اور ثواب میں تفریق کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ بچوں کے ذہن ابھی پختگی کی اس حد تک نہیں پہنچے، جہاں بچے ان تصورات کو اپنی شخصیت میں جذب کر سکیں۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ بچوں میں نظریۂ پاکستان سمجھنے کا ذوق پیدا ہو تو سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ان کے ذہن اس کے کون سے پہلو کو سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں۔ اگر اس نظریے کو بتدریج روشناس کرایا جائے تو نتائج یقیناً حوصلہ افزا برآمد ہوں گے۔

اب میں تعلم کے عمل کے تجزیے کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اس سرسری واقفیت کے بعد معلّم اپنے طریق کار میں مناسب تبدیلی پیدا کرنے کے قابل ہو سکے گا۔

تعلم کی ایک مشہور و معروف توضیح میں چار اعمال ضروری قرار دیے گئے ہیں یعنی تقاضا (محرک)، جوابات (کوئی فعل یا خیال)، علت (ریج) اور کمک دہی (انعام) یہ چاروں اعمال ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ لیکن ان میں کمک دہی RE-INFORCEMENT کو اہم مقام حاصل ہے کیونکہ اس سے سیکھے ہوئے جواب کے مستحکم ہونے کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں۔ ان کی مختصر سی تشریح مناسب معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ تقاضے۔ ایک طرح کا طاقتور ریج ہیں، جو کسی فعل کی تحریک پیدا کرتے ہیں یہ درست ہے کہ بعض تقاضے تعلم کے محتاج نہیں بلکہ بھوک، پیاس کی طرح فطری ہوتے ہیں۔ لیکن متعلمین کی دلچسپی کا باعث ایسے تقاضے ہیں جو اکتساب کے زیرِ اثر ہوتے ہیں غیر اکتسابی یعنی فطری تقاضوں کو کمک دہی کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن اکتسابی

تقاضے مثلاً توجہ طلبی، حبِ جاہ، اہمیتِ ذات وغیرہ کے استحکام کے لیے کمک دہی کی ضرورت پڑتی ہے۔

۲۔ علت:۔ فطری تقاضا پیدا ہونے کے بعد کسی خاص جوابی حرکت کی شکل میں نمودار ہوگا۔ لیکن جواب پیدا کرنے کے لیے جس خاص حرکت کا سہارا لیا جائے گا اس کا دار و مدار اس مخصوص ریج پر ہے جو اس وقت عضویے پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ ریج انفرادی جواب کے لیے رہنمائی کا کام دیتا ہے۔ جواب کا دار و مدار ریج کی نوعیت اور قوت پر ہے۔ اسی لیے اسے تعلم کی رُوح خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے بغیر نہ مناسب جواب پیدا ہوتا ہے اور نہ شخصیت میں حسبِ خواہش تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔

۳۔ جواب:۔ کسی جواب کو اس کے ریج سے پیوستہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے جواب پیدا ہو۔ قبل اس کے کہ کسی جواب کو کمک دہی کے ذریعے مستحکم کیا جائے جواب کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے معلّمین کے لئے لازمی ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کریں جن سے پہلے درست جواب پیدا ہو سکے۔ کوئی شخص بھی کسی عادت، یا اندازِ فکر کو اس وقت تک نہیں سیکھ سکتا جب تک کہ اوّلین مرتبہ اس کا اظہار نہ ہو۔ معلّم کے لئے ایسے مواقع کی فراہمی حقیقت میں بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن اس کے بغیر اور کوئی چارہ کار بھی نہیں۔ جواب کے پیدا ہونے کے بعد یہ معلوم کرکے کہ وہ کون سے خاص ریج کا نتیجہ تھا، اسے تقویت پہنچائی جا سکتی ہے۔ تاکہ یہ دونوں پیوستہ ہو جائیں اور اس ریج کی موجودگی میں وہ خاص جواب ہمیشہ رونما ہوتا ہے۔ ریج اور جواب کو پیوستہ کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ کبھی سعی و خطا

کا طریقہ مفید ثابت ہوگا، کبھی تشریط CONDITIONING کا، کبھی تقلید کا اور کبھی بصیرت کا۔ معلم خود معلوم کر سکتا ہے کہ کون سے خاص مقصد کے لیے کونسا طریقہ مناسب رہے گا۔

۴۔ **کمک دہی**۔ کسی جواب کے پہلی مرتبہ کے پیدا ہونے کے بعد اس کے اعادے کے امکانات کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس جواب کو کمک دہی کے ذریعے سے تقویت پہنچائی گئی ہے یا نہیں۔ یہ یاد رہے کہ محض تکرار اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ جواب کے پیدا ہونے کا رجحان مستحکم ہو گیا ہے۔ اس کے لئے کسی تقاضے کی تسکین یا کسی انعام کی موجودگی ضروری ہے۔ کمک دہی کے لئے یہ شرط ہے۔ کہ جواب کے پیدا ہونے کے فوراً بعد مہیا کی جائے۔ ورنہ جواب کے مستحکم ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہر جواب کی کمک دہی ہو۔ اس کے متعلق علما نے مختلف شیڈول بنائے ہیں جو مختلف فعالیتوں کی تقویت کے لئے رہنمائی کا کام دیتے ہیں۔

اس حقیقت پر پھر زور دینے کی ضرورت ہے کہ تعلم بغیر کمک دہی کے ممکن نہیں۔ اس لئے اگر طلبار کو نظریۂ پاکستان سے روشناس کرانا مقصود ہو تو ہر طرح کی کمک دہی کا انتظام کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اسے صرف جماعت کے کمرے تک ہی محدود نہیں رکھنا پڑے گا۔ بلکہ ہر مقام اور ہر جگہ پر کمک دہی کرنی ضروری ہوگی۔ الغرض ایسے تمام مواقع کی موجودگی لازمی ہے جہاں تصورات اور مناسب رویوں کی کمک دہی ہوتی رہے۔

تدریس کے موجودہ طریقے کمک دہی کے اصول پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ایک مؤثر ذریعہ ٹیلیویژن کے پروگرام ہیں۔ اگر یہ پروگرام مرتب کرنے والے تعاون کریں تو تصور پاکستان کے متعلق بڑی خوش اسلوبی سے سبق دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم موجودہ پروگراموں

کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ وہ پاکستانی کلچر کی اساس کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ اکثر اوقات ایسے خیالات کو تقویت پہنچاتے ہیں، جو ہمارے کلچر کا لازمی جزو نہیں بلکہ ایک طرح سے اس تصور سے متصادم ہو رہے ہیں۔

دوسرا نہایت ہی مفید طریقہ ایسی درسی کتابوں کی تیاری ہے جنہیں پروگرامی تدریس PROGRAMMED INSTRUCTIONS کے اصولوں پر لکھا جائے۔ اس طریقے میں طالب علم اپنی مرضی اور اپنی قابلیت کی بنا پر خود اپنے آپ کو تعلیم دیتا ہے۔ کتاب کے جملے اس طرح کے ہوتے ہیں کہ پہلا جملہ بعد میں آنے والے جملے کے لئے کمک دہی کا کام دیتا ہے۔ اس طرح کی تعلیم صرف آسان اور دلچسپ ہی نہیں بلکہ مؤثر بھی ہے۔ میرے خیال میں ٹیکسٹ بک بورڈ آسانی سے نظریۂ پاکستان پر ایسی کتابیں تیار کروا سکتا ہے۔

تعلّم کے متعلق ایک آخری بات یہ ہے کہ جس تعلّم کا زندگی کے دوسرے شعبوں پر اثر نہ ہو اسے صحیح معنوں میں تعلّم نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے نظریۂ پاکستان کی تعلیم میں اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اس کا اثر صرف ایک ساعت تک محدود نہیں بلکہ طلبا کی زندگی کے ہر پہلو اس کے زیر اثر ہے۔ اس اثر کے مطالعہ کے لیے طلبا کے کردار کا مشاہدہ کرنا ہوگا۔ اگر ان کے کردار میں ایسی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے جو نظریۂ پاکستان کا مقصود ہے تو تعلیم خاطر خواہ ہے ورنہ کسی مقام پر کوئی نقص رہ گیا ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔

نصابات میں نظریۂ پاکستان کس طرح سمویا جائے

ڈاکٹر سید عبداللہ

پاکستان چونکہ نظریاتی مملکت ہے اس لئے قدرتی طور پر اس کے نظامِ تعلیم کی بنیاد نظریۂ پاکستان پر ہونی چاہیئے۔ اور نصابات میں بھی اسی نظریے کا پورا انعکاس ہونا چاہیئے۔ اس وقت دُنیا میں تین اہم نظریاتی مملکتیں اور بھی ہیں یعنی روس، چین اور اسرائیل۔۔۔۔؛ ان تینوں میں تعلیم نظریے میں گہرا اعتقاد پیدا کرنے کا پورا اہتمام کرتی ہے اور اس نظریے سے متصادم کسی خیال یا عقیدے کو نصابوں میں بلکہ پورے تعلیمی ماحول میں کہیں بھی داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔

نظریاتی مملکت کے معنی یہ ہیں کہ اس کی مملکداری، تمدن اور معاشرت کا سارا نظام کسی ایسے معیّن فلسفے یا نظامِ عقائد پر مبنی ہے، جس کے بنیادی اور مستقل اصُول میں تبدیلی ممکن نہیں۔ اس کے عقیدے باہر سے آئے ہُوتے ہیں جو سب کے لئے واجب الاتباع ہوتے ہیں۔ حکومتوں کا کام ان کی پیروی اور نفاذ ہوتا ہے۔ قانون موجُود ہوتا ہے حکومت کا فریضہ ان پر عمل کرانا ہوتا ہے۔ اس ملک کے جملہ قوانین ان نظریات کے تابع ہوتے ہیں۔ غیر نظریاتی مملکت کا مطلب اس کے برعکس یہ ہے کہ اس کا قانون اور اصُول مملکت داری، تجربۂ انسانی کے مطابق تبدیل ہو سکتا ہے جیسا کہ انگلستان، امریکہ اور دُوسری جمہُوریتوں میں ہے جہاں اکثریت کی رائے سے قوانین میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی۔ یہ اکثریت خود ہی

قانون بناتی ہے اور خود ہی اس کا نفاذ کرتی ہے۔۔۔۔۔، بعض اخلاقی و عقلی اصُول اس کی تہ میں بھی ہوتے ہیں، مگر ان کی حیثیت رُوح کی ہوتی ہے، قانون کے خارجی سلسلے اکثریت کی رائے سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ فاشی ملکوں میں، قانون آمر کی رائے سے برآمد ہوتا ہے۔ بہرحال نظریاتی مملکتوں میں، معاشرت کے ہر شعبے میں نظریے کی کارفرمائی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اور تعلیم اس کے استحکام و تربیت کا مؤثر ترین ذریعہ ہوتی ہے۔

نظریاتی مملکت کی تعریف کے بعد نظریۂ پاکستان کی تشریح بھی بیحد ضروری ہے میری رائے میں یہ نظریہ عبارت ہے اوّل اس عقیدے سے کہ پاکستان دو قومی تصوّر کا نتیجہ ہے یعنی یہ کہ ہندو الگ قوم ہیں اور مسلمان الگ قوم۔ دوم یہ کہ مسلمانوں کی قومیت فقط اسلام ہے، یعنی نسل، رنگ اور زبان نہیں عقیدۂ اسلام ہے لہٰذا پاکستان کی قومیت اسلام ہے۔ سوم۔ مسلمان چونکہ ایک منفرد قوم ہیں اس لئے ان کی معاشرت، تہذیب، اور علم الاخلاق بھی منفرد ہے اور اُردو پاکستان میں اس کی ترجمان زبان ہے۔ چہارم۔ اس قوم کو ہندوستان کی ہزار سالہ تاریخ نے ایک تاریخی شعُور دیا ہے۔ چنانچہ اس کے جملہ احوال کی تعبیر اس تاریخی شعُور کے حوالے سے ہونی چاہیئے اور اس کی ایک تاریخی تعبیر واقعۂ ظہُور پاکستان ہے۔

پاکستان چونکہ نظریاتی مملکت سمجھی جاتی ہے اس لئے اس کی تعلیم کو بھی نظریے کے استحکام کا وسیلہ بننا چاہیئے۔ اگرچہ یہ افسوس ہے کہ گزشتہ بائیس برسوں میں تعلیم سے نظریے کے استحکام کے بجائے اس کی نفی کا کام لیا گیا ہے جس کا الم انگیز نتیجہ اب سب کے سامنے ہے۔۔۔ مشرقی پاکستان کے حوادث کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہ میں بھی ہماری غفلت کارفرما نظر آئے گی کہ ہم جس نظریے کی مخلوق ہیں، ہماری تعلیم اس کا احترام

نہیں کر سکی، اس لئے اب کرنا چاہیئے اور سب سے زیادہ اس کے نصابوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

نصابوں کو نظریۂ پاکستان سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں سب سے مشکل معاملہ ان افکار کا ہے جو سائنسی تجربات کی بنا پر مرتب ہوئے ہیں۔ یہ مشکل اس لئے ہے کہ ان کی سند تجربے پر ہے اور تجربہ ہر حال میں برحق اور ہر وقت مصدقہ حیثیت رکھتا ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

بعض اوقات ایسی صورت پیش آسکتی ہے کہ سائنسی تجربے کے نتائج معروف دینی عقیدوں سے متصادم نظر آتے ہوں اور یہ آج کل کے زمانۂ ضعفِ اعتقاد میں اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

اس سلسلے میں نصاب ساز، کتاب ساز اور اُستاد پر بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے، پاکستانی نصاب سازوں کو چند رویّے محکم انداز میں اپنانے ہوں گے۔

ایک تو یہ کہ سائنسی تجربے کی طرح دین کی حقیقت کو بھی اٹل، قطعی اور یقینی خیال کر کے آگے چلیں۔

دوسرا یہ کہ سائنسی تجربے اور سائنسی فلسفے میں امتیاز کریں۔ جہاں سائنسی تجربہ ہر حال میں برحق ہوتا ہے، سائنس سے پیدا شدہ فلسفہ اور اس کے نتائج ضروری نہیں کہ ہر حال میں درست ہوں۔ نتیجے بہرحال عقلی تفکر سے پیدا ہوتے ہیں اور عقلی تفکر ہمیشہ حق کا ترجمان نہیں ہوتا۔ لہٰذا سائنسی تجربے کو برحق مانتے ہوئے سائنسی فلسفے کو ثانوی حیثیت دی جائے اور اسے قابلِ تبدیل خیال کر کے بحث اُٹھائی جائے۔

اس کے علاوہ، نیچر کے حقائق کو تسلیم کرنے کے باوجود انسانی زندگی کو نیچر سے برتر اور کامل تر حقیقت کی ترجمانی مذہب اور اخلاقیات کے سپرد کی جائے۔۔۔۔ یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیئے کہ سائنس کی جستجو جس نتیجے پر پہنچ چکی ہے وہ حرفِ آخر ہے بلکہ اس میں نئے اور مزید انکشاف کی پوری توقع ہے، نیوٹن کی طبیعیات کو آئن سٹائن نے اور اس سے بھی زیادہ، میکس پلانک نے (اپنے کوانٹم نظریے کے تحت) باطل کر دیا ہے۔ اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ ؎

مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

پس ان نادیدہ حقیقتوں کا انکار (سوچے سمجھے بغیر) کر دینا درست رویہ نہیں۔ ان صورتوں میں کتاب ساز، نصاب ساز اور اُستاد خدا کی نادیدہ حکمتوں کا تصور دلائے، وحی کی سجھائی ہوئی باتوں کا انکار نہ کرے۔ سائنس اور حکمت نے ابھی بہت کچھ دریافت کرنا ہے اس کی آج کی منزل آخری منزل نہیں۔

بہر حال نصابوں میں وحی و الہام کے اُٹھائے ہوئے عقیدوں اور رویوں کا پورا احترام ملحوظ رہنا چاہیئے۔۔۔۔۔ اور یہ بات جملہ معاشرتی علوم مثلاً سیاسیات، معاشیات، عمرانیات، اور سائیکالوجی (نفسیات) اور فلسفہ و تاریخ میں مدِنظر رہنی چاہیئے بلکہ خود ریاضیات، طبیعیات و حیاتیات میں بھی لازمی ہے۔

نصابوں میں مطلوبہ تبدیلی کے لئے لازمی ہے کہ اس ملک کا ہر آدمی (پورا مخلص) مسلمان ہونے پر فخر کرتا ہو اور اسے اپنی ہستی کے لئے ضروری سمجھتا ہو۔ وہ دُنیا بھر کے علوم سے استفادہ کرنے کے بعد بھی مرعوب نہ ہو اور اسلام کی حقانیت اور اس کی ابدی، آفاقی صداقت میں گہرا اعتقاد رکھتا ہو اور یہ بھی یقین رکھتا ہو کہ آخری اور قطعی

حقیقت وہی ہے جو اسلام بتاتا ہے.... اور یہی وہ حقیقت ہے جو انسانیت کے لئے بالآخر کیمیائے سعادت ثابت ہوگی۔

اسلام میں گہرا یقین، اور مسلمان ہونے پر فخر...... یہ دو باتیں پاکستان کی نظریاتی اساس کے لئے آہنی بنیاد کا حکم رکھتی ہیں۔

نصابات کا تعلق مضامین سے ہے، مضامین کی عمومی تقسیم یہ ہے۔

(الف) **انسانیاتی علوم** :- جن میں معاشرتی علوم، ادبیات اور فنونِ لطیفہ شامل ہیں۔ معاشرتی علوم کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ عقائداتی، فکریاتی علوم۔ مثلاً علوم دین اور فلسفہ۔

۲۔ تمدنی علوم... ، علم سیاست، علم معاشیات اور علم شہریت، شماریات، عمرانیات اور علم تاریخ مع جغرافیہ۔

(ب) **سائنسی علوم** :- سائنس کی سب شاخیں مثلاً کیمیا، طبیعیات، حیاتیات اور ان کے نظری اصول۔ مع ریاضیات۔

(ج) **سائنس کے عملی مضامین** :- طب، انجینئرنگ، ٹکنالوجی، ادویہ سازی اور دیگر صنعتی علوم مذکورہ بالا سب مضامین میں نظریۂ پاکستان کو چند صورتوں میں منعکس کیا جا سکتا ہے :-

۱۔ اسلام کی تعلیم اور اس کے بنیادی اصولوں اور عقیدوں کو اُجاگر کر کے۔

۲۔ اسلامی تاریخ کے واقعات خصوصاً (قیام پاکستان تک) ہندو پاکستان کے اہم واقعات کو واضح صورت میں پیش کر کے۔

۳۔ علوم کو اسلامی عقیدوں کے حوالے سے روشناس کر کے، اور ان کی تعبیر اسلامی

عقیدوں کی روشنی میں تنقید کے ذریعے سے۔

۴۔ دُنیا کے اہم فکری مباحث کے ایسے تجزیے کے ذریعے سے جس سے اس نقطۂ نظر کا ازالہ و اصلاح ممکن ہو جائے جو مغرب کے بے جہت بے اخلاق افکار نے پھیلا دیا ہے۔

اب ہم مذکورہ علوم میں سے سائنس کا ذکر سب سے آخر میں کریں گے سب سے پہلے ان علوم کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے جن میں نظریہ سب سے زیادہ مستحکم یا سب سے زیادہ مجروح ہو سکتا ہے، یہ انسانیاتی علوم (HUMANITIES) ہیں۔ ان سب میں فلسفیانہ یا تمدنی افکار ملتے ہیں۔ فلسفیانہ افکار وہ ہیں جو تعقل و تفکر سے نمودار ہوتے ہیں اور منطق کے ذریعے تنظیم پاتے ہیں۔ تمدنی افکار وہ ہیں جو تمدن و معاشرت کے متعلق انسانی تجربوں کی تدوین و تنظیم سے مرتب ہوتے ہیں۔

فلسفیانہ تجزیہ عقل و منطق کے سہارے چلتا ہے اور آزاد ہوتا ہے۔ تمدنی تجزیہ امرِ واقعہ سے وابستہ ہوتا ہے اور مختلف واقعات سے نتائج کا استنباط کیا جاتا ہے۔ تجزیے کی یہ دونوں قسمیں یوں تو کارآمد ہیں مگر ان میں قباحت یہ ہے کہ ان کی بنیاد پائیدار نہیں ہے، ان کے نتیجے ہر روز بدل سکتے ہیں اس لئے جو نظام ان پر قائم ہوگا، بیحد غیر یقینی ہوگا...... اور جو نظام اتنا غیر یقینی ہو کہ اس کو قبول کرتے وقت ہی اُسے ناپائیدار سمجھا جاتا ہو اس کا تجربہ کس طرح ہوگا کیونکہ تجربہ بہرحال کچھ وقت چاہتا ہے۔ معاشرتی علوم میں تاریخ ایک سبق آموز مضمون ہے لیکن اگر اس میں مختلف ادوار میں انسانوں کے عمل اور عقائد کو نمونہ سمجھ لیا جائے تو یہ بھی غلط ہوگا کیونکہ انسانوں کا ہر عمل ضروری نہیں کہ دُرست ہو۔ اس کے اچھا بُرا ہونے کے لئے کسی معیار

کی ضرورت ہوگی۔ یہی حال علم الاجتماع کا ہے کہ اس سے متعلق واقعات وحالات کا ہر تجزیہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ ہی انسانوں کے لئے مفید ہو۔ یہی صورت علم سیاست و علم شہریت کی ہے۔

معاشیات کا علم بھی ذرائع پیداوار اور طریق تقسیم سے متعلق ہے..... اس کا ایک پہلو مادی اور عملی ہے مگر دوسرا پہلو عقائدی، فکری اور اخلاقی بھی ہے۔ اس فکری حصے کے لئے بھی کسی معیار کی ضرورت ہوگی۔

پس میرا موقف یہ ہے کہ علم تاریخ، علم اجتماعیات، علم سیاسیات، علم شہریت علم معاشیات، سب کے لئے ایک ایسے معیار کی ضرورت ہے جو ان علوم کی تعلیم کو انسانی فوز و فلاح، اور اصولِ عدل و احسان سے دُور نہ ہونے دے۔

تاریخ انسانی ارتقا کے واقعات سے بحث کرے، مگر اس کے نتیجوں کی گفتگو قانونِ مکافات عمل اور اصول عدل و احسان کے نقطہ نظر سے کرے۔ قرآن مجید میں بھی تاریخ موجود ہے مگر اس میں واقعات کے نتیجوں کو قانون مکافات عمل کے معیار سے ناپا گیا ہے اور یہ وہ قانون ہے جس کی بنیاد عدل و احسان پر قائم ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب کوئی معاشرہ خدا کے دیے ہوئے اصول عدل سے منحرف ہو جاتا ہے تو پھر اس کی تباہی مسلّم ہے اور جب تک کوئی معاشرہ عدل و احسان پر قائم رہتا ہے، وہ ہمیشہ فوز و فلاح اور سعادت سے بہرہ یاب ہوتا رہتا ہے.....، اور عدل کی یہ صلاحیت تعقل سے بھی وابستہ ہے مگر قانون اعلیٰ یعنی خدا تعالیٰ کی برتر ذات سے وابستہ ہونے سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس چیز کا دوسرا نام تقویٰ اور عبادت ہے۔

"تاریخ اور اجتماعیات کے نصابوں کو اگر ان عقیدوں اور ان اصطلاحوں کی مدد سے پڑھایا جائے تو متعلم کا نقطہ نظر یکسر بدل سکتا ہے۔ ان مضامین میں عام تاریخ بھی آئے گی اور مسلمانوں کی اپنی تاریخ بھی،... اس میں بھی اسلام کے قانونِ عدل کے مطابق نتیجے نکالے جا سکتے ہیں اور اچھے بُرے کا فرق بھی اسی اصول پر قائم ہوگا۔ اسلام نے انسان کے اجتماعی ارتقا میں جو حصہ لیا ہے، اس کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ مگر یہ روداد غیروں کی مرتب کردہ نہیں بلکہ ان لوگوں کی جو غیروں سے بُری طرح متاثر ہیں۔ اگر اسلامی تاریخ کے افسوسناک واقعات کا تجزیہ کرنے والے نیک خیال لوگ ہوں۔ تو ان سے بڑے بڑے سبق مل سکتے ہیں۔ غیروں کی نظر منصفانہ نہ ہوگی بہرحال متعصبانہ ہوگی کیونکہ صلیبی نفسیات نے مغرب کے خون تک میں زہر بھر دیا ہے۔

ہمارے علوم میں تاریخ و اجتماعیات اور جغرافیہ اسلامی احساسات کو سمونے کا بہت بڑا میدان ہے۔ بقول بعض تاریخ ایک سائنس ہے۔ ممکن ہے درست ہو اور ایک حد تک ہے بھی۔ تاریخ سچائی کو پھیلانے کا ذریعہ ضرور بن سکتی ہے۔ بشرطیکہ اسے عبرت آموزی اور درس کا ذریعہ بنا دیا جائے اور اس کی تعبیر اخلاقی ہو۔ اور اخلاق بھی قانونِ خیر والا..... ورنہ تاریخ سے بڑھ کر کوئی مضمون گمراہ کن نہیں ہو سکتا۔

تاریخ کے مضمون میں وہ تاریخی شعور سمویا جا سکتا ہے جو نظریۂ پاکستان کا ایک لازمی حصہ ہے۔ ہندوستان میں اسلامی فتوحات کے اسباب اور تہذیبی ترسیات کا جامع تذکرہ ضروری ہے اور تقابل کے طور پر ہندوستان کی حالت قبل از اسلام بھی زیر بحث آنی چاہیئے۔ زوال کے اسباب کا تجزیہ بھی اخلاقی قانونِ عدل و تقویٰ کے

مطابق ہونا چاہیئے۔۔۔۔ اور آخر میں تحریک احیا کا تذکرہ جس کا آخری نقطۂ عروج ظہورِ پاکستان تھا۔۔۔۔۔ اس میں ان سب ملی احساسات کو سمونا چاہیئے، جن کے فروغ سے اس نئی سلطنت کا قیام ممکن ہوا۔

سیاسیات اور معاشیات کے نصابوں میں اس تنقیدی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے، جس کا ذکر آچکا ہے۔ یہ نقطۂ نظر چند اسلامی عقیدوں پر مبنی ہے (الف) عقیدۂ توحید جو خدا کو واحد بھی کہتا ہے اور اسے رب العالمین بھی گردانتا ہے اور احکم الحاکمین بھی قرار دیتا ہے۔

تاریخی و عمرانی علوم کے بعد ادب وفن کا مضمون آتا ہے۔ نصابوں میں ادبی و فنی مواد کو جگہ دینے کے لئے بہرحال کسی معیار کی ضرورت ہوگی۔ کسی کوشش سے پہلے یہ ضرور متعین ہو جانا چاہیئے کہ ادب وفن کا مقصد کیا ہے۔ ادب وفن دراصل انسان کی جذباتی دُنیا کی خوبصورت تنظیم کا نام ہے۔۔۔۔۔۔ لہٰذا اس کی دو بنیادیں واضح ہیں۔ ایک ترچھے شریفانہ جذبات اور دُوسری جمالیاتی تنظیم۔۔۔۔۔۔، پھر وُہ ادب جو سچے شریفانہ جذبات کی ترجمانی کرے اور اپنی ساخت میں خوبصورت ہو، نصاب کا حصّہ بن سکتا ہے۔

ادبی نصابوں کے تعلق میں ایک معیار اور بھی ہے اور وُہ یہ کہ ان میں کوئی ایسی شے شامل نہ کی جائے جو قوم کے سماجی تصوّرات سے متصادم ہو اس لئے کہ تعلیم ایک معاشرتی ادارہ ہے لہٰذا اسے معاشرتی احساسات کا خیال رکھنا چاہیئے۔۔۔۔۔ البتہ اعلےٰ سطحوں اور درجوں میں اگر تنقیدی نقطۂ نظر سے تدریس ہو تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں مگر وہاں بھی اس کو قوم کے معاشری احساسات کو مجروح کرنے اور ان کے خلاف تنظیم کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

آج کل ادب کے نصابات عجب پریشانی اور کھینچا تانی کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ ادب کے نصابوں سے یہ توقع رکھی جا رہی ہے کہ وُہ معاشرتی تحریروں یا جنبہ دارانہ نظریات کی تبلیغ کا ذریعہ بن جائیں۔ میری رائے میں ادب کے نصاب کو فقط ادب کا نصاب ہونا چاہیئے۔۔۔۔۔ اس کا معیار فقط یہ ہے کہ اس کا انتخاب شریفانہ سچے جذبات کا حامل ہو اور ادب پاروں کی ساخت حسین ہو۔ اور شریفانہ سے مراد یہ ہے کہ قوم کے احساسات شرافت سے متصادم نہ ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ کسی شریف ادیب کے احساسات غیر شریفانہ نہیں ہو سکتے۔

دینی نصابوں کی موجودہ بنیاد واضح نہیں۔ ان نصابوں کا مقصد یہ بھی ہو کہ دین کی قطعی معلومات مل جائیں مگر یہ بھی ہونا چاہیئے کہ آج کے دَور میں پیدا شدہ علوم کی روشنی میں دینی افکار و عقائد و حقائق کی تعبیر کس طرح کی جائے۔

تجرباتی سائنس کے نصاب سب سے سہل ہیں۔۔۔۔، کیونکہ یہ علم معیّن تجربات پر مشتمل ہے، اور وُہ صحیح و ثابت طلبہ تک پہنچنے چاہئیں۔ البتہ ہر سائنسی علم کے ساتھ اس علم میں مسلمانوں کا حصّہ بطور تاریخ ضرور شامل کیا جائے۔ اسی طرح اس کے نظریات سے پیدا شدہ فلسفے کی تعبیر، اسلامی عقیدوں کی روشنی میں ہونی چاہیئے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

اب آخر میں بطور خلاصہ تعلیمی نصابوں میں نظریے کو سمونے کے لئے چند اہم اصُول تجویز کئے جا سکتے ہیں، جن سے طریق کار کی وضاحت ہو سکے گی۔ پہلا اصُول یہ ہے کہ ان نصابوں میں اپنی اصطلاحات رائج کی جائیں۔۔۔۔، یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ ہر قوم زندگی کے تجزیہ و تعبیر کے لئے اپنی خاص اصطلاحات اور اپنا خاص پیرایۂ بیان ایجاد کرتی ہے۔۔۔۔، اصطلاحات کے پس منظر میں قومی عقیدے ہوتے ہیں، جن کا اظہار

ان خاص اصطلاحات کے بغیر کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ؛ کسی دوسری قوم کی اصطلاح یا محاورہ ترجمے میں تبدیل ہو ہی نہیں سکتا لہذا محاورہ ہر حال اپنا ہونا چاہیئے۔ جہاں مغربی محاورے ناگزیر ہیں، وہاں یہ بھی بتانا چاہیئے کہ اس محاورے کا مفہوم کن کن پہلوؤں سے ہمارے محاورے سے مختلف ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ واقعاتِ زندگی کی تعبیر و توجیہ اپنے مخصوص عقائد کی روشنی میں ہونی چاہیئے۔ اس کے لیے تصورات کی ایک فہرست مرتب ہونی چاہیئے۔ اور چند بنیادی فقرے ہر جگہ استعمال ہو کر جذب کرانے چاہییں۔

میں اس سلسلے میں ادارۂ تعلیم و تحقیق کے فاضل استاد ڈاکٹر اقبال ظفر اور خواجہ نذیر احمد صاحبان کے ایک کتابچے کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو انہوں نے سوشل سٹڈیز کے مطالعہ و درس کے سلسلے میں مرتب کیا ہے۔ میری رائے میں یہ بڑی قیمتی دستاویز ہے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ مغربی نظریات کو اسلامی عقیدوں کے حوالے سے معقول تنقید کے ساتھ پیش کیا جائے۔

چوتھا اصول یہ ہے کہ اسلامی ہندوستان کی تاریخ کے نصاب از سرِ نو مرتب کئے جائیں۔ ۔ ۔ ۔ ؛ اور اس تاریخ کو اسلامی تاریخ کی اجتماعی سرگزشت کے ساتھ ملا کر پیش کیا جائے۔ اس تاریخ کا تہذیبی حصہ زیادہ نمایاں کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کو کس طرح تہذیب و ترقی سے روشناس کیا۔ قبل از اسلام کی تاریخ کی بھی ایک جھلک دکھائی جائے تاکہ مقابلہ ہو سکے۔

پانچواں اصول یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کی پوری تاریخ مرتب کی جائے۔ اس کے حقیقی اسباب و علل پر سے پردہ اُٹھایا جائے اور یہ بتایا جائے کہ اس آخری واقعہ

یعنی ظہورِ پاکستان کا مسلمانانِ ہند کے احساسِ زوالِ سلطنت اور عقیدۂ غلبۂ اسلام سے کیا تعلق ہے۔ یہ بھی بتایا جائے کہ مسلمانوں میں زندگی کی ہر تڑپ کی ترجمانی کے لیئے مذہب ہی کو مخاطب کیا جاتا تھا۔ اس لیئے مطالبۂ پاکستان کا سارا مسئلہ دینی اور مذہبی بنیادوں پر اُٹھایا گیا تھا اور آئندہ بھی انہیں بنیادوں پر مستحکم ہو سکتا ہے۔

چھٹا اصول یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد کے واقعات کی روداد احتیاط سے لکھی جائے۔ ۔ ۔ ۔ اور ایسا پیرایہ نہ اختیار کیا جائے جو یاس و قنوط پر منتج ہو۔ ۔ ۔ ۔ بلکہ اسے تجربوں کا دَور کہا جائے۔ اور ان عقیدوں کی نشاندہی کی جائے جو مرکزی اساسی خیالوں سے متصادم ہو کر انتشار کا باعث ہوئے۔

اور یہ بھی کیا جائے کہ پاکستان کے فکری اور اجتماعی نصب العین کی صحیح معرفت و تشخیص و تعیین کر کے دوامی مرکزی حیثیت دی جائے۔

جب تک معاشرہ، اُستاد اور شاگرد تینوں اس میں شریک نہ ہوں مطلوبہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اگر اُستاد اس معاملے میں تعاون نہیں کرے گا تو یہ ساری ہم بے اثر ثابت ہوگی۔ مگر اُستاد بھی ایک سطح پر ایک اور رکاوٹ سے متاثر ہوتا ہے۔

پاکستان میں سب سے بڑی رکاوٹ خود طبقۂ حکام ہے جو مغرب زدہ ہیں اور اسلام سے واجبی اور مجبوری کا تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اپنی نجی محفلوں میں مسلمان کہلانے میں ندامت محسوس کرتے ہیں اور اسلام کے بارے میں ان کا رویّہ تشکیک و تضحیک کا ہے۔ ایسے میں نظریہ پاکستان کو ایک زندہ عقیدے کے طور پر تعلیم میں جاری کرنا محال ہے۔

ان کے بعد دانشور آتے ہیں جو خالص مغربی لوگ ہیں اور مغرب کی منطق اور دلیل پر وحی و الہام سے زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ ان میں اُستادوں کی اکثریت بھی شامل ہے۔

جب قوم کے یہ دو بڑے طبقے مغرب پر ایمان لا چکے ہوں تو معاشرے کے باقی طبقے..... ہجوم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ تاجر، دولت مند، کھاتے پیتے اور بگڑے ہوئے متوسط لوگ کس طرح نظریہ پاکستان کے پرچار کو گوارا کر سکتے ہیں؟

ان حالات میں تعلیم میں تبدیلی کا امکان کم ہے..... زبانی زبانی، اکھڑی اکھڑی سی کچھ باتیں جن پر خود استاد کو بھی یقین نہیں ہوگا ہوتی رہیں گی اور گھر برباد ہوتے رہیں گے۔

تبدیلی کا امکان طویل جدوجہد سے ہوگا جب نظریہ پاکستان کے مخلص مبلغ، اپنے موثر طرزِ تعبیر سے ایک ایسا گروہ پیدا کرلیں گے جو انقلاب لا سکے گا..... ایسے انقلاب کے بغیر موجودہ بورژوا احکام اور بورژوا معاشرہ، اپنی تعلیم میں کسی تبدیلی کو گوارا نہ کرے گا۔ نظریہ پاکستان اگر سچ مچ عوام کی ترجمانی کرنے لگے تو موجودہ کھوکھلا اور ریاکار بورژوا طبقہ پھر کہاں رہے گا..... پس یہ بورژوا ہر قیمت پر اس انقلاب کو روکے گا۔

خطبہ صدارت

پروفیسر میاں نامدار خان

جناب چیئرمین صاحب و معزز خواتین و حضرات!

ڈاکٹر پروفیسر عبدالحمید صاحب اور جناب ڈاکٹر اصغر علی شیخ صاحب کے مقالات کے بعد کچھ کہنا آپ کی سمع خراشی ہوگی تاہم دو ایک معروضات کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے بہت خوش اسلوبی سے چند ایک تنقیدوں کا جواب دیا ہے، جو بعض اوقات ٹیکسٹ بک بورڈ کے خلاف کی جاتی ہیں اور بڑی خوش اسلوبی سے ٹیکسٹ بک بورڈ کا دفاع کیا ہے اور ساتھ ہی خود تنقید بھی کی ہے کہ کس طرح ان کے اسباق زیادہ اچھے اور زیادہ موثر ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اصغر علی شیخ صاحب نے ہم سب پر ایک بہت بھاری احسان کیا ہے کہ آج انہوں نے اسلامک آئیڈیالوجی کی تعریف کی ہے اور اس میں جو جو اجزا شامل ہیں، ان کو فرداً فرداً واضح کیا ہے۔ میں نے کئی مہینے پہلے کئی عالم دوستوں کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ مجھے مہربانی کرکے ایک دو صفحے میں بتا دیں کہ اسلامک آئیڈیالوجی کیا ہے؟ میں ان کے ایک یا دو صفحوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ جس جامعیت، اختصار اور سلاست کے ساتھ ڈاکٹر اصغر علی شیخ صاحب نے اسلامی آئیڈیالوجی کی تعریف کی ہے اور اس کے اجزا کو بیان کیا ہے، میں نے پہلے نہیں سُنا۔

آپ ابھی کچھ عرصے کے بعد ایک گروہی بحث میں حصہ لیں گے مگر گروہی بحث میں دو

باتیں، مجھے امید ہے، آپ مزید بحث میں لائیں گے۔ ایک تو یہ بات جو ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے بڑی واضح طور پر بیان کی ہے کہ بہت سے اسباق ان نصابی کتابوں میں ایسے ہیں، جنہیں ہونا چاہیے مگر وہ اپنا مقصد پورا نہیں کر رہے۔ انہوں نے ہمارے کئی ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے، جن کے کارہائے نمایاں کو ہمیں کسی اور طریقے سے واضح کرنا چاہیے تھا اور جن کا ذکر محض BIO-DATA ہو کر رہ گیا۔ یہ بہت ہی اہم بات ہے۔ موجودہ ماہرین تعلیم اسلامی قدروں اور اسلامی VALUES کو کس طرح سے پیش کر سکتے ہیں، جیسا کہ ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے فرمایا، وہ شاید اس طرح سے پیش نہیں ہو رہیں۔ تو میں ذکر کرنے لگا تھا کہ علم کا CONCEPT کیا ہے؟ علم کی صرف ایک کسوٹی ہے اور وہ رویے میں تبدیلی ہے اور جو سبق اور نصاب بھی اس تبدیلی کو حاصل نہیں کر سکتا، وہ شاید عصر حاضر کے ابلاغ کی مہارتوں سے ناواقف ہو گا۔ اس بات پر ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے بہت زور دیا ہے کہ ہمیں علامہ اقبالؒ جیسی ہستیوں کے BIO-DATA نہیں دینے چاہییں۔ ان کی تعلیمات سے اپنے بچوں کو روشناس کرنا چاہیے اور روشناسی کے ناپنے کا، اس کو جانچنے کا اور اس کی پڑتال کرنے کا بھی صحیح قسم کا معیار ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ کسی امتحان کے وقت کسی سوال کے جواب میں چند رٹے رٹائے جملوں کا اعادہ کر دیا جائے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ علم رویے میں تبدیلی پر مشتمل ہے اور یہ کہ علم عمل سے جانچا جانا چاہیئے تو BIO-DATA قسم کے اسباق موثر نہیں ہوں گے، وہ مقصد پورا نہیں کر سکیں گے، جس مقصد کے لئے وہ پڑھائے جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے، آپ اپنے مباحث میں اس بات پر ضرور غور فرمائیں گے کہ کیا ہم میں ابلاغ عامہ کی مہارتوں کی کمی ہے؟ وہ اسباق کیوں غیر موثر ہیں؟ اور وہ رویے کی تبدیلی کیوں نہیں کر رہے، جس کے بغیر علم علم نہیں ہوتا۔

دوسری گزارش جو مجھے کرنی ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں کبھی نہیں بھولنا چاہیئے اور اس چیز کا اس مجلس میں اعادہ کرنا ہی اس چیز کا ثبوت ہے کہ ہم بعض وقت بھول جاتے ہیں کہ ہر نظام تعلیم کے دو بنیادی اور اساسی مقصد ہوتے ہیں۔ ایک بنیادی مقصد ہے اپنی تہذیب اور قومی روایات اور اقدار کو نئی نسل تک پہنچانا، جس میں اپنی قوم اور معیشت کی اقدار شامل ہیں اور اپنی آئیڈیالوجی شامل ہے۔ جب تک کوئی نظام تعلیم یہ فرض منصبی ادا نہیں کر رہا اس میں بہت خامی ہے۔

دوسرا بنیادی اور اساسی مقصد ہر نظام تعلیم کا یہ ہے کہ وہ نئی پود کو پرانی اقدار اور پرانی روایات کو جانتے ہوئے انہیں مستحکم کرتے ہوئے کس طرف لے جاتا ہے؟ آئندہ کے لئے قومی مقاصد کیا ہیں؟ جب تک ان دونوں باتوں کا کما حقہٗ امتزاج نہیں ہو گا، کوئی بھی نظام تعلیم مکمل نہیں ہو سکتا۔ اب یہ اور بات ہے کہ بعض دفعہ پرانی قدروں اور پرانی روایات پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ دوسرے مقصد کو یکسر بھلا دیا جاتا ہے۔ جس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ دوسری طرف مستقبل کی ضروریات پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ اپنا ماضی بالکل بھول جاتا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں سے بات نہیں بنتی۔ جس نظام تعلیم میں دونوں چیزوں کا پورا پورا امتزاج نہیں ہو گا، وہ نظام تعلیم اپنا مقصد پورا نہیں کرے گا۔ جیسے کہ ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے فرمایا تھا اور ڈاکٹر اصغر علی شیخ صاحب نے بھی اس کا اعادہ کیا ہے کہ بہت سی چیزیں ہم انگریز کے وقت کی لئے جا رہے ہیں۔ انہوں نے بالکل صحیح فرمایا۔ ۸ سال پہلے تک جنوبی امریکہ کے شمال میں ایک چھوٹا سا ملک ہے جو پہلے "برٹش گی آنا" کہلاتا تھا، اب آزادی کے بعد "گی آنا" کہلاتا ہے۔ ان کے نصاب "پری میڈیکل کورسز" میں خرگوش کی چیر پھاڑ شامل تھی۔ وہ ایسا ملک ہے اور اس کے ہمسائے ایسے ملک ہیں، جہاں خرگوش نہیں ہوتا، اس لئے بچوں کو پڑھانے

کے لئے اور امتحان دینے کے لئے انگلستان سے خرگوش درآمد کئے جاتے تھے۔ ہمارے نظام تعلیم میں اور ہماری نصابی کتب میں بہت سے خرگوش باقی ہیں۔ ان کا آپ حضرات نے کوئی سد باب کرنا ہے۔ ان خرگوشوں کو نکال کر وہ جانور رکھا جائے جس جانور سے ہم مانوس ہیں، جو ہمارے ملک میں پیدا ہوتا ہے اور جس سے ہمارے بچے بھی واقف ہیں اور ہمیں اسے درآمد کرنے کی ضرورت نہیں۔

ان چند گزارشات کے بعد میں آپ سے اجازت لیتا ہوں اور آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ آپ کے اس جلسے میں شامل ہو سکوں۔

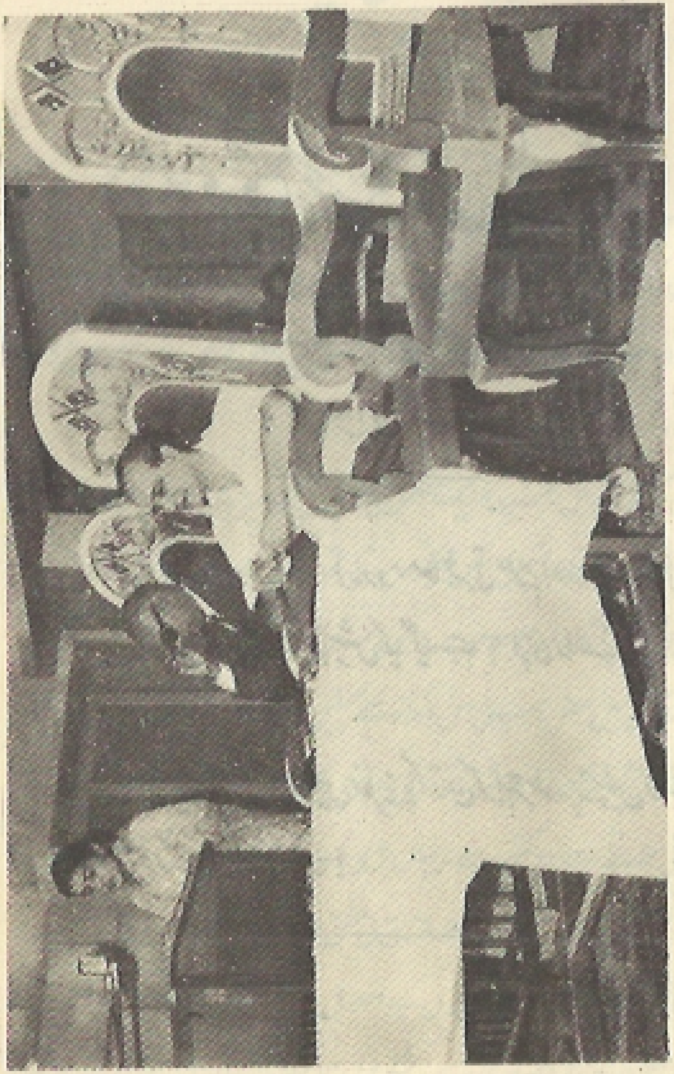

سیمینار کی آخری نشست میں گروہی بحث کی رپورٹ پیش کی جا رہی ہے

گروہی بحث کی رپورٹیں

(۲۹- ستمبر ۱۹۷۱ء)

سوالات

۱- کیا نظریۂ پاکستان دینیات، اردو، معاشرتی علوم اور انگریزی کی موجودہ نصابی کتابوں میں کما حقہٗ پیش کیا گیا ہے؟ اپنی رائے کے لیے تفصیلی دلائل مہیا فرمائیں۔

۲- نصابی اور اضافی کتابوں میں نظریۂ پاکستان کو بہتر طور پر پیش کرنے کے لیے آپ کی واضح تجاویز کیا ہیں؟

گروہی بحث کی رپورٹ

مضمون اُردو

کیا اُردو کی موجودہ نصابی کتابوں میں نظریۂ پاکستان کما حقہٗ پیش کیا گیا ہے؟

ایوان کی متفقہ رائے یہ تھی۔

کہ موجودہ نصابی کتابیں نظریۂ پاکستان کو بطریق احسن پیش نہیں کرتیں۔ اس سلسلے میں دلائل یہ ہیں۔

۱- دسویں کی کتاب میں سرسید کا ایک مضمون "مہمان اور میزبان" شامل ہے، جو ہمارے اصل مقصد سے بظاہر متعلق نہیں جبکہ سرسید کی تحریروں سے ایسا مواد بآسانی مل سکتا ہے، جو نظریۂ پاکستان اور اسلام سے براہِ راست متعلق ہو۔

۲- درسی کتابوں میں بعض اسباق اس انداز سے پیش نہیں کئے جاتے کہ ان کے پس منظر میں اسلامی نظریہ کارفرما ہو۔ مثلاً اُردو کی پانچویں کتاب میں ایک لڑکی ماں کو دُودھ میں پانی ملانے سے روکتی ہے۔ یہاں بڑی آسانی سے اسلامی دیانت کا سبق دیا جا سکتا تھا لیکن نہ تو سبق میں اور نہ سبق کی مشق میں اس اہم مقصد کو واضح کیا گیا ہے۔

۳- ایسے اشعار اور نثری جُملے، جو بچوں کے اخلاق پر بالواسطہ یا بلاواسطہ بُرا اثر ڈالتے ہوں، انہیں حذف کرنا ضروری ہے۔ مثلاً نویں جماعت کی کتاب میں مرزا غالب کے چند اشعار کی تشریح کے سلسلے میں یہ جملہ کہ "شراب پی کر وصل نصیب نہ ہوا اور وصل

میسرآیا تو شراب نہ ملی۔"

۴۔ اعلیٰ ثانوی سطح کے نصاب میں نظریۂ پاکستان سے متعلق کوئی مضمون نہیں ہے۔ اس کے برعکس عاشقانہ اشعار کثرت سے ہیں۔ یہی کیفیت نویں، دسویں کے نثری حصے کی ہے۔

۵۔ درسی کتابوں میں نظریۂ پاکستان کو جس موثر انداز سے پیش ہونا چاہیئے تھا، اس کی شدید کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے مصنفین کا نقطۂ نظر اور انداز بیان خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔

نصابی اور اضافی کتابوں میں نظریۂ پاکستان کو بہتر طور پر پیش کرنے کیلئے تجاویز

۱۔ درجہ اوّل سے درجہ دہم تک قیام پاکستان کا مضمون ہر درجے میں بچوں کی قابلیت کے مطابق شامل نصاب ہونا چاہیئے۔ اس وقت صرف پانچویں میں ایک مضمون "قیام پاکستان" موجود ہے۔

۲۔ ہمارے پورے نصاب میں اس مقصد کی جھلک ضرور ہونی چاہیئے، جس کے لئے ہمارا ملک وجود میں آیا۔

۳۔ قدیم ادبا کے جو مضامین شامل نصاب کئے جائیں، ان میں نظریۂ پاکستان و اسلام کی مناسبت سے قابل اعتراض حصے حذف کر دینے چاہئیں۔

۴۔ حالی، شبلی اور سر سید احمد خاں کے مضامین میں سے تاریخی اور قومی مضامین نصاب میں زیادہ تر شامل کئے جائیں۔

۵۔ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، محمد علی جوہر، حفیظ جالندھری اور اکبر الٰہ آبادی کے

کلام کا بالخصوص وہ حصہ ضرور شامل کیا جائے، جو اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلم قومیت سے تعلق رکھتا ہے۔

۶۔ درسی کتابوں میں اسلامی تہواروں اور مہینوں کا بھی احترام ملحوظ رکھا جائے۔

۷۔ اردو کے لسانی تقاضوں کے پیش نظر یہ سفارش کی جاتی ہے کہ نظریۂ پاکستان سے متعلق موضوعات اور ادبی موضوعات میں تناسب ملحوظ رکھا جائے۔ اس ایوان کی رائے میں یہ تناسب ۵۰ فیصد ہونا چاہیے۔

۸۔ اسباق میں غیر ملکی تہذیب اور ان کے رہن سہن کو پرکشش بنا کر پیش نہ کیا جائے بلکہ پاکستانی معاشرت اور ماحول کی خوبیاں اجاگر کی جائیں۔

۹۔ ہر درجے کے نصاب میں ہمارے شہیدوں اور غازیوں کو زیادہ سے زیادہ جگہ ملنی چاہیے اور اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ وہ پاکستان کے دونوں حصوں کی نمائندگی کریں۔

۱۰۔ مختلف مضامین کی کتابوں کے لئے مصنفین کے بورڈ الگ الگ ہوتے ہیں اس لئے موضوعات کا تکرار ہو جاتا ہے اور کہیں کہیں تضاد بھی۔ لہٰذا ایک مرکزی جائزہ کمیٹی ایسی ہونی چاہیے، جو تمام درسی کتابوں کا جائزہ لے کر ان میں ہم آہنگی اور تسلسل قائم رکھے۔

۱۱۔ اردو کی تدریس کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باقاعدہ تربیت یافتہ اساتذہ کا ہونا بے حد ضروری ہے اور نصاب کو ترتیب دیتے وقت سکولوں کے اساتذہ کی نمائندگی نہایت لازمی ہے۔

صدر:- ڈاکٹر وحید قریشی

سیکرٹری:- مس رفیعہ قمر

گروہی بحث کی رپورٹ

تاریخ گروپ

اگرچہ اس سیمینار میں تاریخ کو ایک علیحدہ مضمون کی حیثیت نہیں دی گئی ہے لیکن تاریخ کے اساتذہ کے اصرار پر ٹیکسٹ بک بورڈ کے ارباب حل و عقد نے نظریہ پاکستان کے ضمن میں علیحدہ تجاویز تیار کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ تاریخ کے لئے گروہی بحث و تمحیص میں قرار پایا کہ

۱۔ تاریخ کو مڈل اور میٹرک میں لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔

۲۔ تاریخ کو قوم کے لئے وہی درجہ حاصل ہے، جو افراد کے لئے ان کی یادداشت کو حاصل ہوتا ہے۔

تاریخ ماضی کا آئینہ، زمانۂ حال کے لئے سبق اور مستقبل کے لئے ایک امید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ہم مستقبل کی تعمیر چاہتے ہیں تو ماضی سے الگ ہو کر یا اپنی قومی روایات کو بھلا کر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔ تاریخ کے مطالعہ سے ہمارے کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے بچوں کے ذہن میں اپنے اسلاف کے کارنامے اور ان کے کردار اس طرح بٹھائیں کہ وہ آئندہ زندگی میں غیروں سے متاثر نہ ہوں اور اپنے اکابر کے افکار و ہدایات اور تجربات ان کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں۔

۳۔ تاریخ کی درسی کتابوں میں نظریہ پاکستان کے تاریخی پس منظر کو سامنے رکھا جائے۔

۴۔ تاریخ کے اساتذہ کے لئے ریفریشر کورسز کا انتظام ہونا چاہیے، جس میں انہیں یہ بتایا جائے کہ وہ طالب علموں میں تاریخ کے مضمون کو دلچسپ کیونکر بنا سکتے ہیں۔

۵۔ ٹیسٹ پرچہ جات، گائیڈوں، گیس پرچہ جات کی کلیتاً ممانعت کر دی جائے۔

۶۔ تاریخی ایام مثلاً یوم ولادت رسول اکرمؐ، یوم اقبالؒ، یوم قائد اعظمؒ وغیرہ کو تقدس اور نظم و ضبط سے منانے کا سکولوں اور کالجوں میں اہتمام کیا جائے۔

۷۔ تاریخ مختلف جماعتوں میں کچھ اس طرح پڑھائی جائے۔

۱۔	چھٹی جماعت	تاریخ پاک و ہند	712ء ـــــ 1526ء
۲۔	ساتویں جماعت	"	1526ء ـــــ 1707ء
۳۔	آٹھویں جماعت	"	1707ء ـــــ 1857ء

۴۔ نہم اور دہم میں تاریخ کے دو پرچے ہونے چاہئیں۔ پرچہ الف تاریخ اسلام۔ ابتدا سے خلافت راشدہ تک۔

پرچہ ب اولاً تاریخ پاک و ہند 1857ء ـــــ 1970ء

ثانیاً ہندو عہد کی تہذیب و ثقافت مثلاً وادیٔ سندھ کی تہذیب، ہندومت، جین مت اور بدھ مت کا تقابلی مطالعہ۔ ان کے عروج و زوال کے اسباب سے روشناس کرایا جائے۔

ثالثاً ہندوستان میں مختلف اقوام کی آمد، ہندو تہذیب، ان کے ادغام، راجپوتوں کے حالات، اسلامی حملوں کے وقت ملک کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالت کا مختصر ذکر شامل ہونا چاہیئے۔ علاوہ بریں دنیا کے اہم انقلابی تاریخی واقعات سے تازی جماعتوں کے طلبا کو آگاہ کیا جائے۔

۸۔ نصابی کتابوں میں، 1857ء سے لے کر 1947ء تک برصغیر پاک و ہند میں جو مختلف تحریکیں معرض وجود میں آئیں اور بالآخر قیام پاکستان پر منتج ہوئیں، ان کا جائزہ لیا جائے اور اس امر کا خاص خیال رکھا جائے کہ ان میں شخصیتوں پر زور دینے کی بجائے ان تحریکوں کے اصل مقاصد کو اجاگر کیا جائے۔

صدر:۔ مسز زرینہ سلامت۔ گورنمنٹ کالج، سمن آباد۔ لاہور

سیکرٹری:۔ چودھری ہدایت اللہ خان، گورنمنٹ ڈگری کالج، باغبانپورہ۔ لاہور

گروہی بحث کی رپورٹ

گروپ دینیات

کیا نظریۂ پاکستان دینیات کی موجودہ نصابی کتابوں میں کماحقہٗ پیش کیا گیا ہے؟

۱۔ نصاب کی کتب میں نظریۂ پاکستان کے متعلق کافی حد تک مواد موجود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اساتذہ اور طلبہ کی بہتر تربیت کی جائے اور عمل امتحان شامل نصاب کیا جائے۔

۲۔ سب نے متفقہ طور پر کہا کہ دیگر مضامین کی تمام کتب پر اسلامی نظریۂ حیات اور نظریۂ پاکستان کی رو سے نظر ثانی کی جائے۔

۳۔ اسلامیات لازمی اور اختیاری برائے جماعت نہم و دہم کا نصاب ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہیئے تاکہ جو طلبہ لازمی اسلامیات کے ساتھ اختیاری پڑھتے ہیں، وہ اسلامیات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر سکیں۔

۴۔ اسلام کو اس کی اصل روح کے قریب لانا اور معاشرتی زندگی میں اس کی تعلیمات یعنی قانون تمدن میں جدیدیت کی روح پھونکنا ضروری ہے۔ اس کے مطالب نصابی کتب میں شامل ہونے چاہئیں۔

نصابی اور اضافی کتابوں میں نظریۂ پاکستان کو بہتر طور پر پیش کرنے کیلئے واضح تجاویز

۱۔ تمام مضامین خصوصاً انگریزی، اردو اور معاشرتی علوم میں اسلامی اصول واضح طور پر

دلچسپ انداز میں پیش کئے جائیں اور ان اصولوں کی وضاحت کے لئے کتاب و سنت کے حوالے شامل نصاب کئے جائیں تاکہ اسلام اور نظریۂ پاکستان کی برتری نمایاں ہو۔

۲۔ (۱) مکمل قرآن مجید (ناظرہ) شامل نصاب کیا جائے اور اس کی تدریس اور امتحان کا باقاعدہ اہتمام کیا جائے۔ مزید برآں لازم قرار دیا جائے کہ قرآن پاک پڑھاتے وقت اس کے تقدس کا پورا پورا اہتمام کیا جائے۔ قرآن خوانی کے لئے ایک کمرہ مختص کر دیا جائے۔

(ب) حفظ کے لئے کم از کم آخری دس سورتیں شامل نصاب کی جائیں جو بمشکل ڈیڑھ صفحہ میں آتی ہیں۔ اس سے بچوں کو نماز کی ادائیگی وغیرہ میں سہولت ہوگی۔

(ج) قرآن مجید کا کچھ مزید حصہ شامل نصاب کیا جائے۔ موجودہ کتابوں کے تکرار اور اعادہ کو فوراً ختم کیا جائے۔ ان کی جگہ قرآن مجید کے دوسرے حصے شامل نصاب ہونے چاہئیں۔

۳۔ قرآن مجید کے منتخبات کی طرح منتخب احادیث بھی ہر جماعت کے نصاب میں شامل کی جائیں۔ موجودہ نصاب میں آٹھویں جماعت تک کوئی ایک حدیث بھی شامل نصاب نہیں۔

۴۔ اضافی کتابوں میں کچھ کتابیں اسلامی نظریات کے مختلف پہلوؤں پر مرتب کی جائیں، جن کی تیاری میں بچوں کی ذہنی استعداد وغیرہ کا لحاظ رکھا جائے۔

صدر: پروفیسر محمد اسلم

سیکرٹری: جناب محمد اسلم کمبوہ

گروہی بحث کی رپورٹ

گروپ انگریزی

کیا نظریۂ پاکستان انگریزی کی موجودہ نصابی کتابوں میں کماحقہ پیش کیا گیا ہے؟

مجموعی طور پر تمام اراکین کا تاثر نفی میں ہے۔ نظریۂ پاکستان اور اسلامی معاشرت کے متعلق درسی کتب میں بہت کم مواد ہے بلکہ بعض کتب میں قرآن کا تذکرہ ہی مفقود ہے۔

اراکین نے موجودہ درسی کتب کا جائزہ لیا اور ان کی رائے تھی کہ

MIDDLE STAGE اراکین نے ترتیب مضامین پر اعتراض کیا۔ اس میں "چوری
ENGLISH BOOK—I کرتا ہوا درزی" ایک مضمون ہے۔ ازاں بعد قائداعظمؒ پر اور سب سے آخر میں رسول اللہؐ پر مضمون ہے۔ نیز یہ مضمون نہایت مشکل زبان میں لکھا گیا ہے اور خدشہ ہوتا ہے کہ مرتبین نے دانستہ طور پر دقیق زبان استعمال کی ہے۔

MIDDLE STAGE اس کتاب میں صفحہ ۱۰۲ پر کراچی سے لندن کا موازنہ بیجا
ENGLISH BOOK II ہے اور اسی کتاب میں کشمیر کے بارے میں کچھ ایسے تاثرات ہیں گویا جغرافیائی رکاوٹیں پاکستان اور کشمیر کے درمیان حائل ہیں۔

SECONDARY STAGE اس میں TARIQ BURNS HIS BOAT
ENGLISH BOOK I میں موت کا خوف جذبۂ شہادت پر غالب نظر آتا ہے۔

دوسرے سبق MOHAMMAD BIN QASIM کا آخری فقرہ نظریاتی طور پر گمراہ کن ہے۔

ایک اور سبق MOSES & KHIZAR اسلوب نگارش کے اعتبار سے کمزور ہے اور اس کا ابتدائی پیراگراف مضحکہ خیز ہے۔

SECONDARY STAGE اس میں ۲۰ اسباق میں سے چند اسباق خالصتاً انگریزی
ENGLISH BOOK II معاشرت سے متعلق ہیں۔

F.A. TEXT BOOKS

INTERMEDIATE
ENGLISH BOOK—I میں پہلا مضمون PAKISTAN ZINDABAD جان والش نے لکھا ہے اور اس میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کی کوئی سند نہیں۔ مثلاً لفظ تخارستان۔ قائداعظمؒ کے بارے میں غیر مصدقہ باتوں پر انحصار کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں تحریک پاکستان کے بارے میں درست معلومات مہیا نہیں کی گئیں۔

ایک اور کتاب STORIES OF MODERN ADVENTURE میں تمام ہیرو غیر ممالک سے متعلق ہیں اور ان میں اسلامی مشاہیر کا کوئی تذکرہ نہیں۔

جو ناول PRISONER OF ZENDA نصاب میں شامل ہے وہ ثقافتی لحاظ سے نا موزوں ہے۔ TWO ONE-ACT PLAYS میں ایک ڈرامہ COUNT'S REVENGE ہے جس میں ترکوں کا تذکرہ اچھے انداز میں نہیں کیا گیا نیز اس ڈرامے سے کوئی اہم اخلاقی سبق اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

ایف۔ اے کے نصاب کے بارے میں عمومی رائے یہی تھی کہ ان درسی کتب میں ایک ایسے طرز زندگی کی تعریف و توصیف مترشح ہوتی ہے، جو مغربی تہذیب سے ہم آہنگ ہے۔

نصابی اور اضافی کتابوں میں نظریۂ پاکستان کو بہتر طور پر پیش کرنے کیلئے واضح تجاویز

اراکین کی یہ رائے تھی کہ وہ تخلیقات جو غیر پاکستانی مصنفین کی ہوں مثلاً ناول، ڈرامے، نظمیں ان کے انتخاب میں اس امر کا اہتمام کیا جائے کہ

۱۔ ان میں نظریۂ پاکستان کی نفی نہ ہوتی ہو۔

۲۔ ایسی معاشرتی اقدار نہ اُبھرتی ہوں جو اسلامی طرزِ زندگی کے متعلق جذبۂ حقارت پیدا کریں۔

۳۔ ان میں بنیادی انسانی آفاقی اقدار کو نمایاں کیا گیا ہو۔

اراکین کی رائے تھی کہ قرآن کے تقدس کو قائم رکھنے کے لئے کتب پر قرآنی آیات نہ چھاپی جائیں بلکہ قرآن کی روح کے مطابق ایسے جملے لکھے جائیں جن میں اخلاقی پندونصائح ہوں اور جو طالب علموں کی ذہنی سطح کے مطابق ہوں۔

بورڈ میں ایک نظریاتی سیل " IDEOLOGICAL CELL " قائم کیا جائے جس کے ذمے یہ کام ہو کہ وہ تمام درسی کتب کے مسودات پر نظرثانی کرے۔

چھپائی اور جلد بندی کو بہتر کیا جائے۔ کاغذ کی کوالٹی اچھی ہونا چاہئے پروف ریڈنگ سکولوں کے اساتذہ سے کرائی جائے۔

مشاہیرِ اسلام اور تحریک پاکستان کے قائدین کے بارے میں فکر انگیز دلچسپ اور مختصر مضامین اپنے استادوں سے لکھوا لئے جائیں اور انہیں اضافی اور درسی کتب کا حصہ بنایا جائے۔

چند نام یہ ہیں۔

شاہ ولی اللہ۔ اسمٰعیل شہید۔ عبیداللہ سندھی۔ حسرت موہانی۔ سرسید۔ اقبال اور علی برادران۔ اضافی کتب میں نفسِ مضمون پر زیادہ توجہ دی جائے اور نہایت آسان اور سلیس انگریزی کا استعمال کیا جائے۔

اس کے علاوہ اراکین کی یہ متفقہ رائے تھی کہ نصاب کے تعین اور اس میں تبدیلی کے فیصلے ایسی کمیٹیاں کرتی ہیں جن کا تعلیمی عمل سے براہِ راست رابطہ بہت کم ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی سفارش تھی کہ کتابیں لکھواتے وقت اساتذہ کی ایسوسی ایشنوں کے نمائندوں کو بطور EX-OFFICIO ممبران شامل کر لیا جائے۔

صدر:۔ مس بلقیس شاہ

سیکرٹری:۔ پروفیسر رؤف انجم

گروہی بحث کی رپورٹ

معاشرتی علوم گروپ

کیا نظریۂ پاکستان معاشرتی علوم کی موجودہ نصابی کتابوں میں کما حقہ پیش کیا گیا ہے؟

اس گروہ کی رائے یہ تھی کہ نظریۂ پاکستان معاشرتی علوم کی موجودہ نصابی کتابوں میں کما حقہ پیش نہیں کیا گیا۔

۱۔ دسویں جماعت کی معاشرتی علوم کی کتاب میں کل صفحات ۲۸۵ ہیں، جن میں سے صرف ۴۰ صفحات تاریخ کے ایسے اسباق ہیں، جن سے نظریۂ پاکستان اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس آٹھویں جماعت میں نظریۂ پاکستان اور پاکستان کے جغرافیے کے مطابق تفصیلات اس سے کہیں زیادہ ہیں اور اس درجے کے ذہنی معیار سے نسبتاً زیادہ ہیں۔ اسی طرح ٹریننگ سنٹروں میں مروج معاشرتی علوم جو ایس وی اور پی ٹی سی کے معلمین اور معلمات کو پڑھایا جاتا ہے، نظریۂ پاکستان کی وضاحت نہیں کرتا۔ یہی معلمات یا معلم سکولوں میں جا کر طالب علموں کو تعلیم دیتے ہیں۔ جب خود انہیں ہی وضاحت نہیں ہو گی تو وہ طالب علموں کو کیا بتا سکیں گے۔

۲۔ اسلوب بیان۔ اس گروپ کی رائے میں معاشرتی علوم کی کتابوں میں اسلوب بیان کو زیادہ بہتر بنایا جائے، جو نظریۂ پاکستان کو دلنشیں انداز میں بیان کرے اور ایسے الفاظ و تراکیب ترک کر دی جائیں جو نظریۂ پاکستان کے خلاف ہوں۔ مثال کے طور پر

۱۔ موجودہ نصاب میں پہلے پیراگراف میں TWO MAJOR DIVISIONS OF PAKISTAN کے عنوان سے ایک باب کا حصہ ہے۔

۲۔ اسی طرح دوسرے پیراگراف میں PEOPLES OF PAKISTAN ہے جبکہ اس کے برعکس PEOPLE OF PAKISTAN ہونا چاہیے۔

نصابی اور اضافی کتابوں میں نظریۂ پاکستان کو بہتر طور پر پیش کرنے کیلئے واضح تجاویز

۱۔ نصابی کتب میں مشاہیر کے کارناموں کو زیادہ بیان کیا جائے۔

۲۔ در اصل کتاب کی بجائے استاد اس سلسلے میں زیادہ اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اساتذہ کی تدریسی رہنمائی کے لئے موجودہ نصاب میں کوئی ہدایات نہیں ہیں، جو کہ ہونی چاہئیں۔

۳۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کا جہاں ذکر ہے، وہاں مشرقی پاکستان کے مشاہیر کا ذکر بھی ہونا چاہیئے۔

۴۔ سر سید احمد خان، علامہ اقبال اور قائد اعظم کے ارشادات کو نصاب میں خاص مقام دیا جائے۔ خاص طور پر ایسے ارشادات شامل کئے جائیں، جن میں دو قومی نظریے کی وضاحت ہوتی ہو۔

۵۔ مشاہیر پاکستان میں مانوس شخصیتوں کے علاوہ ایسی شخصیتوں کا بھی ذکر کیا جائے، جن سے عام طور پر لوگ مانوس نہیں مثلاً حاجی محسن جنہوں نے کلکتہ مدرسہ کے لئے بے شمار روپیہ فراہم کیا اور جن کی وساطت سے بنگال کے مسلمانوں کو اسلامی تمدن کے مطابق تعلیمات میسر ہوئیں۔

۶۔ اسی طرح جہاں مشرقی و مغربی پاکستان لکھا گیا ہے وہاں ان کے ہمسایہ ممالک کی ترکیب

استعمال کر کے سدھارابہ بیان کیا جائے۔

۷۔ مشرقی و مغربی پاکستان بجائے لفظ پاکستان استعمال کیا جائے۔

۸۔ اسی طرح برصغیر ہندو پاک کی جگہ پاک و ہند لکھا جائے تاکہ طلبا کے ذہن میں کوئی شبہ نہ ہو۔

۹۔ نظریۂ پاکستان کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ نصاب کے عنوانات کم ہوں۔ اس پر مشتمل مواد کو بتدریج مختلف کلاسوں میں تقسیم کر دینا چاہیئے تاکہ طالب علم پر بوجھ بھی نہ پڑے اور بار بار پڑھنے سے طالب علم اُکتا نہ جائے اور نظریۂ پاکستان کی وضاحت بھی ہو۔ موجودہ نصاب نویں اور دسویں کے لئے بہت زیادہ ہے جبکہ آٹھویں جماعت کا نصاب دن بدن بڑھ رہا ہے۔

۱۰۔ ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی کہ اگر نظریۂ پاکستان کو صحیح طور پر اجاگر کرنا ہے تو معاشرتی علوم میں ایک بڑی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اسے دو مضامین میں تقسیم کر دیا جائے۔

۱۱۔ نصاب کو شخصیات پر تقسیم کرنے کی بجائے پاکستان کے نظریہ کو تاریخی ارتقا کے ساتھ پیش کیا جائے۔

۱۲۔ کتابوں میں تصاویر و اشکال جہاں دی گئی ہیں ان کے ساتھ وضاحت کے لیے متن کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ اور زیادہ تصاویر و اشکال کی ضرورت ہے۔

۱۳۔ اسی طرح معاشرتی علوم میں جغرافیے کا حصہ، آٹھویں اور ساتویں جماعت کے لئے بہت زیادہ ہے۔ اگر شروع کے درجوں میں طالب علم کو صرف پاکستان کے نقشے کی وضاحت کر دی جائے، جو نظریۂ پاکستان کے مطابق ہو تو مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

۱۴۔ شہریت کے نصاب میں جہاں شہری حقوق و فرائض کا ذکر ہے، وہ حصہ اسلامی

نظریے کے مطابق لکھا جانا چاہیئے۔

شہریت کا آغاز یونان کی بجائے اپنے اسلاف کے ذکر سے ہو۔ شہریت کے بارے میں اسلام نے جو کچھ کہا، اس کا ذکر ہو۔ شہری آزادی، مساوات اور قانون سے متعلق اسلام کا تصور پیش کیا جانا چاہیئے۔

صدر: پروفیسر سید علی عباس

سیکرٹری: مس شاہدہ شریف

شرکائے سیمینار کا سیمینار پر اظہارِ رائے

مسٹر فیض محمد خان

جناب! سیمینار کے متعلق جنرل رپورٹ تو ہر آدمی پیش کرے گا۔ میں اِس گروہی بحث کے متعلق خاص کر نوٹ کر رہا تھا۔ میں چونکہ سائنس کا طالب علم تھا میں تلاش کرتا رہا کبھی سیڑھیوں کے نیچے کبھی سیڑھیوں کے اُوپر کہ سائنس کا مضمون کہاں ہے؟۔ یا تو میرے خیال میں سائنس کوئی ایسا موضوع ہے جس کا آئیڈیالوجی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان میں تصادم بھی نہیں ہے۔ سائنس اور مذہب کا جو جھگڑا صدیوں سے چلا آرہا ہے، اس کو اس سیمینار میں شاید محسوس ہی نہیں کیا گیا۔ تو اس سلسلے میں آپ سب حضرات اور خواتین جانتے ہیں کہ لوگ چاند تک پہنچ رہے ہیں اور ہمارے ملک میں لٹریچر کی باتیں ہو رہی ہیں اور شاعری سے پیٹ بھرا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں زیادہ ضرورت اس وقت سائنس کے موضوع کی تھی اور سائنس کے موضوع کو یہاں فراموش کر دیا گیا ہے۔

دوسری بات جو میں نے گروہی بحث کے دوران بھی کی ہے کہ نصابی کتاب پہ تو آپ جتنا بھی زور دیں، آئیڈیالوجی کے مطابق بنانے کے لیے۔ آخر ان کے پڑھانے والے جو ٹیچر ہیں، ان کے متعلق جب تک آپ نہیں سوچیں گے وُہ چیزیں بیکار ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے تجویز پیش کی تھی کہ کلکتہ مدرسہ جو مسلمانوں کو تعلیم دینے کے لئے

۱۷۸۰ء میں قائم کیا گیا، لارڈ ہیسٹنگز کے زمانے میں اور پھر اسی کے طرز پر اس کے ۱۱ سال بعد ۱۷۹۱ء میں ہندو بنارس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی۔ تو اس طرز کے مدرسے یہاں پاکستان میں میں سمجھتا ہوں، قائم ہونے چاہئیں کیونکہ مشرقی پاکستان میں اور سندھ میں ہندوؤں کی کافی تعداد موجود ہے اور آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ ۷۵ سے ۸۰ فیصد پرائمری ٹیچر ہندو ہیں۔ آپ کیسے ان ہندوؤں کے ذریعے سے اپنی آئیڈیالوجی سکولوں میں رائج کرا سکتے ہیں جب کہ پرائمری سکولوں کی حالت یہ ہے کہ وہاں سنگل ٹیچر ہوتے ہیں اور آپ نے بچوں کی پرائمری سٹیج پہ تشکیل کردار پہ بہت زیادہ زور دینا ہے، اس کے لئے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان ٹیچروں کی ضرورت ہوگی اور وُہ اس صورت میں ممکن ہے کہ آپ کلکتہ مدرسہ کی طرز پر مدرسے قائم کریں۔ یہ سپیشل مدرسے ہوں، ان میں، اپنے رسم و رواج، اپنے طریقے سے تعلیم دلائی جائے مسلمانوں کے مدرسوں میں کم از کم مسلمان ٹیچر ہونے چاہئیں۔

یہ میری دو تجاویز تھیں ایک سائنسی مضامین کے متعلق اور دُوسری اساتذہ سے متعلق۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

حافظ نذر احمد

صاحبِ صدر، خواتین و حضرات! میں گروپ دینیات کی نمائندگی کر رہا ہوں اور جو عرض کروں گا یہ میری رائے نہیں ہے، پورے گروپ کی متفقہ رائے ہے۔ ہمارا گروپ ٹیکسٹ بک بورڈ کا شکر گزار ہے کہ اس نے نظریۂ پاکستان پر سیمینار منعقد کر کے ہمیں بھُولا ہوا سبق تازہ کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ اس سیمینار کے بارے

میں چند گزارشات ہیں۔ گلہ بے جا یا بجا نہیں، محض تجزیہ کی حد تک۔ میرے شرکا نے یہ محسوس کیا کہ اس سیمینار میں گروہی مباحث کو بہت کم وقت دیا گیا ہے اور دوسری کمی اب محسوس کی وُہ یہ ہے کہ گروہی مباحث شروع سے ہی مضامین کے اعتبار سے ہوتے تو غالباً بہتر اور مفید تجاویز ہمارے سامنے آ سکتیں۔ اس کے علاوہ ہمارے گروپ کی یہ رائے بھی تھی کہ اگر یہ سیمینار شہر میں یا شہر کے قریب تر ہوتا تو شرکا بآسانی اور بڑی تعداد میں شریک ہو سکتے تھے۔ باہر سے آنے والے حضرات ہمارے گروپ میں شامل تھے۔ انہوں نے بالخصوص اپنی مہمان نوازی کے لئے ٹیکسٹ بک بورڈ کا شکریہ ادا کیا لیکن اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ اگر ان کے قیام کا انتظام کہیں قریب تر ہوتا تو بہتر ہوتا کہ وقت بچ جاتا۔ وُہ فالتو وقت میں باہم مل کر افہام و تفہیم اور سوچنے سمجھنے میں ممد و معاون ہوتے۔ ایک بات کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی کہ ہر مقالے کے بعد اگر سوال جواب کی گنجائش رکھی جاتی تو اس مضمون پر بہتر طور پر غور و خوض ہو سکتا۔ اس بات کا اگر آئندہ خیال رکھا جائے تو مَیں سمجھتا ہوں کہ بہتر ہوگا۔

اس سیمینار کے بارے میں یہ توقع ظاہر کی گئی، ہمارے گروپ کی طرف سے کہ ٹیکسٹ بک بورڈ ان مباحث اور تجاویز کو مرتب کر کے نہ صرف شرکا میں بلکہ اساتذہ اور ماہرینِ تعلیم میں بھیجے گا تاکہ وُہ ان پر غور و خوض کر سکیں اور ہم بجا طور پر یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ جس بورڈ نے اس قدر اہتمام کیا ہے، وہ ان پر غور و خوض کرے گا اور ان تجاویز کو زیرِ عمل بھی لایا جائے گا تاکہ گفتگو محض گفتگو کی حد تک نہ رہے۔

ایک اور امر کی طرف بھی میرے گروہ نے ٹیکسٹ بک بورڈ کو متوجہ کرنا چاہا ہے وُہ یہ ہے کہ سیمینار میں اگر اکابرِ ملت کو، مشاہیرِ ملت کو اور قدیم اساتذہ کو،

جن کے دو چار نمائندے اس وقت بھی موجود ہیں اور علمائے کرام کو دعوتِ فکر دی جاتی تو یقیناً ہم ان کے افکارِ عالیہ سے بہتر طور پر مستفید ہو سکتے۔ شکریہ

پروفیسر وارث میر

جناب چیئرمین اور معزز حاضرین! مَیں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پرسوں بھی غالباً مَیں نے اس سلسلے میں گزارش کی تھی اور محترم بزرگ حافظ نذر احمد نے بھی کہ گروہی بحثوں کے سلسلے میں جو نتائج سامنے آئے ہیں، ظاہر ہے کہ ٹیکسٹ بک بورڈ متعلقہ اتھارٹیز کے ساتھ مل کر بعض نصابی کتب میں ان سفارشات کو شامل کرنے کی کوشش کرے گا۔ مَیں پھر ایک ٹیکنیکل خامی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں اور وُہ یہ ہے کہ گروہی بحثوں کی رپورٹ جو مرتب ہوتی ہے، اس پر غور کرتے وقت ایک بات ذہن میں ضرور رکھیے کہ بعض بڑی اہم باتیں رہ جاتی ہیں اور وُہ غالباً اس لئے رہ جاتی ہیں کہ رپورٹ مرتب کرنے والا خود بھی ذہنی طور پر بحث میں بہت اُلجھا ہوا ہوتا ہے۔ وُہ خود بھی بحث میں شامل ہوتا ہے۔ بعض اوقات لمبی بحث کی بجائے کوئی صاحب ایک ایسا فقرہ کہتے ہیں جو بڑا پُرمغز ہوتا ہے۔ لیکن وہ محض گفتگو میں نکل جاتا ہے۔ مَیں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر رپورٹر بحث سے بالکل غیر متعلق ہوتا یا اس کی جگہ آپ ٹیپ ریکارڈر رکھ دیتے کیونکہ یہ بہتر طریقہ ہے عہدِ حاضر میں کہ ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ ساری بحث کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد اطمینان کے ساتھ دو تین آدمی اس کی رُوح کو کھینچتے ہیں تاکہ کوئی ضروری بات نہ رہ جائے۔ یہ بات میں ایسے ہی عرض نہیں کر رہا مثلاً آج کی معاشرتی علوم کی بحث

میں دو بڑی اہم باتیں ہوئیں۔ ایک بڑی اہم بات غالباً پروفیسر محمد اسلم صاحب یا ڈاکٹر منیرالدین چغتائی صاحب نے کہی تھی کہ ایسی کمیٹی تشکیل دی جانی چاہیئے، جو معاشرتی علوم کی زبان اور اس میں بعض استعمال ہونے والی اصطلاحات اور "الفاظ" کو خاص اسلامی رنگ دے اور قائم کرے اس طرح کی اصطلاحات۔ میرے خیال میں یہ بہت ہی بنیادی بات ہے کیونکہ "الفاظ" اور "اصطلاحات" بچے کے ذہن میں ان الفاظ کے تصورات نقش کرتے ہیں اور یہ تجویز تشنہ رہ گئی۔

ایک تجویز خاکسار کی تھی وہ یہ تھی کہ اپنے محاذ پہ جنگ لڑنے کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے کہ آپ اپنے دشمن کے ذہن کو بھی پہچانیں اور وہ تجویز یہ ہے کہ نئی نسل کا بچہ یا نئی نسل کا نوجوان جو ایم۔ اے تک پڑھتا ہے، اس کو بالکل ہندو ذہن کا علم نہیں ہے اور وہ تلخ تجربات جو پرانی نسل نے حاصل کئے تھے جن کی بنا پر آپ نے پاکستان بنایا، ان کو آپ نے تحریری طور پہ یا زبانی طور پہ کسی طرح پہ ہم تک منتقل نہیں کیا ہے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں "ہندو ذہن کی تفہیم" یہ فقرہ میں نے وہاں بھی کہا تھا "ہندو ذہن کی تفہیم" تحریک پاکستان کا نقطہ آغاز ہے اور آپ کا بچہ، ان باتوں کو بالکل نہیں جانتا تو آپ تحریک پاکستان یا معاشرتی علوم میں نظریۂ پاکستان کو پیش کرتے وقت کوئی ایسا حصہ بھی رکھیں، جس میں ہندو اور برہمنی فلسفۂ سیاست یا فلسفۂ تاریخ کا تجزیاتی مطالعہ ہو سکے۔

پروفیسر محمد الیاس: (ادارۂ تعلیم و تحقیق)

صاحب صدر و معزز سامعین!

مجھے محمد الیاس کہتے ہیں اور میں ادارۂ تعلیم و تحقیق میں، جو ایک "ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ" ہے، وہاں سائنس ٹیچر جو ہیں ایم۔ ایڈ لیول پر، ان کی ٹریننگ کے سلسلے میں مامور کیا گیا ہوں۔ میرا کام یہ ہے کہ سائنس ٹیچرز کی ٹریننگ اچھے طور پہ ہو۔ یہ میری ذمے داریوں میں سے ایک ہے۔ آج کل اتفاق سے یہاں حکومت پنجاب نے کمیٹیاں سی بنائی ہوئی ہیں، جس میں سائنس اور تاریخ کے بیشمار موضوعات پر سب کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ سائنس کی کمیٹی کا جو کام ہے، وہ میرے سپرد ہے۔ میں اس کمیٹی کا کنوینر ہوں۔ اسی لئے چند سوالات ہیں، جو میرے ذہن اور جو میرے ساتھیوں کے ذہنوں میں ہیں۔ جن کے جوابات لینے کے لئے بھی ہم یہاں آئے ہیں۔ کیونکہ خاص موقع پہ سیمینار کروایا گیا۔ اس کے متعلق میرے جو اہم سوالات ہیں، وہ یہ ہیں۔

تین سوالات ہمارے ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ ایک سوال یہ تھا کہ "نظریہ پاکستان" کیا ہے، اس کے متعلق اچھی خاصی بحث ہو چکی ہے اور اس کے متعلق کچھ رپورٹیں بھی مرتب ہو جائیں گی۔ پتہ چل جائے گا۔ دوسرا سوال جو ہمارے ذہنوں میں آتا ہے، یہ ہے کہ اسے کیوں نصاب میں سمویا جائے اس کے جوابات بھی ہمیں مل چکے ہیں۔ اچھی خاصی بحثیں ہو چکی ہیں۔ گروپی رپورٹوں نے بھی اس کے متعلق کچھ ذکر کیا ہے۔ تیسرا سوال جو ہمارے ذہنوں میں ابھرتا ہے، جو زیادہ مشکل ہے وہ یہ ہے "نظریۂ پاکستان"

کو نصاب میں کیسے سمویا جائے؟ اور اس میں خاص طور پر جو ہم کام کر رہے ہیں وہ یہ ہے۔ ایک صاحب تشریف لائے نام انہوں نے نہیں بتایا۔ انہوں نے کہا کہ سائنس کے متعلق کچھ نہیں ہوا۔ میرا بھی اس کے متعلق POINT میرا سوال بن جائے گا کہ نظریہ پاکستان کو سائنسی نصاب میں کس طرح سمویا جائے؟ یہ ایک سوال ہے جو ہمارے ذہنوں میں اُبھرتا ہے اور جس کے لئے غالباً سائنس کی کمیٹی بڑی بے چین ہے کہ اس کے متعلق کوئی تجاویز آئیں۔ ہمیں بتایا جائے کہ اصل میں اس کو کس طرح سائنس کے نصاب میں سمویا جائے۔ آئیڈیالوجی کی تعریف ہو گئی ہے۔ اس کے بعد کیوں کیا جائے یہ بھی ہو گیا ہے۔ اصل میں عملی کام جو ہمیں کرنا ہے جو دقتیں ہمیں پیش ہیں وہ یہ ہیں کہ ان کو کیسے کیا جائے۔ میری گزارش جو ہے وہ یہ ہے کہ جب کمیٹی کی رپورٹیں مرتب ہوں۔ جو ماہرین کی ٹیم بیٹھے، وہ ان سوالوں کے جوابات کے علاوہ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرے کہ نظریۂ پاکستان کو سائنسی نصاب میں کس طرح سمویا جائے؟ اور اس کی خاص طور پر مثالیں جو ہیں کیمسٹری میں، فزکس میں اور بیالوجی میں ایک ایک مثال کم از کم ہونی چاہیئے تاکہ اس سے ہم ACTUAL کام کر سکیں۔ اصل مقصد تبھی حل ہو سکتا ہے کہ ہمیں بتایا جائے کہ یہ طریقہ ہے آجکل ہم اس کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس میں میری ایک گزارش ہے تمام سامعین سے کہ اس سے متعلق آپ کی کوئی تجاویز ہوں تو وہ بلا جھجک "ادارہ تعلیم و تحقیق سائنس ایجوکیشن سنٹر، پنجاب یونیورسٹی لاہور" کو بھیج دیں ہم آپ کے بیحد ممنون ہوں گے۔ اس سلسلے میں پریکٹیکل تجاویز ہوں کہ اس کو کیسے کریں۔ ہم آج کل اس سے دوچار ہو رہے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں یہ کام آسان نہیں ہے۔ چونکہ سب معزز سامعین اچھے خاصے پڑھے

لکھے لوگ ہیں۔ تو اغلب یہ ہے کہ یہاں سے جو تجاویز آئیں گی ان سے ہمیں کافی فائدہ ہوگا۔

پروفیسر عبدالرؤف انجم (گورنمنٹ کالج)

صاحبِ صدر اور معزز حاضرینِ جلسہ! گروپ الف کی طرف سے میں حاضر ہوا ہوں۔ میرا نام "عبدالرؤف انجم" ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ انگریزی میں اُستادِ ادبیاتِ انگریزی ہوں۔ اس سیمینار کے متعلق کچھ باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ پہلی تو بات یہ ہے شرکاء کے متعلق۔ بورڈ کا طریق کار یہ رہا ہے کہ انہوں نے کالجوں سے نمائندے مانگے ہیں اور کالجوں نے اپنے ٹائم ٹیبل کی ضرورت کے مطابق جن کو مناسب سمجھا بھیجا۔ تو شرکاء ہیں اگرچہ بہت سے نمائندے ہیں لیکن کلی طور پر ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ تمام صاحب یہاں موجود ہیں جنہیں یہاں ہونا چاہیے یا جنہیں یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا، وہ موجود نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں بورڈ کے یہاں اور ہر جگہ کہوں گا کہ اساتذہ کو پہچانا جائے، ان کا مقام جو ہے متعین کیا جائے۔ افسوس کی بات ہے جب اس ملک میں پنجاب کے صوبہ میں پرائمری ٹیچرز ایسوسی ایشن، سیکنڈری سکول ٹیچرز ایسوسی ایشن، لیکچررز ایسوسی ایشن اور پروفیسرز ایسوسی ایشن موجود ہیں۔ تو یہ اچھی بات ہوتی، اگر ان کو براہِ راست دعوت نامے بھیج دیے جاتے۔ اس سے ان کو احساس ہوتا کہ وہ بھی اس تدریسی اور تعلیمی عمل میں خود شامل ہوں۔ اراکین کو جو کچھ تھوڑی بہت تکالیف ہوئی ہیں ہم ان کا شکوہ نہیں کرنا چاہیئے۔ بہت اچھا بندوبست تھا لیکن اس بات کا بورڈ کے حکام کو بھی احساس ہے کہ بعض اوقات سیشن کافی طویل ہو گئے۔ آمد و رفت کی کچھ سہولتیں پوری طرح میسر نہیں ہوئیں۔ بیشک اخراجات جو ہیں ان کی تو فوراً ادائیگی کر دی گئی لیکن

یہاں سے ٹرانسپورٹ کا انتظام بعض وقت دشواری کا باعث ہوا۔ اب میں ذرا اس پروگرام کی ترتیب و تدوین کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ہمیں جو پروگرام ملا، وقت بہت کم تھا، ہم سوچ ہی نہیں سکے اور ایک اہم چیز ترتیب و تدوین میں جو ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ سیشن میں چند مشاہیر کو بلایا گیا۔ انہوں نے اپنے مقالات پڑھے بعد ازاں گروہی بحثوں کے لئے لوگوں کو اکٹھا کیا گیا اور اس INDOCTRINATION کی وجہ سے جو ان مقالوں میں تھی، وہی سوالات فوراً آدھے گھنٹے کے بعد پیش کر دیے گئے ان سوالات کا علم اراکین کو پہلے نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ACADEMICALLY غلط ہے کہ آپ ایک درس دیں اور اس کے فوراً بعد اسی درس پر سوال پوچھنا شروع کر دیں۔ سوالنامے کا جواب دینا، میں سمجھتا ہوں اس میں وہ OBJECTIVELY نہیں آئی جو آنی چاہیئے تھی۔ یہ ایک ACADEMIC POINT OF VIEW ہے۔ آپ شاید اس سے راضی ہوں یا نہ ہوں لیکن بحیثیت ایک استاد کے میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریق کار غلط ہے اور آئندہ جو اس قسم کا سیمینار ہو گا اس میں کوئی وقفہ دیا جائے گا کہ CRISTILIZATION ہو سکے کچھ تحقیق اور اپنے نظریے جو ہیں وہ ابھر سکیں۔ نہ یہ کہ اسی طوفان کی ریل پیل میں اپنے جو خیالات ہیں وہ بھی بہہ جائیں۔ اب اس سلسلے میں بہت زیادہ اعتراضات تو کئے جا سکتے ہیں۔ اور ان میں سے ایک دو کی نشاندہی میں نے کی ہے لیکن اس کے باوجود، ان تمام چیزوں کے باوجود، تھوڑی تھوڑی سی جو تکالیف اراکین کو ہوئی ہیں، جو ADVANCE NOTICE نہیں دیا گیا۔ ان تمام چیزوں کے باوجود میں پھر بھی یہ سمجھتا ہوں اور میرا یہ اخلاقی فرض ہے اور اپنے گروپ کی طرف سے یہ فرض ہے کہ میں بورڈ کے اراکین کو اور ان تمام حکام کو صدق دل سے ہدیہ تبریک

پیش کروں کہ انہوں نے ایک نہایت اہم کام کیا ہے، جو وقت کی ضرورت کے مطابق تھا اور ہمیں امید ہے کہ اس سلسلے میں جو انہوں نے پہلا قدم اٹھایا ہے، ملک کے دوسرے تعلیمی ادارے، یونیورسٹیاں، دوسرے بورڈ، ڈائریکٹوریٹ اور سیکرٹریٹ اس چیز کو ایک مشعل راہ بنائیں گے۔ اور یہ سمجھیں گے کہ بورڈ نے یہ ایک بہت بروقت جائز قدم اٹھایا۔

صاحب صدر! ہم آپ کے اور بورڈ کے بہت مشکور ہیں کہ آپ نے اتنے تھوڑے عرصے میں اتنا اہم کام سرانجام دیا ہے اور اس سلسلہ میں جو بھی ہم شکریہ ادا کریں وہ کم ہو گا۔

شکریہ

ڈاکٹر محمد اسلم قریشی (پولیٹیکل سائنس پنجاب یونیورسٹی)

میرا نام ڈاکٹر محمد اسلم قریشی ہے۔ میں پنجاب یونیورسٹی پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھتا ہوں۔ وقت پانچ منٹ سے بھی کم لوں گا۔ صرف ایک دو گزارشات صاحب صدر کی اجازت سے کرنا چاہتا ہوں۔ اول یہ کہ اس سیمینار میں میں نے تقریباً خاصی حاضری دی۔ تینوں دنوں میں اور ساری نشستوں میں سنتا رہا جو چیز میں نے ایک خامی کے طور پر محسوس کی وہ یہ ہے کہ ہمیں یہ پتہ نہ چل سکا کہ ہندوستان نظریہ پاکستان پر کہاں کہاں ضربیں لگاتا ہے؟۔ یہ بات میں نے محسوس کی اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ کئی ایک ضربیں وہ نظریہ پاکستان پر لگتی ہیں اور وہ جو ضربیں لگائی گئی ہیں ان کا اثر زہر کی صورت میں مختلف ممالک تک پہنچایا گیا ہے اور جب کبھی ہمارے طلباء اس پاکستان کی سرحد کو چھوڑ کر غیر ممالک تک جاتے ہیں تو ان کا زہر ان کے سامنے ہوتا ہے۔

اور وہ اس زہر کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ پا کر بعض دفعہ ہندوؤں کے اس زہر میں خود بھی گھل جاتے ہیں اور میں نے کئی پاکستانی طلبا کو دیکھا کہ وہی نقطۂ نظر اختیار کر لیتے ہیں جو ہندو نے بڑے مضبوط طریقے سے پاکستان سے باہر قائم کیا ہوا ہے تو یہ صورت اس طرح سے زائل ہو سکتی ہے کہ ہم جب پاکستان کے نظریے کو بیان کریں تو ہمارے سامنے مثلاً یہ باتیں ہوں کہ ہندو کہتا ہے کہ DIVIDE AND RULE پاکستان کے بننے کی ایک وجہ ہے اور ہم اس کا جواب پیش کریں اور ان کے سامنے ایک مربوط قسم کا ARGUMENT دیں کہ یہ وجہ غلط ہے۔ دوسری صورت جو عام طور پہ بیرونی ممالک میں پیش کی گئی وہ یہ ہے کہ اصل جنگ تو ہندوستانیوں نے ہندوستان کے لیے لڑی ہے۔ پاکستان تو محض ایک "جھونگے" کی حیثیت سے مل گیا ہے، تو اس کا میں سمجھتا ہوں، ایک جواب یہ ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی جنگ یا نظریۂ پاکستان کی جنگ کا ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندوؤں نے جو جنگ لڑی اس سے کہیں پہلے اس کا آغاز ہو چکا تھا۔ تیسری صورت جو میرے سامنے آئی اور میں نے عموماً محسوس کیا کہ ہندوؤں نے اور ہندو طلبا نے غیر ممالک کے طلبا تک پہنچائی وہ یہ تھی کہ پاکستان اصل میں کوئی ایسا نظریہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسا فرد ہے جو دوسرے لوگوں کی نسبت کم ہمت اور کم فہم ہے۔ اس لیے مقابلے سے بچنے کی خاطر انہوں نے ایک نیا ملک ڈھونڈ لیا ہے، جسے وہ پاکستان کہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ میں نے چند ایک باتوں کی نشاندہی کی ہے، میں سبھی باتوں کی طرف اشارہ نہیں کر سکتا۔ ایک تو یہ ہے کہ وقت بھی کم ہے اور میں صرف اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان باتوں کی طرف توجہ کی جائے۔ اور جہاں ہم اپنے بارے میں اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ نظریۂ پاکستان یہ ہے۔ ہم ان باتوں

کی طرف بھی توجہ دیں کہ ہمارے مخالفین کیا کہتے ہیں اور ان کا توڑ ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔ میں اصل میں یہی ایک گزارش کرنا چاہتا تھا۔ صاحبِ صدر! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پروفیسر علی عباس

میرا نام علی عباس ہے۔ میں شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی سے متعلق ہوں۔ باتیں تو مجھے بہت کچھ کرنی تھیں۔ وقت بہت کم ہے اور مجھے ایک اور صاحب کو بھی وقت دینا ہے۔ میں صرف ایک چیز کی طرف اشارہ کروں گا جس کے متعلق یہاں کہا گیا تھا اور دوسری باتوں کو میں ترک کرتا ہوں۔ سوال تھا سائنس اور نظریۂ پاکستان کے متعلق۔ اس ضمن میں جو ایک بات پیش کرنی ہے وہ یہ ہے کہ "سائنس اور اسلام" "سائنس اور نظریۂ پاکستان" ان میں کوئی زیادہ تضاد نہیں ہے۔ اور اسلام اور سائنس کے متعلق چند ایک چیزیں ہمارے پاس موجود ہیں۔ جنہیں یہ افسوس ہے کہ ابھی تک پیش نہیں کیا گیا۔ شاید یہاں اردو کی نصابی کتابوں میں یا معاشرتی علوم کی نصابی کتابوں میں ایک ایسے مسلمان سائنسدان کا نام ملتا ہے جس کا نام "جابر ابن حیان" تھا۔ وہ امام جعفر صادق کے شاگرد تھے۔ لیکن یہ بھی آپ حضرات کے علم میں ہے کہ ان کی جو علم ہیئت اور علم کیمیا کی لیبارٹری تھی، وہ بہت ہی اعلیٰ معیار کی تھی اور ان کی کوئی چوبیس یا پچیس کتابیں ایسی ہیں جن کا مغربی علوم میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اور ان میں سے تیرہ یا چودہ کتابیں ایسی ہیں جو اس وقت جامعہ پنجاب ہی کے ایک معلم۔ کیمیکل ٹیکنالوجی خواجہ صلاح الدین کے پاس یہ تمام کتابیں موجود ہیں اور یہ "گیبر" کے نام سے ہیں۔ میرا خیال ہے اگر تحقیقات کی جائے تو اس قسم کے اور بھی مسلمان سائنسدان ایسے مل سکتے ہیں جنہوں نے اسلام اور

سائنس کے موضوع کو پیش کیا ہے۔ اور اگر ہم انہیں اپنی سائنسی تاریخ کو ایک اچھے انداز میں پیش کریں تو اس سے یہ ضرور ظاہر ہو گا کہ ہمارے مسلمانوں میں بھی ایسے سائنسی مفکر موجود تھے، جنہوں نے مغرب کو فکر دیا ہے اور نہ صرف انہیں فکر دیا بلکہ اُن کے ارتقا کا سبب بھی اگر کوئی ہے تو وہی ہیں۔ یہ صرف سائنس ہی میں نہیں بلکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ الجبرا کا علم بھی مسلمانوں کی پیداوار ہے اور اس طرح سے بیشمار علوم جن پر سائنس کا دارومدار ہے وُہ مسلمانوں نے دیئے ہیں۔ اب یہ ہمارے سائنس دانوں کا کام ہے کہ وہ اس میں اپنے فکر سے اور اپنی مزید تحقیق سے کچھ ایسی چیزیں پیش کریں کہ وُہ آئیڈیالوجی آف پاکستان، جو ابھی تک معاشرتی علوم اور دینیات میں ڈھونڈتے رہے ہیں' وُہ سائنسی میدانوں میں بھی ڈھونڈ سکیں۔

شکریہ۔

پروفیسر صابر لودھی

صاحب صدر، خواتین و حضرات! میرا نام صابر لودھی ہے۔ مَیں گورنمنٹ کالج لاہور میں اردو پڑھاتا ہوں۔ مَیں بڑی مختصر بات عرض کرنے کے لئے حاضر ہوا تھا کہ جب ہم نظریۂ پاکستان کی بات کرتے ہیں تو دو باتیں ہمارے ذہن میں آتی ہیں۔ ایک دین اور دوسرا قومی زبان۔ دین کے بارے میں تفصیلاً بحث ہو چکی ہے۔ میں اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کرنا چاہتا لیکن زبان کے سلسلے میں ہم نظریئے کی بات کب تک کرتے رہیں گے؟ ہمارا اوّلین فرض یہ ہے کہ فوری طور پر قومی زبان کو نافذ کیا جائے۔ اس کی بہترین صُورت میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو کارروائی شروع ہو، اس کا افتتاحی اجلاس، جو خطبہ وہاں پڑھا جائے اور جس صُورت میں پڑھا جائے وُہ اُردو زبان میں ہو۔ بہت سے احباب نے شکایت کی

ہے کہ پرسوں کے افتتاحی اجلاس میں دو خطبے انگریزی زبان میں پڑھے گئے۔ اگرچہ ترجمہ ان کا اردو میں ہو چکا تھا لیکن لوگوں نے اُردو کو بڑے شوق سے پڑھا اور انگریزی کو اس شوق سے نہیں پڑھا۔ مجھے یہی عرض کرنا ہے کہ ہم اس نظریئے کے اس حصّے کا فوری طور پر اطلاق شروع کر دیں۔

شکریہ!

خطبۂ اختتامیہ

میر نسیم محمود

معزز خواتین و حضرات!

ان گزشتہ تین دنوں میں اس قدر اہم باتیں ہوئی ہیں کہ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ہضم کرنے میں، جیسے کسی دوست نے کہا، مہینوں درکار ہوں گے، جو باتیں مجھ پر ذاتی طور پر تاثر چھوڑ گئیں، ان کو میں اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ گورنر صاحب نے جب یہ فرمایا کہ اگر نظریۂ پاکستان نہ رہا تو ہم نیست و نابود ہو جائیں گے۔ تو اس نے میرے دل پر گہرا اثر چھوڑا۔ اسی طرح ان کا یہ کہنا کہ نعرہ بازی دانشورانہ فکر و عمل کی جگہ نہیں لے سکتی، ہم سب کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔ ہم ٹیکسٹ بک بورڈ میں یہ کہتے رہے ہیں کہ کتاب بہت اہم ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس خاکساری کی بھی ضرورت ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ کتاب کا اور ٹیکسٹ بک بورڈ کا قوم کی زندگی میں کیا مقام ہے؟ ورنہ ہم اپنے ذمے وہ بات لے لیں گے، جس سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایسی تنقید اور بجا تنقید کے ہدف نہیں گے کہ آپ نے تو کہا تھا کہ نصابی کتاب بدل جائے گی تو قوم کی زندگی بدل جائے گی۔ کتاب بدل گئی انقلاب رونما نہیں ہوا۔ اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے اور باقی حضرات نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ کتاب ایک نہایت اہم ذریعہ ہے تعلیم کا، مگر اس جیسے یا شاید اس سے بھی زیادہ اور اہم ذریعے قوم

کے کردار بنانے کے ہیں۔ اس کے باوصف میں سمجھتا ہوں کہ گورنر صاحب نے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف ہماری توجہ دلائی کہ جس قسم کی کتابیں ہم اپنی آنے والی نسلوں کو دیں گے اسی قسم کی ہماری آنے والی نسلیں ہوں گی۔ میں ان کی صرف ایک بات اور بیان کروں گا۔ انہوں نے یہ فرمایا کہ ذہنی غلامی بدترین قسم کی غلامی ہے اور ہم جو آزاد ہیں، ہمیں آزادانہ سوچ کرنی چاہیئے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے بتایا کہ پاکستان اس لئے معرض وجود میں آیا کہ ہمیں اپنی قومی شخصیت کا تحفظ مقصود تھا اور مسلمان قوم کی، مسلمان ملت کی ہمیشہ سے یہ آرزو رہی ہے کہ وہ اپنی علیحدہ قومی شخصیت کو قائم رکھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے پُر مغز مقالے میں جو بات نئی انہوں نے اور فرمائی ہے وہ یہ تھی اگر ہمارا نظریہ قائم نہ رہا خدا نخواستہ اور میں سمجھتا ہوں انشاء اللہ تا ابد یہ قائم رہے گا تو ہم چاہے کچھ بھی ہوں، مگر موجودہ صورت میں برقرار نہیں رہیں گے۔ کسی اور نظام کے صوبے بن جائیں گے، عملداریاں بن جائیں گے، ہماری آزادی مفقود ہو جائے گی، نیست و نابود ہو جائے گی۔ اس لئے جو اصحاب بڑی بے تکلفی سے دوسرے نظریوں کی بات کرتے ہیں ان کو یہ بھی دھیان میں رکھنا چاہیئے کہ اگر خدا نخواستہ نظریے کو کوئی ضعف پہنچا، تو ہماری کیا حالت ہو گی؟ اس سلسلے میں صرف ان اصحاب سے ہی میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا خطاب نہیں تھا، جو نظریۂ پاکستان کے علاوہ کسی اور ازم پر یقین رکھتے ہیں بلکہ اگر خود ہم نے نظریۂ پاکستان کے خالی خولی دعوے کر کے عملی طور پر اس کو اس طریقے سے پیش کیا کہ یہ دوسروں کے مقابلے میں گھٹیا نظریہ معلوم ہوا تو آپ اور ہم چاہے کچھ بھی کہتے رہیں، عوام الناس ہمارا ساتھ نہیں دیں گے۔

ڈاکٹر انور اقبال قریشی نے سرمایہ داری، سوشلزم، کمیونزم اور اسلام میں جو فرق کیا

ہے، میں سمجھتا ہوں، وہ ہمارے لئے مشعلِ راہ بن سکتا ہے۔ اسلام کے متعلق انہوں نے فرمایا کہ اس میں ارتکازِ دولت کی ممانعت ہے، رزقِ حلال پر زور دیا گیا ہے، رفاہی مملکت کا قیام اس کا مقصود ہے اور ربا کی ممانعت ہے۔ مولانا جعفر شاہ پھلواروی نے اسلامی مساوات کے معاشی پہلو پر علامہ اقبالؒ کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی اور غریبوں کی معاشی بہتری کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔

اسی طرح جسٹس ایس اے رحمٰن صاحب نے میں سمجھتا ہوں، ہماری توجہ ایک نہایت اہم امر کی طرف دلائی کہ جہاں جہاں بنیادی اتفاقات ہو جائیں، اُن کو زیادہ اُجاگر کیا جائے اور جہاں اختلافات ہوں، یہ ضروری نہیں ان کو پسِ پشت ڈال دیا جائے مگر اس کے متعلق ہمارے لیڈروں کی، ہمارے قانون دانوں کی، ہمارے علما کو اور زیادہ گہری سوچ کی ضرورت ہے۔ حمید احمد خاں صاحب نے ہمیں یہ بتایا کہ نظریۂ پاکستان کی دو شکلیں ہیں یا اس کے اظہار کی دو صورتیں ہیں، ایک مقامی اور ایک آفاقی۔ انہوں نے اس طرح بتایا کہ کیوں بعض وقت لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان شاید CONTRADICTION میں مبتلا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ پاکستان کو جس طرح سے حاصل کیا گیا اور جس لئے قائم رکھنا چاہیے، وہ دو اغراض ہیں۔ ایک تو یہ کہ پاکستان بذاتِ خود ایک بڑی مضبوط مملکت ہو اور دوسرے یہ کہ اپنے نمونے سے باقی اپنے اسلامی بھائیوں کو بھی ساتھ اس سطح پر لائے کہ تمام دنیا میں وہ باقی نوعِ انسانی کے لئے مشعلِ راہ بن سکیں۔ قاسم رضوی صاحب نے یہ نشاندہی کی کہ مفتوح ذہنیت مشرقی پاکستان میں اور مغربی پاکستان میں کیا کیا گل کھلاتی رہی ہے۔ ان کے بعض حقائق تلخ بھی ہوں مگر میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم غور کریں گے، تو ہمیں پتہ چل جائے گا کہ بعض باتیں، بعض کمزوریاں جن کی انہوں نے نشاندہی کی ہے، وہ ہم میں موجود ہیں۔ ایک

اور بہت اہم بات جو انہوں نے فرمائی یہ تھی کہ ہم سب میں اور جیسا کہ شاید آپ حضرات نے محسوس کیا ہوگا، ٹیکسٹ بک بورڈ بھی اس سے مستثنیٰ اور مبرا نہیں ہے، ہم سب میں کوشش رہتی ہے اپنے دفاع میں اپنی تمام غلطیاں دوسروں کے سر تھوپنے کی۔ ہم قربانی کے بکرے ڈھونڈتے ہیں۔ کل میرے ایک دوست نے فرمایا کہ ہم حکومت نہیں ہیں۔ اس لئے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ انسان کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے اردگرد ایک خول لپیٹ لیتا ہے اور یہ محسوس نہیں کرتا اکثر و بیشتر کہ میں ان حالات میں جن میں میں ہوں، ان میں کیا کردار ادا کر سکتا ہوں۔ جسٹس حمود الرحمٰن صاحب نے بہت سی کام کی باتیں کہیں، جس میں یہ بھی انہوں نے بتایا کہ ہمارے ہاں اور مشرقی پاکستان میں کلچر کے لحاظ سے اور عقائد کے لحاظ سے کیا کیا قدریں مشترک ہیں۔ انہوں نے توجہ دلائی کہ ان مشترکہ اثرات کو، ان مشترکہ اقدار کو، ان مشترک خیالات کو اور ان مشترک عقائد کو اُجاگر کرنا چاہیے اور اختلافات تو قوموں میں ہوتے ہیں، قبیلوں میں ہوتے ہیں حتیٰ کہ خاندانوں میں ہوتے ہیں، دو بھائیوں میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب نے ہمیں اسلام کا مقام دوسرے مذاہب کے ساتھ تقابل کی روشنی میں متعین کرنے میں مدد دی۔ انہوں نے بتایا کہ یہی ایک مذہب ہے، جو عالمی، آخری اور جامع ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے اور اگر ہم اس کے پیروکار ہوں تو یہ دعوے حقیقت کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ موجودہ نصابی کتابوں میں ایک بڑی حد تک وہ اقدار موجود ہیں، جن کو ہم پاکستان کے نظریے کے ساتھ متعلق کرتے ہیں یا جو پاکستان کے نظریے کے اہم جزو ہیں۔ میں ان کی مشکلات کو سمجھتا ہوں کیونکہ میں بھی اسی ناؤ میں سوار ہوں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ کو دو قسم کی تنقیدیں موصول ہوئی ہیں، ایک

تو یہ کہ ابھی تک آپ کی کتابیں نظریۂ پاکستان کے مطابق نہیں ہیں اور وہ تنقید خلوص پر مبنی ہوتی ہے۔ ایک ہمارے دوست نے یہ بھی کہا کہ مجھے خدارا یہ بھی بتائیے کہ آپ کی اردو اور معاشرتی علوم کی نصابی کتابوں میں کیا فرق رہ گیا ہے جب اردو کی کتابوں میں تقریباً ۹۰ فی صد اسباق وہ ہیں جو اقدار کے متعلق ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ دینیات اور معاشرتی علوم پڑھا رہے ہیں زبان نہیں۔ بظاہر ان چیزوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہماری کوشش تقسیم کار کے مطابق ہونی چاہیئے کہ ایک طرف جو مضمون پڑھایا جانا مقصود ہے مثلاً اردو تو اس کتاب میں اولیت اسی مقصد کو ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں کو، طالب علموں کو پاکستانی رنگ میں رنگ بھی سکیں۔ مگر جہاں یہ توازن بگڑ گیا اور جو آپ کا اوّل مقصود تھا، اس نصابی کتاب لکھنے کا، وہ فوت ہو گیا تو مثلاً اگر آپ کو زبان نہیں آتی تو آپ لٹریچر نہیں سمجھ سکتے۔ اگر آپ کو زبان نہیں آتی تو آپ خیالات نہیں سمجھ سکتے۔ تو اگر اردو میں یہ انتظام کیا جائے کہ زبان سکھانے کو اولیت ہو اور اس کے ساتھ ساتھ باقی اقدار کو بھی غیر محسوس طور پر سکھایا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس نظریے میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ آج کی بحث میں اور گروہی بحث میں اس موضوع کے متعلق کہا گیا، اس پر ہم پوری سنجیدگی سے غور کریں گے۔ دراصل اس سیمینار کا مقصد ہی یہی تھا کہ ہم اپنی اصلاح کر سکیں اور اگر آپ کی وقیع راؤں سے ہم اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ کا وقت اور اپنا وقت یونہی صرف کیا۔ تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے جو کچھ بھی ہم آپ کی سفارشات پر عمل کرنے کے متعلق کر سکیں گے انشاء اللہ العزیز ضرور کریں گے۔

ڈاکٹر اصغر علی صاحب نے بہت سی کام کی باتیں کہیں۔ آپ نے بتایا کہ کس کس جگہ پر ہم نصابی اور اضافی کتابوں میں ترقی کر سکتے ہیں اور پاکستان کے نظریے کو کس طرح سے اور بھی زیادہ روشن کر سکتے ہیں۔ ان کی خدمت میں تقریر کے بعد میں نے عرض کیا کہ جیسے آپ نے فرمایا تھا، اضافی کتابوں میں ہم اقبال۔ رومی اور سعدی کا پیغام پہلے ہی پہنچا چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کل سے لے کر آج تک دو سیٹ بکے ہیں مگر ہماری طرف سے یہ کوشش جاری ہے کہ اضافی کتابوں کے ذریعے مشاہیر اور اسلامی اقدار کے متعلق زیادہ سے زیادہ مواد پہنچایا جائے۔ ہمیں یہ کہنے میں خاص طور پر خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اس قسم کے اور بھی مسودے آ چکے ہیں، طریق کار بھی متعین ہو چکا ہے کہ کس طریقے سے ان مسودوں کی چھان پھٹک کی جائے گی اور مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ اگلے چھ ماہ میں بہت سی کتابیں نظریۂ پاکستان کے مطابق، اسلامی اقدار کی حامل، اسلامی مشاہیر کے متعلق، اسلامی سائنس دانوں کے متعلق، اسلامی وزیروں کے متعلق، اسلامی بہادروں کے متعلق لکھی جائیں گی اور وہ منظر عام پر آ جائیں گی۔ میں ان شرکائے کار کا بھی خاص طور پر ممنون ہوں، جنہوں نے گروہی بحث میں حصہ لیا۔ اس سلسلے میں میں پروفیسر رؤف انجم صاحب کی خدمت میں یہ عرض کر دوں کہ نہ ہی یہ ہمارا مقصد تھا اور نہ ہی یہ ہوا کہ گروہی بحث چونکہ ایک تقریر کے بعد ہوئی اور اسی سے متعلق سوالات پر ہوئی۔ اس لئے وہی جوابات آئے جن کی ہم توقع کرتے تھے۔ ایک جواب جو ہمیں آیا، اس کے متعلق میں نشاندہی کر چکا ہوں۔ اسی طرح بہت سے گروہوں نے اپنی اُپج کا ثبوت دیا۔ دراصل سیمینار سے مطلب ہی یہ ہے کہ ایک خیال کو بیج کی طرح بو یا جائے۔ اس کے بعد دیکھا جائے وہ کیسے پھلتا پھولتا ہے۔ سیمینار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کچھ کوئی مقرر کہے، آپ من و عن قبول

کریں اور مجھے یہ کہنے میں بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے کہ آپ نے وہ من و عن قبول نہیں کیا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جیسے ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے کہا تھا کہ ہماری اُردو دینیات اور معاشرتی علوم کی کتابوں کا ۶۰ فی صد سے زائد نظریۂ پاکستان پر مشتمل ہے، گروہی بحثیں وہی کچھ کہتیں، جو انہوں نے کہا تھا۔

گروہی بحثوں میں جو چیز سب سے زیادہ خوش آیند تھی وہ ان کی گرماگرمی گرمجوشی اور ان کا ایک دوسرے کے خیالات کو برداشت کرنا تھا۔ پھر ان سے جو سبق ہم حاصل کرسکتے ہیں کہ ان میں سے کافی حضرات نے یہ بھی کہا کہ ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں یہ دانشوری کی بڑی اہم منزل ہے کہ ان کو یہ احساس ہوا کہ وہ اپنا محاسبہ بھی کریں۔

علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب نے کسی صاحب کے حوالے سے بتایا تھا کہ کام کرنے کی تین منزلیں ہوتی ہیں۔ ایک فکر، ایک ارادہ اور ایک عمل۔ تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں جیسے کہ گورنر صاحب نے فرمایا نعرے اور "سلوگن" عام چلتے ہیں۔ کسی شاعر نے، خدا اس کو غریق رحمت کرے یہ کہہ دیا "نشستند و گفتند و برخاستند" اب جو سیمینار ہوتا ہے جو بحث ہوتی ہے، اس کے بعد یہ شعر ضرور دہرایا جاتا ہے۔ تو میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ہمارا کام ہی یہاں یہی تھا کہ "نشستند و گفتند و برخاستند" کام اینٹ گارے کی عمارت کا تعمیر کرنا نہیں کہ ہم سات منزل عمارت تعمیر کر دیتے، البتہ ہمارا کام یہ ضرور ہے کہ ہم اور آپ مل کر یہ سوچیں کہ کس حد تک یہ خیالات آپ کے اور ہمارے ذہنوں میں جاگزیں ہوتے ہیں؟ ان سے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں اور اس کے بعد ہمیں اپنے رویے میں اپنی زندگیوں میں، اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کے رویے میں کیا کیا تبدیلیاں کرنی چاہئیں؟ ان میں سے کچھ کام تو ہم خود ہی کسی اور فیصلے کا انتظار کیے بغیر کرسکتے ہیں اور بعض دوسرے

کاموں کے لیے دیگر تنظیموں کے فیصلوں کی ضرورت ہوگی۔ کہتے ہیں نوشیرواں کہیں سیر کرنے گیا تو دیکھا کہ ایک مالی ایک پیڑ بو رہا ہے۔ تو اس نے کہا کہ یہ کتنے عرصہ میں پھل لائے گا؟ اس نے کہا کہ یہ ۲۰ سال میں پھل لائے گا۔ اس نے کہا کہ تم تو اتنے بوڑھے ہو، یہ پھل تم کیسے کھاؤ گے؟ اس نے جواب دیا، میرے باپ دادا نے بویا تو میں نے کھایا اب میں بوؤں گا تو میرے بچے کھائیں گے۔ اس نے کہا "زہ" شاباش۔ شاہی دستور کے مطابق بادشاہ جب خوش ہو کر یہ لفظ کہتا تو خوش کرنے والے کو انعام ملتا۔ چنانچہ اس کو ایک ہزار اشرفی مل گئی۔ بوڑھے نے کہا بادشاہ سلامت دیکھئے میرا درخت کتنا عجیب ہے ادھر میں نے بویا ادھر یہ پھل لایا۔ بادشاہ نے پھر "زہ" کہا اور کہا کہ یہاں سے جلدی سے چل دو ورنہ یہ خزانے خالی کردے گا۔ آپ حضرات میں سے جن حضرات کے دل میں یہ خیال ہو کہ شاید اس سیمینار کا نتیجہ برآمد ہونے میں دیر لگے تو وہ میری طرح آج یہ سُن کر بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ ڈاکٹر اصغر علی صاحب نے اپنی تقریر میں یہ مژدہ بھی سُنایا کہ اساتذہ کا ایک تجدیدی کورس ہو رہا ہے جو ایک ہفتہ رہے گا اور عنقریب منعقد ہو رہا ہے جس کا موضوع یہی ہوگا "نظریہ پاکستان"۔ مجھے پُورا یقین ہے کہ ان کی اور ہماری کوششوں سے مل کر انشاء اللہ آنے والے دنوں میں کثرت سے ایسے سیمینار اور ورکشاپ ہوں گے جن میں اساتذہ کو ایسے ہی کورسز دیے جائیں گے کہ وہ اپنے طلبا کو پڑھا سکیں اور نظریہ پاکستان کی اہمیت بیان کرسکیں۔ تو اس سلسلے میں گویا میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا سیمینار بار آور ہو چکا ہے اور انشاء اللہ اس سے اور بھی بہت سی توقعات ہیں۔

میں خاص طور پر ان حضرات کا شکر گزار ہوں جنہوں نے تفصیلی طور پر ہماری اضافی اور نصابی کتب کا جائزہ لیا۔ اسی قسم کی بحث ہم چاہتے تھے اور جو خیالات انہوں نے

خاص طور پر جزئیات بیان کر کے ہمیں دیے ہیں، ہم ان کے بے حد شکر گزار ہیں۔ البتہ جو باتیں انہوں نے عمومی کہی ہیں ان کے متعلق ہم اور غور کریں گے کہ آیا ان کے گلے درست بھی ہیں یا ان کو ہم اپنا پیغام سمجھانے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوئے۔ اساتذہ کا خود یہ مطالبہ کہ نظریہ پاکستان ریفریشر کورسز کے ذریعے یا کتابوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ اساتذہ میں پھیلایا جائے، میں سمجھتا ہوں نہایت نیک فال ہے۔ اسی طرح میں اس خیال کا بھی خیر مقدم کرتا ہوں کہ آئندہ سے ایسوسی ایشن کے نمائندے بھی اس قسم کے مذاکروں میں شامل کئے جائیں۔ تنقیص کے طور پر نہیں، مگر ایک مثال کے طور پر یہ البتہ عرض کر دوں کہ ایک نہایت اہم ایسوسی ایشن کو میں نے ذاتی طور پر یہ درخواست کی تھی کہ آپ کے جو حضرات ہماری راہنمائی فرما سکیں خصوصاً دینیات میں اور نظریۂ پاکستان میں ان کی نشاندہی ضرور کیجئے۔ یہ صاحب صدر سے میری براہ راست گفتگو ہوئی تھی اور میں نے ان سے اس لئے کہا تھا کہ وہ کم و بیش انہی خیالات کے حامل تھے، جن خیالات کا اظہار عام طور پر ان تین دنوں میں کیا گیا۔ یہ کوئی ڈیڑھ دو ماہ کی بات ہے۔ آج تک بھی مجھے انتظار ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ کسی نہ کسی دن ان اساتذہ کی نشاندہی وہ فرما دیں گے۔ اسی طرح میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ نہایت اہم تجویز ہے کہ سکولوں کے اساتذہ کو بھی خصوصاً درسی کتابوں کے لکھنے میں شامل کیا جائے۔ ہم اس تلاش میں ہیں کہ ایسے ورکنگ ٹیچرز ہمیں ملیں۔ ہم نے اپنی طرف سے جتنی کوشش ہو سکتی ہے کی ہے۔ لوگوں سے فہرستیں مانگی ہیں، بورڈوں سے فہرستیں مانگی ہیں، اپنے جاننے والوں سے پوچھا ہے، عام دعوت دی ہے۔ یہ بورڈ کی طرف سے عام دعوت ہے کہ ہماری جو کتاب آپ کو ناقص ملے (اور یہ دعوت بار بار اخبارات میں آ چکی ہے۔ "خبرنامے" میں پچھلے چھ ماہ

سے آ رہی ہے) یا جو باب آپ کو ناقص ملے اس کا متبادل لکھ دیں۔ تو ہم آپ کی خدمت میں وہ ہدیہ پیش کریں گے جو یہاں بڑے بڑے امیر ملکوں کی ناشر تنظیمیں بھی آپ کو مصنف کے طور پر پیش نہیں کریں گی۔ میں صرف اس لئے کہنا چاہتا ہوں کہ کچھ حجاب ہے اساتذہ کرام کو۔ مثال کے طور پر "مطالعۂ پاکستان" کا کیس لے لیجئے کہ ہم نے پچھلے چھ ماہ سے اتنی اشاعت کی کہ جو استاد دیکھنا چاہیں اس کے متعلق مسودہ بھیجیں، ہماری طرف سے دعوت عام ہے۔ اب تک تین مسودے آ چکے ہیں۔ اسی طرح ہماری چھ ماہ سے یہ دعوت عام ہے کہ ان مشاہیر کے متعلق، اسلامی سائنسدانوں کے متعلق، اسلامی وزرا کے متعلق، صاحب انتظام لوگوں کے متعلق، اسلامی بہادروں کے متعلق، اسلامی تاریخ کے متعلق آپ اپنے مسودے بھیجئے۔ اس دعوت کا جواب، اتنا مایوس کن نہیں ہے۔ بہت سے حضرات کافی حضرات نے یہاں مسودے بھیجے ہیں۔ مثلاً ۱۲ کروڑ میں بیس نے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی نیک فال ہے۔ آئندہ مجھے بے حد امید ہے کہ کوئی وجہ نہیں کہ آپ میں سے جو صاحب قلم ہیں جو خصوصاً اساتذہ ہیں کیوں سب سے پہلے ہماری طرف توجہ نہ کریں جب ان کے ذہن میں کوئی کتاب یا مسودہ کوئی تعلیمی کتاب لکھ چکے ہوں۔

آخر میں میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں خاص طور پر ان صدر صاحبان کا، جو یہاں تشریف لائے اور جلسوں کی صدارت قبول کی، ان مقررین کا جنہوں نے نہایت مہربانی سے یہاں آ کر اپنے خیالات سے مستفید فرمایا۔ اور خاص خاص طور پر ان لکھنے والوں کا جنہوں نے ہمارے کہنے پر (افسوس ہے کہ ہمارے پاس وقت کم تھا، اس لئے نوٹس کم تھا) اپنے مقالے تحریر فرمائے اور ان میں سے اکثر آپ کے پاس سائیکلوسٹائل ہو کر پہنچ چکے ہیں۔ میں ڈاکٹر عنایت اللہ بالقابہ، پروفیسر محمد اسلم صاحب،

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب، پروفیسر وارث میر صاحب، پروفیسر علی عباس صاحب، پروفیسر عبدالحئی علوی صاحب، ڈاکٹر اسلم قریشی صاحب، پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب، پروفیسر ب۔ح صدیقی صاحب اور راجا رشید احمد کا خاص طور پر ممنون ہوں کہ انہوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا۔ اس قسم کے سیمینار میں بہت سی فروگذاشتیں رہ جاتی ہیں، مجھے اس کا احساس ہے۔ میں تو دل سے معذرت خواہ ہوں کہ جس قسم کا استقبال آپ کے شایانِ شان کرنا چاہیے تھا، جو انتظامات آپ کے لیے کرنے چاہئیں تھے، وہ ہم سے نہیں ہو سکے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ ہمارے خلوص کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس معذرت کو قبول فرمائیں گے۔

اس سیمینار کا چونکہ گورنر صاحب نے افتتاح کرنا تھا، اس لیے وقت ہمیں متعین ملا، اس سے زیادہ نہیں ملا۔ گویا پہلی تاریخ کو فیصلہ ہوا کہ ۷ تاریخ کو آ رہے ہیں۔ اس کے باوجود جیسے میں نے عرض کیا ہے، تمام حضرات نے بیحد تعاون کیا۔ مجھے ایک دو مثالیں صرف ایسی ملی ہیں، جنہوں نے انکار کیا ہو۔ باقی سب حضرات نے ہماری دعوت کو قبول فرمایا۔

عملے کے متعلق میں دو مثالیں، دو واقعے بیان کر دوں کہ اتوار ۲۶ ستمبر کو گیارہ بجے رات مجھے خیال آیا کہ جا کر پھر ایک دفعہ آپ کے استقبال کے انتظامات دیکھ لوں۔ تو میں نے دیکھا یہاں افسر تو خیر ان کو تو اپنی ذمے داری کا احساس ہونا ہی چاہیے، ہمارے کلرک، ہمارے چپراسی بھی یہاں موجود تھے تاکہ دوسرے دن انتظامات درست ہوں۔ پرسوں شام کی بات ہے کہ رات کے بارہ بجے مجھے ٹیلیفون آیا کہ پنڈی سے بات کیجیے۔ مسیح الزمان صاحب نے مجھے پنڈی سے بتایا کہ افسوس ہے کہ میں ۹ بجے سے جہاز کا انتظار کر رہا ہوں اور اب بارہ بج گئے ہیں، میں نہیں آ سکتا۔ چنانچہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب میں نے

ائرپورٹ پر ٹیلیفون کیا تو مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارا نمائندہ وہاں بھی موجود تھا، ڈرائیور بھی موجود تھا اور وہ انتظار کر رہا تھا کہ کب مہمان مقررہ آئیں اور وہ   انہیں اپنی جگہ پہ لے جائے۔ ان باتوں پر شاید میں فخر بھی کرتا ہوں مگر خاص طور پہ یہ بیان اپنے خلوص کا اظہار کرنے کے لیے ہے کہ جہاں تک نیت کا تعلق ہے، ہم سب حضرات کی چپراسی سے لے کر ڈائریکٹر تک خواہش رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے رویے سے آپ کو خوش آمدید کہیں۔ آپ حضرات نے بےحد مفید اور غور طلب باتیں فرمائی ہیں، فکر طلب باتیں فرمائی ہیں، جن پر عرصہ تک غور ہو سکتا ہے۔ ہمارا یہ وعدہ ہے کہ اللہ نے ہمیں توفیق دی تو انشاءاللہ دو ماہ کے اندر اندر یہ تمام باتیں کتابی صورت میں آپ کی خدمت میں پیش کر دی جائیں گی۔

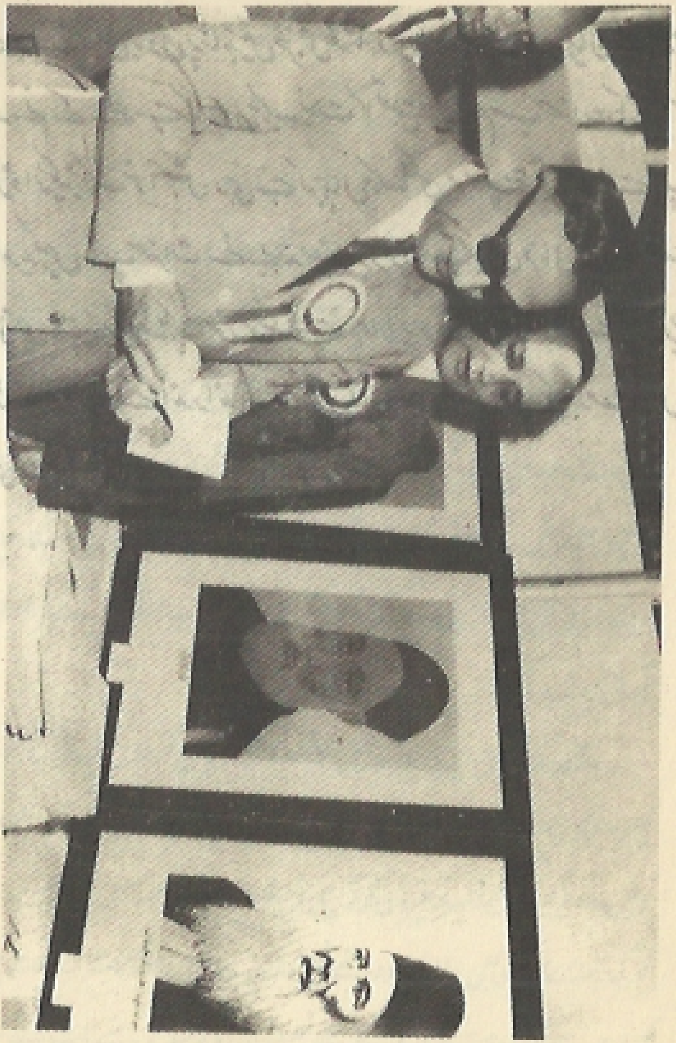

سیمینار کے افتتاحی اجلاس کے بعد گورنر تحریکِ پاکستان کی تصویری اور کتابی نمائش دیکھ رہے ہیں

ضمیمہ الف

ملک کے مشہور اہلِ قلم، مفکرین اور ماہرینِ تعلیم کے نام خط

"کچھ عرصے سے نصابی کتابوں کے ذریعے سے نظریۂ پاکستان کے تحفظ کا سوال ماہرینِ تعلیم، مفکرین اور عوام کی توجہ کا باعث رہا ہے۔

فی الحال مختلف کمیٹیاں اور ادارے نصاب پر نظرِ ثانی کا کام کر رہے ہیں۔ یہ کوشش بھی کی جا رہی ہے کہ نظریۂ پاکستان کے منافی مواد کتابوں میں موجود نہ ہو۔ تاہم اس امر کی بڑی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ نظریۂ پاکستان کی واضح تعریف بیان کی جائے اور اس کے مذہبی، تاریخی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی مضمرات کی نشاندہی کی جائے۔ ہمیں ایسے عوامل تلاش کرنے ہیں، جو ہمارے نظریے کو تقویت پہنچا سکیں، ایسے ذرائع سوچنے ہیں، جن سے چیلنج کا مقابلہ کیا جا سکے اور اس امر پر غور کرنا ہے کہ نظریاتی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے دورِ جدید کے تقاضوں کو کیسے پورا کیا جائے۔

نظریۂ پاکستان کے متعلق تصورات کی وضاحت کے بعد ہمیں یہ جائزہ لینا ہے کہ نفسِ مضمون اور پیشکش کے نقطۂ نظر سے مختلف جماعتوں کے مختلف مضامین میں نظریۂ پاکستان کی عکاسی کی موجودہ حالت کیا ہے۔ ہمیں یہ متعین کرنا ہے کہ نظریۂ پاکستان کی اشاعت و قبولیت کے سلسلے میں نصابی کتب کا کردار کیا ہے اور نصابی کتب میں نظریۂ پاکستان کو سمونے کے متعلق واضح تجاویز کیا ہیں؟ — اس مقصد کے لیے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ

کی طرف سے ۲۷ سے ۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ء تک "نظریۂ پاکستان" پر ایک سہ روزہ سیمینار ہو رہا ہے۔ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر و گورنر پنجاب ۲۷ ستمبر ۱۹۷۱ء کو ساڑھے نو بجے سیمینار کا افتتاح فرمائیں گے۔ توقع ہے کہ سیمینار میں تین سو کے قریب دانشور اور ماہرین تعلیم شریک ہوں گے۔

آپ منسلکہ پروگرام میں اپنے نام کے سامنے درج شدہ موضوع پر سیمینار سے خطاب فرمائیں تو میں ممنون ہوں گا۔

باہر سے آنے والے مقررین کو لاہور تک آمد و رفت کا اصل کرایہ بھی دیا جائے گا۔ لاہور میں ان کے قیام اور آمد و رفت کا انتظام بھی پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی طرف سے کیا جائے گا۔

میری گزارش ہے کہ آپ ازراہ کرم

ا۔ ہماری دعوت قبول کرنے کے متعلق جلد از جلد مطلع فرمائیں۔

ب۔ پندرہ روز کے اندر اندر اپنی تقریر کی نقل ارسال فرمادیں تاکہ اسے طبع کرا کے سیمینار کے پروگرام میں شامل کیا جائے۔

ہم اسے واضح طور پر ترجیح دیں گے کہ تقریر اردو میں کی جائے لیکن اگر کوئی مقرر انگریزی سے کام لینا چاہیں تو لیں۔ چونکہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہوگا لہٰذا ضروری ہے کہ تقریر مقررہ وقت کے اندر اندر بھیج دی جائے۔ میری یہ بھی درخواست ہے کہ ازراہ کرم ۲۵ فی صد وقت سوال و جواب کے لیے مختص کیا جائے۔

مختلف موضوعات کا تجزیہ اس امید پر منسلک کر رہا ہوں کہ شاید یہ مفید ثابت ہو۔

والسلام

مخلص: میر نسیم محمود

نظریۂ پاکستان اور نصابی کتب

سیمینار کے موضوعات کا تجزیہ

۱۔ نظریۂ پاکستان کے تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور اقداری مضمرات

ا۔ نظریۂ پاکستان کی بنیاد۔

اسلام اور اس کی اقدار و روایات، مساواتِ انسانی، انصاف، بہادری، قربانی، نصب العین کا دفاع، اخوتِ اسلامی، آزادیٔ ضمیر، اقلیتوں کا تحفظ، انفرادی و اجتماعی زندگی، دنیوی زندگی، ابدی مسرت کے حصول کا ذریعہ

ب۔ تاریخی پس منظر

برصغیر میں اسلام کی آمد، تبلیغِ اسلام، مسلمان حکومت کی خصوصیات، زوال کے اسباب

ج۔ سیاسی پس منظر

تجدید۔ مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید، سر سید، اقبال اور قائدِ اعظم

د۔ پاکستان کا قیام

غرض و غایت، جدوجہد، قربانیاں، مشکلات

۵- ۲۴ سالہ تاریخ سے سیکھا ہوا سبق

۱- نوجوان نسل میں بیداری پیدا کرنے کی ضرورت

۲- انتشار کے رجحانات کے سدباب کی ضرورت

۳- قومی یک جہتی پیدا کرنے کے لیے اقدامات

۴- دشمنوں سے باخبر رہنے کی ضرورت

۲- نظریۂ پاکستان کے معاشی پہلو

ا- نظریۂ پاکستان کے بنیادی اقتصادی تقاضے، ضروریاتِ زندگی کی فراہمی، استحصال کے خاتمے کے لیے حدود

ب- اسلام، سرمایہ داری نظام اور اشتراکیت میں بنیادی فرق

ج- پیداوار اور بہبود کے مابین بظاہر تصادم پر تبصرہ

د- آبادی اور دفاعی ضروریات کے مسائل

ہ- اسلامی تاریخ کے حوالے سے اسلامی اصول پر معاشی تنظیم کے متعلق ہم کیا سبق سیکھ سکتے ہیں؟

و- موجودہ ترغیبات کو تبدیل کرکے یا ان میں ترمیم کرکے اسلامی معاشی ڈھانچے کی تشکیل کے لئے ایک منظم پروگرام کی خاطر تجاویز

۳-(الف) نظریۂ پاکستان کو تقویت دینے والے عوامل

۱- تعلیم۔ تدریسی نفسیات

۲- نصابی کتب۔ تعریف اور ان کی کارگزاری کی حدبندی

۳- گھر اور بچوں کی تربیت

۴- معاشرتی ماحول کی معاونت

۵- ذرائعِ ابلاغ۔ مثلاً اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما

۶- سماجی خدمت

۷- عوامل کے مؤثر استعمال کے لئے مثبت اقدامات

ان عوامل کے بروئے کار آنے کی راہ سے رکاوٹیں دور کرنے کے متعلق تجاویز

۳-(ب) ہمیں کس چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے؟

۱- غیر ملکی زہریلے اثرات

۲- مخاصم ہمسائے

۳- علاقائی تعصب

۴- مذہبی تنگ نظری

۵- مادہ پرستی

۶- جدیدیت کی ضرورت

چیلنج کا مقابلہ کرنے کے مؤثر طریقے

۴- نصابی کتابیں نظریۂ پاکستان کی کہاں تک مظہر ہیں؟

(د) مندرجہ ذیل مضمونوں کی نصابی کتب کے مندرجات کا جائزہ:-

۱- دینیات — پرائمری، مڈل اور ثانوی جماعتوں کے لیے

۲- اردو — پرائمری، مڈل اور ثانوی جماعتوں کے لیے

۳- معاشرتی علوم — پرائمری، مڈل، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی جماعتوں کیلئے

۴- انگریزی — مڈل اور ثانوی جماعتوں کے لیے

نظریۂ پاکستان کی نمائندگی کو مندرجہ ذیل موضوعات سے جانچا جائے :-

۱- بنیادی عقیدہ

۲- اقدار

۳- تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی بیداری کا قومی یک جہتی کی طرف رہنمائی کرنا اور علاقائی تعصب سے باز رکھنا

(ب) اضافی کتب کے منصوبے کی اہمیت

۵- نظریۂ پاکستان کو نصابی کتب میں پیش کرنے کے بارے میں تجاویز

موجودہ صورتِ حال کا جائزہ :-

ا- مقدار کے اعتبار سے

ب- معیار کے اعتبار سے

ضمیمہ ب

سیمینار

مورخہ ۲۷-۲۸-۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ء

کا پروگرام

۲۷ ستمبر ۱۹۷۱ء

افتتاحی اجلاس

مارشل لا ایڈمنسٹریٹر و گورنر پنجاب کی آمد	ساڑھے ۹ بجے صبح
تلاوت قرآن مجید	ساڑھے ۹ بجے صبح
خطبۂ استقبالیہ	
میر نسیم محمود- چیئرمین پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ۔	۹ بج کر پینتیس منٹ

سیمینار کا افتتاح

مارشل لا ایڈمنسٹریٹر و گورنر پنجاب	۹ بج کر پینتالیس منٹ
چائے	دس بجے

مہمانِ خصوصی کی روانگی

دس بج کر پچیس منٹ

۲۷ ستمبر ۱۹۷۱ء

پہلی نشست

صدر:۔ جسٹس ایس۔ اے رحمان

"نظریۂ پاکستان کے تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور قدری پہلو"

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی	دس بجکر پچیس منٹ صبح

"نظریۂ پاکستان کے اقتصادی پہلو"

ڈاکٹر انور اقبال قریشی	گیارہ بج کر پینتیس منٹ
مولانا جعفر شاہ پھلواروی	بارہ بج کر بیس منٹ
صدارتی کلمات	ایک بج کر دس منٹ

دوسری نشست

چائے	ساڑھے چار بجے شام
گروہی بحث	پانچ بجے سے ساڑھے چھ بجے تک

۲۸ ستمبر ۱۹۷۱ء

تیسری نشست

صدر:۔ پروفیسر حمید احمد خان

دوسری نشست کی گروہی بحث کی رپورٹیں	سوا آٹھ بجے صبح
صدارتی کلمات	نو بجے صبح
چائے	ساڑھے نو بجے صبح

چوتھی نشست

صدر:۔ جسٹس حمود الرحمٰن

"نظریۂ پاکستان کو تقویت دینے والے عوامل"

سید قاسم رضوی	پونے دس بجے صبح
صدارتی کلمات	سوا گیارہ بجے
گروہی بحث	ساڑھے گیارہ بجے

پانچویں نشست

صدر:۔ پروفیسر علاء الدین صدیقی

چوتھی نشست کی گروہی بحث کی رپورٹیں	ساڑھے بارہ بجے دوپہر
صدارتی کلمات	ایک بجے

۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ء

چھٹی نشست

صدر:۔ پروفیسر میاں نامدار خان

"موجودہ نصابی کتب نظریۂ پاکستان کی کہاں تک مظہر ہیں؟"

ڈاکٹر عبدالحمید	سوا آٹھ بجے صبح

"نصابی کتب میں نظریۂ پاکستان کو پیش کرنے کے بارے میں تجاویز"

ڈاکٹر اصغر علی شیخ	نو بجے صبح

صدارتی کلمات	دس بجے صبح
چائے	دس بج کر بیس منٹ
گروہی بحث	دس بج کر چالیس منٹ سے بارہ بجے دوپہر تک

ساتویں نشست

صدر:۔ میر نسیم محمود

گروہی بحث کی رپورٹیں	بارہ بجے دوپہر
سیمینار پر اظہارِ رائے	
شرکائے سیمینار	ساڑھے بارہ بجے
خطبۂ اختتامیہ	ایک بجے

ضمیمہ ج

گروہی بحث کے بارے میں چند اشارات

۱۔ گروہی بحث کی ضرورت

گروہی بحث صحیح طریقے سے کی جائے تو ایک دُوسرے کے تجربے سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ خیالات اور روّیے کی اصلاح اور مسائل کے حل کے لئے ایک بہت مؤثر اور دلچسپ طریق کار ہے۔

۲۔ ماحول

گروہی بحث کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز وُہ ماحول ہے، جو گروہ میں پایا جاتا ہے۔ اگر ماحول غیر رسمی، دوستانہ، پُرجوش اور خوشگوار ہو تو شرکا اچھے طریقے سے گروہی بحث میں حصّہ لے سکتے ہیں۔ آزادانہ رائے کے اظہار کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔ تاہم گروہ کو بحث کے مقصد کے حصول کا خیال رکھنا چاہیئے تاکہ معینہ وقت کے اندر اندر یہ مراحل طے ہو جائیں۔ دوستانہ ماحول، نرم گفتاری اور دوسروں کی رائے پر تحمّل و بردباری اچھی بحث کے لوازمات ہیں۔

۳۔ چیئرمین کی ذمّے داری

ا ۔ گروہ کے چیئرمین اور سیکرٹری کے ذمے خاص فرائض ہوتے ہیں مگر انہیں اپنے آپ کو گروہ سے الگ نہیں تصوّر کرنا چاہیے۔ وہ گروہ کا ضروری حصّہ ہیں۔

ب۔ چیئرمین کا کام گروپ پر حکومت کرنا نہیں ہے۔ اس کا ایک ضروری فریضہ یہ ہے کہ بامعنی سوالات خود پوچھے اور دوسروں کو پوچھنے پر آمادہ کرے۔

ج۔ ایک اچھا چیئرمین شرمیلے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کرے تاکہ وہ بحث میں پوری طرح حصّہ لیں۔ اسی طرح وہ نہایت صفائی اور نرمی سے کسی ساتھی کو جو بحث کو اپنا ہی اجارہ سمجھ رہا ہو، باز رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ نہ بحث کا گلا گھونٹے اور نہ ہی بحث کو حد سے بڑھنے اور زیرِ بحث مقصد سے ہٹنے دے۔

د۔ چیئرمین اس بات کا لحاظ رکھتا ہے کہ وہ گروہ کی کارکردگی کا واحد ذمے دار نہیں ہے۔ وہ اس کام میں گروہ کے ہر ممبر کو شریک کرتا ہے۔

ہ۔ چیئرمین کو وقتاً فوقتاً بحث کا خلاصہ تیار کرنے میں شرکائے کار کی مدد کو خوش آمدید کہنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے بحث کو متواتر پیشِ نظر رکھنا چاہیے تاکہ اگر ضرورت پڑے تو وہ خود اس کا ماحصل بیان کر سکے۔

و۔ چیئرمین اور گروہ کے دوسرے ممبروں کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ بحث مرکزی نقطے سے اِدھر اُدھر نہ ہونے پائے اور زیرِ نظر مطالعے پر مرکوز رہے۔

۴۔ شرکا کی ذمّے داریاں

ا۔ گروہی بحث میں حصہ لینے والوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بامقصد شرکت ان کا بھی ایسا ہی فریضہ ہے جیسا کہ چیئرمین کا۔

ب۔ ہر اجلاس کا انحصار زیادہ تر سابقہ تیاری پر ہے۔ شرکا کو اجلاس کے معینہ وقت سے پہلے اپنے حصے کا کام جہاں تک ممکن ہو، مکمل کر لینا چاہیے۔ دوسری طرف گروہی بحث میں شرکت کرنے والوں کے لیے یہ مفید ہوگا کہ وہ زیرِ بحث مضمون کے تمام پہلوؤں سے باخبر ہوں تاکہ دوسرے ساتھیوں کی آرا میں دلچسپی لے سکیں اور ضروری سوال کر سکیں اور اپنے تجربے اور مطالعے کی بنا پر رائے کا اظہار کر سکیں۔

ج۔ انہیں تقریروں کو بار بار دہرانے، اپنے مطالعے کے لمبے چوڑے اظہار اور اپنی رائے کے تکرار سے گروہ کا زیادہ وقت استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

د۔ انہیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اچھی سماعت بھی اگر زیادہ نہیں تو اتنی اہم ضرور ہے جتنی کہ تقریر۔ شرکا کو اس بات کی بھی احتیاط کرنی چاہیے کہ گروہ کے اجلاس کے دوران وہ ایک الگ جزوی اجلاس میں مشغول نہ ہوں۔

۵۔ حاصلِ کلام

مختصر یہ کہ اچھی بحث وہ ہوتی ہے جو تمام تر مقصد کے حصول، تجربات کے تبادلے اور مسائل کے بہترین حل کی تلاش میں مدد دے۔ شائستہ، برمحل، واضح اور بامعنی ہو۔ ایسی گروہی بحث کے شرکا اپنی انفرادی کارکردگی کی نسبت گروہ کی مجموعی کارکردگی پر زیادہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ گروہ کا ہر ممبر دوسروں سے کچھ سیکھنے کا اتنا ہی مشتاق ہوتا ہے، جتنا دوسروں کو سکھانے کا۔ شرکا کے مابین صحت مند، باہمی بے تکلفی اور احترام کے مراسم استوار ہوتے ہیں۔ گروہ کے ممبر ایک دوسرے سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں اور یکے بعد دیگرے مزید قابلِ قدر کاموں میں مصروف رہنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

ضمیمہ د

سیمینار پر تجاویز حاصل کرنے کے لئے سوالنامہ

۱۔ انتظامات کو آپ کون سا درجہ دیں گے؟ اول دوم سوم
(کسی ایک پر نشان لگائیں)

۲۔ انتظامات میں آپ کیا اصلاحات تجویز کرتے ہیں؟

۳۔ کیا کوئی ایسی شخصیت سیمینار میں شامل ہونے سے رہ گئی ہے، جس کی شمولیت ضروری تھی؟ تجویز کریں کہ مزید کس کو دعوت دی جانی چاہیئے تھی۔

۴۔ آپ کو کون سی تقاریر پسند آئیں اور کیوں؟

۵۔ کون سی تقاریر معیاری نہیں تھیں اور ان کو غیر معیاری قرار دینے کی وجوہ کیا ہیں؟

۶۔ کیا گروہی بحثوں کا وقت مناسب/ناموزوں/بہت زیادہ تھا؟

۷۔ کیا گروہی بحثوں کو مزید مفید اور موثر بنایا جا سکتا تھا؟ کیسے؟

۸۔ افادیت کے لحاظ سے مندرجہ ذیل کی درجہ بندی کریں:۔

ا۔ تقاریر

ب۔ گروہی بحثیں

ج۔ عام اجلاس

۹۔ کون سے مزید موضوعات کو سیمینار میں زیر بحث لایا جانا چاہئے تھا؟

۱۰۔ کون سے موضوعات کو چھوڑا جا سکتا تھا۔

۱۱۔ کیا سیمینار کا وقت زیادہ طویل/بہت کم/موزوں تھا؟
(کسی ایک پر نشان لگائیں)

۱۲۔ اس قسم کے سیمیناروں میں مزید اصلاح کے لیے آپ کوئی تجویز دینا پسند کریں گے؟

۱۳۔ آپ نے سیمینار کے دوران میں کون سے خاص تصورات اخذ کئے؟

۱۴۔ کیا آپ سیمینار کی تجاویز پر عملدر آمد کے سلسلے میں کوئی خاص تجویز دینا چاہتے ہیں؟

۱۵۔ کیا آپ آئندہ سیمیناروں کے لیے کچھ موضوعات تجویز کرنا پسند کریں گے؟

۱۶۔ سیمینار کو مجموعی طور پر آپ کیا درجہ دیتے ہیں؟

نہایت اعلیٰ

بہت اچھا

اچھا

کافی اچھا

غیر تسلی بخش

ضمیمہ ۵

سیمینار کے بارے میں شرکا کی آرا و تجاویز

سیمینار کے اختتام پر شرکائے سیمینار سے درخواست کی گئی کہ وہ سیمینار کے تینوں دنوں کے دوران میں منعقد ہونے والی تمام نشستوں کے متعلق اپنی آرا اور تجاویز دینے کے لئے ۱۶ شقوں پر مشتمل سوالنامے کو پُر کریں۔ ۵۰ شرکا نے سوالنامے کے جوابات دیئے۔ ان کی آرا اور تجاویز کا خلاصہ سوالنامے کی شقوں کی ترتیب سے نیچے درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ سیمینار کے انتظامات کو ۷۶ فی صد حضرات نے درجہ اوّل، ۲۲ فی صد نے درجہ دوم اور صرف ۲ فی صد حضرات نے درجہ سوم دیا۔

۲۔ اصلاح کی تجاویز کے سلسلے میں ۱۲ فی صد شرکا نے تجویز کیا کہ سیمینار میں شرکت کے لئے کم وقت دیا گیا۔ ۱۰ فی صد کی تجویز تھی کہ باہر سے آنے والے لوگوں کی رہائش کا انتظام کرنا چاہیے تھا۔ ۸ فی صد حضرات نے پنکھوں کی کمی کی طرف توجہ دلائی۔ ۴ فی صد نے سیمینار کو لاہور کے کسی مرکزی مقام پر منعقد کرنے، گروہی مباحث کی تیاری کے لئے مواد کی پیشگی فراہمی اور آمد و رفت کے ضروری انتظامات پر زور دیا۔ ۲ فی صد نے خیال ظاہر کیا کہ اگر رہائش کا انتظام کسی مرکزی جگہ پر اور خصوصاً سب کے لئے ایک ہی مقام پر ہوتا تو مناسب تھا۔ سوالنامے کا جواب دینے والوں میں سے ۲ فی صد نے خواتین کے لئے علیحدہ بیت الخلا، سائیکل سٹینڈ کے لئے چوکیدار کے تعین اور نقشے میں نزدیک ترین بس سٹاپ کی نشاندہی کا ذکر کیا۔ سوالنامہ پُر کرنے والوں نے سیمینار زیادہ خنک موسم میں کرانے اور گروہی بحثوں

کے لئے زیادہ وقت دینے کی طرف بھی توجہ دلائی۔

۳۔ ایسے غیر مدعوین کے بارے میں، جن کی سیمینار میں شرکت لازمی تھی، تجاویز دیتے ہوئے ۱۴ فی صد شرکا نے یونیورسٹیوں، کالجوں اور سکولوں کے اساتذہ، مذہبی رہنماؤں اور دانشوروں کو بلانے کی سفارش کی۔ ۴ فی صد اس خیال کے تھے کہ پروفیسروں لیکچراروں اور استادوں کی ایسوسی ایشنوں کے ساتھ ساتھ تحریک پاکستان میں حصہ لینے والے رہنماؤں اور معاشرتی بھلائی کے کام کرنے والوں کو بلایا جانا چاہیے تھا۔ ۲ فی صد کی رائے تھی کہ مشرقی پاکستان کے دینی رہنماؤں، کالجوں کے پرنسپلوں سکولوں کے سربراہوں اور اساتذہ کو بھی بلایا جاتا۔ سیمینار میں شرکت کے لئے ۲ فی صد حضرات نے طلبا و طالبات کے والدین، سکولوں کے انسپکٹر اور انسپکٹریس، نصاب سازی سے متعلق افراد اور ثانوی تعلیمی بورڈوں کے ممبروں کی سفارش کی۔ یہ تجویز بھی دی گئی کہ ماہرین مضامین اور درسی کتابوں کے مصنفین کی سیمینار میں حاضری بھی بہت ضروری تھی۔ ایک تجویز کے مطابق ضلع اور ڈویژن کی سطح پر ایسے ہی سیمینار کرانے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

۵۔۴۔ دو مقالوں کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے مقالے کو جامع، وقیع اور نظریۂ پاکستان کا نمائندہ قرار دینے والے ۹۲ فی صد تھے۔ دوسرے نمبر پر ڈاکٹر اصغر علی شیخ کا مقالہ آیا۔ ۵۰ فی صد شرکا نے اس مقالے کو واضح، زوردار اور نصابی کتب کی تیاری کے تعلق سے نظریۂ پاکستان کے تعمیری نقطۂ نگاہ کا حامل قرار دیا۔ مسٹر جسٹس حمود الرحمٰن کے خطبے کو ۳۸ فی صد حضرات نے صریح، مقصدی اور مفید قرار دیا۔ ۱۰ فی صد نے باقی تقریروں اور خطبوں کو مفید اور فکر انگیز قرار دیتے ہوئے

ستائش کی۔ چند لوگوں نے دو ایک تقریروں کی سادی عمومیت کو پسند نہیں کیا۔

۶۔ گروہی بحثوں کے وقت کو شرکا کی اکثریت (۶۰ فی صد) نے کم قرار دیا۔ ۲۸ فی صد نے اسے مناسب بتایا اور صرف ۲ فی صد نے 'زیادہ' قرار دیا۔

۷۔ گروہی بحثوں کو زیادہ مفید اور موثر بنانے کے لئے ۳۰ فی صد شرکا نے رائے ظاہر کی کہ ان بحثوں کے لئے زیادہ وقت دیا جانا ضروری تھا۔ ۱۴ فی صد نے سفارش کی کہ متعلقہ مواد اور بحثوں کے سوالات کو پہلے سے شرکا میں تقسیم کیا جانا چاہیے تھا۔ ۶ فی صد لوگوں نے بحث کو زیادہ موثر بنانے کے لئے ان کے "موضوع وار" ہونے پر زور دیا۔ ۴ فی صد نے خیال ظاہر کیا کہ اگر تمام ارکان کے نقطہ نظر کو مساوی درجہ دیا جاتا اور خاص طور پر گروہ اگر چھوٹے چھوٹے ہوتے تو یہ بحثیں زیادہ مفید اور موثر ہوتیں۔

۸۔ شرکا کی اکثریت نے افادیت کے اعتبار سے تقریروں اور مقالات کو پہلا، گروہی بحثوں کو دوسرا اور عام اجلاسوں کو تیسرا درجہ دیا۔

۹۔ سیمیناروں کے لئے مزید موضوعات کی فہرست اہمیت کے اعتبار سے ترتیب وار نیچے درج کی جاتی ہے۔

(الف) سائنسی مضامین اور نظریہ پاکستان

(ب) نصاب سازی

(ج) قومی زبان کا مسئلہ

(د) نظامِ امتحان

(ہ) اساتذہ کی ذمے داری

(و) نصابی کتب، اساتذہ، دار المطالعوں اور عجائب گھروں کا کردار۔

(ز) نصابی کتب کے مضامین کے ذریعے کردار سازی۔

(ح) تمام نصابی کتب کے مندرجات۔

۱۰۔ ۲ فی صد شرکا نے دو تقریریں نہ ہو سکنے کا ذکر کیا ہے۔ جس سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ۹۸ فی صد شرکا سیمینار کے مقررین اور مقالہ نگاروں کے انتخاب سے مکمل طور پر مطمئن تھے۔

۱۱۔ شرکا کی اکثریت (۷۲ فی صد) کی رائے میں سیمینار کی مدت نہایت معقول تھی، ۲۶ فی صد نے اسے بہت تھوڑا قرار دیا اور صرف ۲ فی صد سے بہت زیادہ ٹھہرایا۔

۱۲۔ سیمینار کی اصلاح کے لئے پیش کی جانے والی تجاویز کو اہمیت کے لحاظ سے نیچے ترتیب دیا گیا ہے:۔

(ا) سیمینار زیادہ تسلسل سے ہونا چاہیئے تھا۔

(ب) گروہی بحثوں کو کافی وقت دیا جانا چاہیے اور نشستوں کی مدت طویل نہیں ہونی چاہیے

۱۳۔ جہاں تک سیمینار کے دوران میں نظریات کے حصول کا تعلق ہے، شرکا کی اکثریت (۷۰ فی صد) نے لکھا ہے کہ اس سیمینار میں نظریہ پاکستان کو بڑی وضاحت و صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔

۱۴۔ مندرجہ ذیل تجاویز دی گئیں۔

(ا) سیمینار کی روداد اور تقریروں اور مقالات کی نقول شرکا کو بھیجی جائیں۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ سیمینار کے شرکا سے گہرا رابطہ قائم رکھے اور شرکا کو ہدایت کرے کہ وہ سیمینار کے دوران ہونے والی بحثوں کی روشنی میں نصابی کتب کی تیاری

کے سلسلے میں تجاویز دیں۔

(ب) سیمینار کی سفارشات اور تجاویز متعلقہ حکام تک پہنچائی جائیں اور ان پر فوری عملدرآمد کے لئے اقدامات کئے جائیں۔

(ج) نصابی کتب میں موضوعات کی درجہ بندی کی جائے۔

۱۵۔ آیندہ کے لئے ہونے والے سیمیناروں کے موضوعات یہ تجویز کئے گئے۔

(الف) نظریۂ پاکستان کو لوگوں میں کس طرح پھیلایا جائے۔

(ب) پاکستان کا تاریخی پس منظر۔

(ج) قائدِ اعظمؒ کی زندگی کے خاص واقعات۔

(د) طلبا کو نصابی کتب کے ذریعے اچھا پاکستانی کیسے بنایا جائے۔

(ہ) سکولوں میں پڑھائے جانے والے مضامین کی تدریس کو کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

(و) سائنس اور اسلام

(ز) نظریۂ پاکستان اور نظم و نسق۔

(ح) سکولوں اور کالجوں کو پیش آنے والے مختلف تعلیمی مسائل۔

(ط) نظریۂ پاکستان اور معاشی مسائل۔

۱۶۔ مجموعی طور پر شرکا کی اکثریت (۵۸ فی صد) نے سیمینار کو "بہترین" اور "بہت اچھا" قرار دیا ہے، ۲۶ فی صد نے "اچھا" اور ۱۶ فی صد نے مناسب کہا ہے۔ اور کسی ایک شخص نے بھی اسے غیر تسلی بخش نہیں گردانا۔

ضمیمہ و

شرکا کے اسمائے گرامی

۱۔ مسز احسن ۔ لاہور کالج فار ویمن ۔ لاہور

۲۔ ڈاکٹر احسن الاسلام ۔ گورنمنٹ کالج ۔ لاہور

۳۔ سید اختر امان جعفری ۔ گورنمنٹ کالج ، باغبانپورہ ۔ لاہور

۴۔ پروفیسر محمد ارشاد ۔ گورنمنٹ کالج ، لاہور

۵۔ مس آر ، امین ۔ پرنسپل چوبرجی گارڈن ہائی سکول ۔ لاہور

۶۔ پروفیسر ایم اسحاق جلالپوری ۔ مرکزِ توسیعِ تعلیم ۔ لاہور

۷۔ پروفیسر اسحاق خالد ۔ سنٹرل ٹریننگ کالج ۔ لاہور

۸۔ مسٹر احمد سعید ۔ ہیڈ ماسٹر ، اسلامیہ ہائی سکول ۔ سیالکوٹ

۹۔ پروفیسر محمد اسلم ۔ شعبۂ تاریخ ۔ پنجاب یونیورسٹی ۔ لاہور

۱۰۔ پروفیسر قاضی محمد اسلم ۔ ۱۴۔ ایس ۔ گلبرگ ، لاہور

۱۱۔ مسٹر محمد اسلم ۔ سنٹرل ٹریننگ کالج ، لاہور

۱۲۔ ڈاکٹر محمد اسلم قریشی ۔ پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ ، پنجاب یونیورسٹی ۔ لاہور

۱۳۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ۔ سابق وائس چانسلر ، کراچی یونیورسٹی ۔ کراچی

۱۴۔ ڈاکٹر اصغر علی شیخ ۔ ڈائرکٹر ، مرکزِ توسیعِ تعلیم ۔ لاہور

۱۵۔ مسٹر افتخار احمد ۔ گورنمنٹ جامع ہائی سکول ۔ راولپنڈی

۱۶۔ پروفیسر ایم، اقبال۔ گورنمنٹ کالج۔ لاہور

۱۷۔ مسٹر اللہ نواز۔ گورنمنٹ ہائی سکول۔ کھاریاں ضلع گجرات

۱۸۔ پروفیسر محمد الیاس۔ ادارۂ تعلیم و تحقیق، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

۱۹۔ پروفیسر امان اللہ۔ شعبۂ اسلامیات، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

۲۰۔ مس امت الحفیظ چودھری۔ لیڈی اینڈرسن سکول۔ سیالکوٹ

۲۱۔ امت النصیر رشید۔ گورنمنٹ جامع ہائی سکول۔ ملتان

۲۲۔ مسز امتیاز احمد حسن۔ شعبۂ تاریخ، لاہور کالج فار ویمن۔ لاہور

۲۳۔ مسز امینہ اطہر حسن۔ لاہور کالج فار ویمن۔ لاہور

۲۴۔ مسز امینہ غنی۔ ڈپٹی ڈائرکٹریس۔ ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن۔ لاہور

۲۵۔ مسٹر امیر الدین احسن۔ سینیر ٹیچر۔ کارپوریشن ہائی سکول مزنگ۔ لاہور

۲۶۔ مسٹر انتظار حسین۔ روزنامہ مشرق، لاہور

۲۷۔ ڈاکٹر انور اقبال قریشی۔ ۲۹۵۔ ای۔ سرور روڈ۔ لاہور چھاؤنی

۲۸۔ ڈاکٹر انور برکت۔ پرنسپل۔ ایف، سی کالج۔ لاہور

۲۹۔ پروفیسر انور چودھری۔ گورنمنٹ کالج، باغبانپورہ۔ لاہور

۳۰۔ پروفیسر اے، ایچ تیند۔ ڈائرکٹر، ادارۂ تعلیم و تحقیق، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

۳۱۔ راجہ ایف، ایم ماجد۔ چیئرمین، ثانوی تعلیمی بورڈ۔ ملتان

۳۲۔ مس ایف، طفیل۔ مرکزِ توسیعِ تعلیم۔ لاہور

۳۳۔ مس ایس، اے خان۔ پرنسپل، کوئین میری کالج۔ لاہور

۳۴۔ پروفیسر ایس، ایچ بخاری۔ گورنمنٹ کالج، وحدت کالونی۔ لاہور

۳۵۔ پروفیسر ایم، اے خان۔ ڈپٹی سیکرٹری، محکمۂ تعلیم۔ لاہور

۳۶۔ مسٹر ایم، اے سعید۔ سپیریئر سائنس کالج، لاہور

۳۷۔ ڈاکٹر مسز این جے تیموری۔ لاہور کالج فار ویمن۔ لاہور

۳۸۔ مس این قریشی۔ ہیڈ مسٹریس، اسلامیہ گرلز ہائی سکول۔ اچھرہ، لاہور

۳۹۔ مسٹر بشیر الدین احمد۔ مرکزِ توسیعِ تعلیم۔ لاہور

۴۰۔ مس بلقیس شاد۔ پرنسپل، گورنمنٹ گرلز جامع ہائی سکول۔ سرگودھا

۴۱۔ مس بلقیس محمد دین۔ مرکزِ توسیعِ تعلیم۔ لاہور

۴۲۔ ڈاکٹر محمد بہاء الحق۔ گورنمنٹ کالج۔ لاہور

۴۳۔ مسز بھٹی۔ ادارۂ تعلیم و تحقیق، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

۴۴۔ مسٹر پی، اے چشتی۔ گورنمنٹ کالج۔ لاہور

۴۵۔ پروفیسر پی، ایچ صدیقی۔ ڈپٹی ڈائرکٹر لائبریریز۔ ایبٹ روڈ۔ لاہور

۴۶۔ مس پروین سعید۔ گورنمنٹ جونیئر ماڈل سکول، راولپنڈی

۴۷۔ مس ٹی، منصور۔ ڈپٹی انسپکٹریس آف سکولز۔ لاہور ڈویژن

۴۸۔ مس ثریا حسن۔ لاہور کالج فار ویمن۔ لاہور

۴۹۔ مسز ثریا یوسف۔ گورنمنٹ انٹر کالج، باغبانپورہ۔ لاہور

۵۰۔ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی۔ معرفت مجلس ترقیٔ ادب۔ کلب روڈ۔ لاہور

۵۱۔ صوفی جمال اللہ۔ ہیڈ ماسٹر، اسلامیہ ہائی سکول۔ گوجرانوالہ

۵۲۔ مس جہاں آرا۔ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول نمبر ۱۔ ملتان چھاؤنی

۵۳۔ ڈاکٹر ایم جہانگیر خان۔ ڈائرکٹر، ہسٹاریکل ریسرچ سوسائٹی۔ لاہور

۵۴. پروفیسر جیلانی کامران — گورنمنٹ کالج - لاہور
۵۵. رائے حامد علی خاں — گورنمنٹ کالج - لاہور
۵۶. مسٹر حبیب التواب — گورنمنٹ ہائی سکول، فتح جنگ
۵۷. جسٹس حمود الرحمٰن — چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان - لاہور
۵۸. پروفیسر حمید احمد خاں — ڈائرکٹر مجلس ترقی ادب - کلب روڈ - لاہور
۵۹. مسٹر حیات اللہ خاں — گورنمنٹ ڈگری کالج، باغبانپورہ - لاہور
۶۰. مسٹر دلاور حسین بخاری — ہیڈماسٹر، گورنمنٹ ہائی سکول - لاہور چھاؤنی
۶۱. ڈاکٹر مس دلنواز بٹ — ادارۂ تعلیم و تحقیق، پنجاب یونیورسٹی - لاہور
۶۲. جسٹس ایس اے رحمان — گلبرگ - لاہور
۶۳. مسٹر اے رحیم — لائبریرین، پنجاب یونیورسٹی - لاہور
۶۴. راجا رشید احمد — افسر تعلقات عامہ، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور
۶۵. سید رضی واسطی — صدر شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی - لاہور
۶۶. مس رضیہ عباس بخاری — گورنمنٹ انٹر کالج فار گرلز، باغبانپورہ - لاہور
۶۷. ڈاکٹر مسز رفیعہ حسن — اپلائیڈ سائیکالوجی، پنجاب یونیورسٹی - لاہور
۶۸. مس رفیعہ قمر — ہیڈمسٹریس، گورنمنٹ گرلز ہائی سکول، بہاول نگر
۶۹. مسٹر محمد رفیق — استاد گورنمنٹ ہائی سکول، چک نمبر ۵۲ - جڑانوالہ
۷۰. مسز رفیق — گورنمنٹ گرلز ہائی سکول، چوبرجی - لاہور
۷۱. مسٹر ایم۔ ریاض احمد — ہیڈماسٹر گورنمنٹ نارمل سکول چنیوٹ ضلع جھنگ
۷۲. زبیدہ بیگم — گورنمنٹ صادق گرلز ہائی سکول - بہاولپور

۷۳. مس زرینہ خانم — جامع ہائی سکول فار گرلز - ملتان
۷۴. مس زرینہ سلامت — گورنمنٹ انٹر کالج فار ویمن، سمن آباد - لاہور
۷۵. خواجہ محمد زکریا — یونیورسٹی اورینٹل کالج - لاہور
۷۶. مسز زبیدہ رفیق بھٹی — گورنمنٹ انٹر کالج فار ویمن، سمن آباد - لاہور
۷۷. مس زبیدہ کرم بخش — مرکز توسیع تعلیم - لاہور
۷۸. پروفیسر سعید شیخ — گورنمنٹ کالج - لاہور
۷۹. پروفیسر سعید عثمان — گورنمنٹ کالج - لاہور
۸۰. مسز سمیعہ فداء الاسلام — گورنمنٹ گرلز کالج، باغبانپورہ - لاہور
۸۱. مس شاہدہ — گورنمنٹ جامع ہائی سکول - سرگودھا
۸۲. پروفیسر شجاعت حسین بخاری — گورنمنٹ کالج - وحدت روڈ - لاہور
۸۳. مسٹر محمد شفیق — ڈپٹی سیکرٹری، ثانوی تعلیمی بورڈ - سرگودھا
۸۴. شفیق شفیع — گورنمنٹ گرلز نارمل سکول - ملتان
۸۵. مس شکیلہ شریف — پرنسپل، اپوا کالج - لاہور
۸۶. پروفیسر شہرت بخاری — اسلامیہ کالج، سول لائنز - لاہور
۸۷. پروفیسر صابر لودھی — گورنمنٹ کالج - لاہور
۸۸. مسٹر صادق حسین — مرکز توسیع تعلیم - لاہور
۸۹. مسٹر صادق حسین — گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول، کیمبل پور
۹۰. شیخ صادق علی دلاوری — سینیئر ایڈیٹر، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور
۹۱. پروفیسر صدیق کلیم — پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج - لاہور

۹۲۔ ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق — ماہر مضمون عربی و اسلامیات پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ۔ لاہور

۹۳۔ مسٹر طالب حسین — ہیڈ ماسٹر، گورنمنٹ نارمل سکول۔ لالہ موسیٰ

۹۴۔ مس ایم، طوسی — ڈپٹی ڈائرکٹریس، ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن۔ لاہور

۹۵۔ مسٹر محمد طیب — متعلم علم الادویہ۔ کراچی یونیورسٹی۔ کراچی

۹۶۔ مسز ظہور — مرکز توسیع تعلیم۔ لاہور

۹۷۔ پروفیسر ظہور احمد — سیکرٹری، ثانوی تعلیمی بورڈ۔ لاہور

۹۸۔ مسز عبادت بریلوی — گورنمنٹ انٹر کالج فار ویمن، سمن آباد۔ لاہور

۹۹۔ مسٹر ایس عباس محمد — شعبہ کیمیا، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

۱۰۰۔ مس عبدالاحمد — گورنمنٹ انٹر کالج فار گرلز۔ سمن آباد۔ لاہور

۱۰۱۔ ڈاکٹر عبدالحمید — ڈائرکٹر پروڈکشن، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

۱۰۲۔ مسٹر عبدالحمید اختر — پرنسپل، میونسپل کالج۔ وزیر آباد

۱۰۳۔ مسٹر عبدالحئی علوی — گورنمنٹ ہائی سکول۔ تلہ گنگ۔ ضلع کیمبل پور

۱۰۴۔ پروفیسر عبدالحئی علوی — شعبۂ اطلاقی نفسیات، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

۱۰۵۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید — ۲-۷، نیو سمن آباد۔ لاہور

۱۰۶۔ پروفیسر عبدالرؤف انجم — شعبۂ انگریزی، گورنمنٹ کالج۔ لاہور

۱۰۷۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن — یونیورسٹی اورینٹل کالج۔ لاہور

۱۰۸۔ چودھری عبدالغفور — ماہر مضمون، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ۔ لاہور

۱۰۹۔ مسٹر عبدالقیوم خاں — ماہر مضمون، گورنمنٹ جامع ہائی سکول۔ جھنگ

۱۱۰۔ مسٹر عبدالقیوم قریشی — چیئرمین، ثانوی تعلیمی بورڈ۔ لاہور

۱۱۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ — صدر اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

۱۱۲۔ پروفیسر محمد عثمان — گورنمنٹ ڈگری کالج، باغبانپورہ۔ لاہور

۱۱۳۔ مس عطیہ — گورنمنٹ جونیئر ماڈل سکول، سمن آباد۔ لاہور

۱۱۴۔ ڈاکٹر ایم، اے عظیم — ایم، اے او کالج۔ لاہور

۱۱۵۔ پروفیسر علامہ علاء الدین صدیقی — وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

۱۱۶۔ سید محمد علی — گورنمنٹ ڈیف اینڈ ڈمب ہائی سکول۔ لاہور

۱۱۷۔ پروفیسر علی عباس — شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

۱۱۸۔ مسٹر علی شبر کاظمی — سنٹرل ٹریننگ کالج۔ لاہور

۱۱۹۔ میجر علی ناصر زیدی — ڈائرکٹر ٹیکنیکل، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ۔ لاہور

۱۲۰۔ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ — ۱۲۔ جیل روڈ۔ لاہور

۱۲۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار — یونیورسٹی اورینٹل کالج۔ لاہور

۱۲۲۔ مسٹر غلام علی انصاری — اسلامیہ کالج۔ وہاڑی

۱۲۳۔ ڈاکٹر غلام علی چودھری — صدر شعبۂ انگریزی، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

۱۲۴۔ ڈاکٹر غلام کبریا — پیسپیر سائنس کالج۔ لاہور

۱۲۵۔ فرخندہ محمود مرزا — گورنمنٹ گرلز پائلٹ سیکنڈری سکول وحدت کالونی۔ لاہور

۱۲۶۔ مسٹر فصیح اللہ خاں — ہیڈ ماسٹر، گورنمنٹ نارمل سکول۔ جہلم

۱۲۷۔ مسٹر فضل حق — انسٹرکٹر ٹیچر ٹریننگ سنٹر۔ پنڈدرہ۔ راولپنڈی

۱۲۸۔ ڈاکٹر مس فیروزہ یاسمین — سیکشن آفیسر، محکمۂ تعلیم۔ لاہور

۱۲۹۔ مسٹر فیض محمد خاں — گورنمنٹ ہائی سکول۔ خانپور۔ رحیم یار خاں

۱۳۰۔ سید محمد قاسم رضوی — ڈائرکٹر، سول سروسز اکیڈمی، شارع قائدِ اعظم - لاہور

۱۳۱۔ پروفیسر قیوم نظر — ماہرِ مضمون اردو و پنجابی، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ - لاہور

۱۳۲۔ پروفیسر کامران — پولیٹکل سائنس ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی - لاہور

۱۳۳۔ مسٹر ایم، کرم داد ملک — گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول - کیمبل پور

۱۳۴۔ مسٹر ایس، کریم حیدر — پرنسپل، گورنمنٹ جامع ہائی سکول - جہلم

۱۳۵۔ مسز کشور اسلم — مرکزِ توسیع تعلیم - لاہور

۱۳۶۔ کشور ناہید — مرکزی محکمۂ اطلاعات - فیمن روڈ - لاہور

۱۳۷۔ ڈاکٹر مس کنیز یوسف — پرنسپل، لاہور کالج فار ویمن - لاہور

۱۳۸۔ مسز کے، اے، لطیف — ہیڈ مسٹریس، اسلامیہ گرلز ہائی سکول برانڈرتھ روڈ - لاہور

۱۳۹۔ مسٹر کے، بی ملک — پرنسپل کالج آف کامرس - لاہور

۱۴۰۔ مسز کے، قریشی — پرنسپل اسلامیہ گرلز ہائی سکول، اچھرہ - لاہور

۱۴۱۔ صوفی گلزار احمد — گورنمنٹ کالج، وحدت کالونی - لاہور

۱۴۲۔ سید گوہر علی — ثانوی تعلیمی بورڈ، راولپنڈی برانچ - راولپنڈی

۱۴۳۔ پروفیسر ایم، اے، مجید یزدانی — ماہرِ مضمون اردو و فارسی، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ - لاہور

۱۴۴۔ مسٹر محمود احمد شیخ — میونسپل کارپوریشن کالج - پتوکی

۱۴۵۔ مس مسرت اقبال — گورنمنٹ گرلز جامع ہائی سکول - سرگودھا

۱۴۶۔ ڈاکٹر مسرت علی خاں — مرکزِ توسیع تعلیم - لاہور

۱۴۷۔ مس مسعود — گورنمنٹ انٹر کالج فار گرلز، سمن آباد - لاہور

۱۴۸۔ مسٹر مسعود میاں صدیقی — ایڈیٹر، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

۱۴۹۔ پروفیسر مشکور حسین یاد — گورنمنٹ کالج - لاہور

۱۵۰۔ سید مصباح الاحد — گورنمنٹ عباسیہ ہائی سکول - بہاول نگر

۱۵۱۔ ڈاکٹر مظفر ملک — ہیڈ ماسٹر، گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول پچھالیہ ضلع گجرات

۱۵۲۔ مسٹر مقبول انور داؤدی — ایڈیٹر، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

۱۵۳۔ ایم، زیڈ ملک — ہیڈ مسٹریس مدرسہ بنات المسلمین کوچہ چابکسواراں رنگ محل لاہور

۱۵۴۔ مسٹر منظور حسین کھٹی — ریسرچ آفیسر پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ - لاہور

۱۵۵۔ مسٹر منور ابن صادق — ریسرچ آفیسر، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

۱۵۶ مسٹر منور دین — رنگ محل مشن ہائی سکول - لاہور

۱۵۷۔ مسٹر منور حسین شاہ — ہیڈ ماسٹر، گورنمنٹ ہائی سکول - عیسیٰ خیل

۱۵۸۔ ڈاکٹر منیر الدین چغتائی — پولیٹکل سائنس ڈیپارٹمنٹ، پنجاب یونیورسٹی - لاہور

۱۵۹۔ پروفیسر میاں نامدار خاں — سیکرٹری تعلیم، حکومت پنجاب - لاہور

۱۶۰۔ حافظ نذر احمد — پرنسپل، شبلی کالج - علامہ اقبال روڈ - لاہور

۱۶۱۔ مسٹر ایم، نذر محمد — سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور

۱۶۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد — ماہرِ مضامین سائنس، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ - لاہور

۱۶۳۔ چودھری نذیر احمد — گورنمنٹ پائلٹ ہائی سکول، وحدت کالونی - لاہور

۱۶۴۔ مسز نسیم — مرکزِ توسیع تعلیم - لاہور

۱۶۵۔ مس نسیم رشید — گورنمنٹ گرلز ہائی سکول، چوبرجی - لاہور

۱۶۶۔ مس نسیم شوکت — ادارۂ تعلیم و تحقیق، پنجاب یونیورسٹی - لاہور

۱۶۷۔ نسیم صابرہ — گورنمنٹ جامع ہائی سکول - لاہور

۱۶۸۔ مسٹر نسیم محمود	چیئرمین، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور
۱۶۹۔ مسز نسیم لودھی	ریسرچ آفیسر، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور
۱۷۰۔ پروفیسر نصیر احمد قریشی	ماہر مضمون، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ۔ لاہور
۱۷۱۔ مسز نفیسہ اطہر حسن	لاہور کالج فار ویمن۔ لاہور
۱۷۲۔ مسز نیازی	مرکز توسیع تعلیم۔ لاہور
۱۷۳۔ پروفیسر وارث میر	شعبہ صحافت، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور
۱۷۴۔ ڈاکٹر وحید قریشی	یونیورسٹی اورینٹل کالج۔ لاہور
۱۷۵۔ چودھری ہدایت اللہ خاں	گورنمنٹ ڈگری کالج، باغبانپورہ۔ لاہور
۱۷۶۔ پروفیسر ایم۔ یٰسین	ماہر مضمون ریاضی، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور
۱۷۷۔ پروفیسر یار محمد خاں	صدر شعبہ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور